اُردو نثر کا آغاز اور ارتقاء

(۱۹ ویں صدی کے اوائل تک)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی (عثمانیہ)
ریڈر اُردو، جامعہ عثمانیہ

پہلا ایڈیشن — قیمت
پانچ سو — پانچ روپیے

ناشر

مجلس تحقیقات اُردو حیدرآباد

مطبوعہ

سیاست پریس نظام شاہی روڈ
حیدرآباد (اے پی)

فہرست ابواب

دیباچہ

فورٹ ولیم کالج کا قیام اُردو نثر کے ارتقا کی تاریخ میں ایک عہد آفریں واقعہ کی حیثیت سے تقریباً سارے محققین کے پاس مسلم سا ہو گیا ہے۔ اُردو ادب کی جتنی تاریخیں اب تک لکھی گئی ہیں تقریباً ان سب ہی میں فورٹ ولیم کالج سے پہلے کے نثری کارناموں کا تذکرہ بہت ہی مختصر سا ہے چنانچہ "اُردوئے قدیم" میں حکیم شمس اللہ قادری نے ایسی گیارہ کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ ادبِ اُردو میں ایسے (۹) نثری کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ تیسری اہم تاریخ ڈاکٹر اعجاز حسین کی "مختصر تاریخ ادبِ اُردو" ہے۔ اس میں ایسے کارناموں کی تعداد (۸) ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن نے بھی ایک مختصر تاریخ ادب اُردو شایع کی ہے جس میں فورٹ ولیم سے پہلے کے صرف (۱۵) نثری کارناموں کا حال درج ہے۔

مذکورہ بالا عام تواریخ ادب کے علاوہ کچھ اہم تاریخیں خاص نثر کی بھی شایع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے پروفیسر احسن مارہروی مرحوم کی تاریخ نثر اُردو میں فورٹ ولیم سے پہلے کی (۱۰) نثری کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرحوم پروفیسر احسن مارہروی کی دسترس میں اس سے زیادہ مواد نہیں آسکا تاہم جو مواد انھیں دستیاب ہوا اس کے پیش کرنے کا طریقہ ان کا اپنا ہے انھوں نے ان کارناموں کو زمانی ترتیب میں جوڑا ہے لیکن جدولوں کی صورت میں اور تنقید و تفحص کا زیادہ خیال نہیں رکھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی "اُردو کے اسالیب بیان" گو اُردو نثر کی تاریخ نہیں بلکہ ابتداء سے لیکر کتاب کی تالیف کے زمانے تک اُردو میں مختلف اسالیب کا جو نشو و نما ہوا اس کا کسی حد تک تنقیدی جائزہ ہے۔ تاہم اسالیب کا تعلق نثر سے تھا اس لیئے اس کتاب میں بھی فورٹ ولیم کالج سے پہلے کے (۵) نثری کارناموں کا حال ملتا ہے۔

پروفیسر حامد حسن قادری کی "داستان تاریخ اردو" غالباً اردو نثر کی تاریخ پر سب سے زیادہ معلوماتی کتاب ہے۔ گو یہ قابل قدر تصنیف حالیہ دور کے نثری کارناموں تک نہیں پہنچتی۔ پھر بھی فورٹ ولیم سے پہلے کے کارناموں میں سے اس کتاب میں تقریباً (۲۵) کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد کے نثری کارناموں پر مشتمل ادب کی وسعت اور اس کے تنوع کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی کتابوں کی تعداد "قدر قلیل" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس لیے تعجب کی بات نہیں اگر اردو کے بعض محققین اور نقادوں نے اردو نثر کی حقیقی تاریخ فورٹ ولیم کالج کے بعد ہی سمجھی ہو۔

فورٹ ولیم کالج سے پہلے کے نثری کارناموں کے حالات کی بھی کمیابی تھی جس کے باعث اس مقالے کے نگران پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے میرے مقالے کے لیے "اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے" کا عنوان تجویز فرمایا۔ کام کا خاکہ بھی تیار ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود ابتداء میں کئی مہینوں تک کوئی ایسے نثری آثار نہ مل سکے تھے جس سے ہمت افزائی ہو سکتی۔ مقالے کے موضوع سے متعلق مواد بہت منتشر اور ہندوستان کے طول و عرض کے مختلف کتب خانوں میں زیادہ تر مخطوطات کی صورت میں محفوظ تھا۔ جن میں سے چند کتب خانوں سے میں نے خود مواد لیا۔ کتب خانہ رامپور، کتب خانہ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، کتب خانہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے مواد پروفیسر سروری کی بیاض سے ملا۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ذاتی کتب خانہ سے بھی بہت کچھ قابل قدر مواد دستیاب ہوا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ جناب حکیم شمس اللہ قادری مرحوم، جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی، پروفیسر حامد حسن قادری وغیرہ نے بھی اپنے مشوروں سے میری بڑی مدد فرمائی جس کا شکریہ میں کما حقہ' ادا نہیں کر سکتی۔

میری انتہائی کوششوں کے باوجود کچھ رسالے ایسے بھی رہ گئے ہیں جن کے مصنفین کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ کچھ ہمارے مصنفین کے گمنام رہنے کا حصہ ہے اور کچھ عام قارئین کے نظم کی دلکشیوں میں بھول کر نثری کارناموں کو حالات زمانہ پر چھوڑ دینے کی ذہنیت کا بھی اثر ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر اردو کی نشو و نما کے ابتدائی ادوار میں مذہب نثری کارناموں کا سہارا نہ بنتا

تھا تنے کارنامے بھی جن کا جائزہ اگلے اوراق میں لیا جاسکا ہمارے لیے محفوظ نہ رہ جاتے۔ نظم کے کارنامے نثری کارناموں کے مقابلے میں زیادہ جتن سے رکھے ہوئے ملے۔ تذکرہ نگاروں نے بھی شاعروں کے نام اور ان کے حالات ادھورے ہی سہی کچھ تو سپردِ قلم کیے۔ نثر کے کارناموں کے اکثر مصنفین کا حال قوم کے "گمنام سپاہیوں" کا سا ہے۔

ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے نگراں پروفیسر عبدالقادر سروری کی اس گراں قدر امداد کا شکریہ نہ ادا کروں جو مجھے اس مقالے کی تدوین کے سلسلے میں ملی۔

میں مندرجہ ذیل اصحاب کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے مفید مشوروں اور کتابوں کی فراہمی سے میری مدد فرمائی۔

١۔ جناب مولوی ڈاکٹر عبدالحق
٢۔ جناب حکیم شمس اللہ قادری مرحوم
٣۔ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
٤۔ جناب مولوی نصیرالدین ہاشمی
٥۔ جناب ڈاکٹر عبداللہ صاحب صدر شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی
٦۔ جناب عندلیب شادانی صدر شعبہ اُردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی
٧۔ جناب نجیب اشرف ندوی پروفیسر جوگیشوری کالج بمبئی
٨۔ جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی ریڈر دہلی یونیورسٹی
٩۔ جناب حامد حسن صاحب قادری سابق پروفیسر اُردو سینٹ جانسن کالج آگرہ
١٠۔ جناب آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اُردو نظام کالج
١١۔ جناب گیا چند جین لیکچرار اُردو حمیدیہ کالج بھوپال
١٢۔ جناب غلام السیدین شریک معتمد تعلیمات حکومت ہند
١٣۔ جناب نواب عنایت جنگ بہادر
١٤۔ جناب حسن نظامی صاحب سجادہ درگاہ نظام الدین اولیاءؒ

۱۵۔ کتب خانہ دار آزاد لائبریری حیدرآباد ہاوس
۱۶۔ جناب مصطفے الحسینی صاحب سجادہ درگاہ ہاشم حسینی العلوی بیجاپور
۱۷۔ جناب امین الدین صاحب سجادہ درگاہ شاہ امین الدین اعلی بیجاپور
۱۸۔ جناب نذر علی صاحب درد کاکوروی
۱۹۔ جناب خلیق احمد صاحب نظامی
۲۰۔ جناب سید محمد صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ
۲۱۔ جناب مولوی محمد صدیق صاحب مددگار ناظم اطلاعات
۲۲۔ جناب عبدالرشید صاحب کتب خانہ دار روضتین گلبرگہ شریف
۲۳۔ جناب عباس علی صاحب مہتمم کتب خانہ سالار جنگ
۲۴۔ جناب راحت اللہ خان صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ
۲۵۔ جناب محمد غوث صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ شعبہ مخطوطات
۲۶۔ جناب عزیز الدین صاحب بانکی کسٹوڈین گول گنبد بیجاپور
۲۷۔ جناب محمد حسن ہنڈی کار بیجاپور
۲۸۔ جناب عزیزی سکندر توفیق (ام۔اے، عثمانیہ) لکچرار انگریزی کابل یونیورسٹی

رفیعہ سلطانہ

"رفعت کدہ"
برکت پورہ۔ حیدرآباد (اے۔پی)

فہرست مشمولات

دیباچہ

پہلا باب: کلمۂ آغاز

دوسرا باب: نثر پاروں کا آغاز

تیسرا باب : مربوط نثر کی شروعات

زبان کے ارتقا میں تاریخی جبریت۔ اُردو نثر کی ابتدا کے متعلق مختلف آرا۔ آزاد کی رائے۔ محمد یحییٰ تنہا کی رائے (فضلی کی "کربل کتھا")۔ ڈاکٹر عبدالحق اور احسن مارہروی کے نظریے (بندہ نواز کی : معراج العاشقین:)۔ حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور کی رائے (گنج العلم کے رسالے)۔ حامد حسن قادری کی تحقیق۔ رسالہ تصوف مصنفہ اشرف جہانگیر سمنانی۔ اُردو نثر کا آغاز جدید مواد کی روشنی میں۔ "رسالہ جنونیہ" : جنونیہ : اور : ہفت اسرار : : رسالہ تصوف : مصنفہ راجو قتال۔ راجو قتال اول۔ راجو قتال ثانی۔ راجو قتال اول کی دیگر تصنیفات۔ : سہاگن نامہ : اور دیوان راجو قتال کی تصنیف کے متعلق مزید شہادتیں۔

چوتھا باب : خواجہ بندہ نواز اور ان کے معاصرین کے نثری کارنامے

دورِ تغلق میں ثقافتی ترقی۔ بہمنیوں کا عروج۔ خواجہ صاحب کی دکن میں آمد۔ حالاتِ زندگی۔ خواجہ صاحب کی عظمت کے معترف ان کے معاصرین۔ تصانیف۔ تصانیف کی تعداد میں اختلاف ایک متنازع فیہ مسئلہ۔ خواجہ صاحب نے اُردو میں تصنیف و تالیف کی یا نہیں۔ اُردو تصانیف کے بارے میں شواہد۔ اُردو تصانیف۔ اُردو تصانیف کی نوعیت۔ معاصر تصانیف اور متاخر تصانیف۔ : معراج العاشقین : ۔ : سہ بارہ : ۔ : ہدایت نامہ : ۔ : ہشت مسائل : ۔ ہفت اسرار : ۔ : خلاصۃ التوحید : ۔ : شکار نامہ : ۔ : تمثیل نامہ : ۔ : دُرّ الاسرار : ۔ : تلاوت المعراج : ۔ : تلاوت الوجود : ۔ : وصیت الہادی : ۔ : رسالہ وجودیہ : ۔ تصانیف کے نمونے اور ان پر تبصرہ خواجہ صاحب کا اسلوب و زبان۔ معاصرین۔ اکبر حسینی۔ عبداللہ حسینی۔ شاہ داول۔ سید محمد جونپوری۔ بہاؤالدین باجن۔ کمال الدین سامانہ۔ شاہ قلندر۔ بدرالدین محمد مصنف : آداب الفضلا : ۔ قوام فاروقی مصنف : شرف نامہ : ۔

پانچواں باب : شاہ میراں جی کی نثری تصانیف

میراں جی کا عہد۔ سلاطین بیجاپور کی علم دوستی۔ میراں جی کی عظمت۔ حالات زندگی۔ سنہ وفات و پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں اختلافات۔ تصانیف (نظم) ، گنج عرفان : ، شہادت التحقیق : ، خوش نامہ : ، خوش نغز :۔ تصانیف (نثر) ، گلباس :۔ ، جل ترنگ :۔ ، شرح مرغوب القلوب : ، سب رس : کا اصل نام : تاج الحقایق :۔ ، تاج الحقایق : کے مصنف وجیہہ الدین علوی۔ وجیہہ الدین علوی کے حالات زندگی۔ تصانیف۔ دیگر معاصرین۔ میراں جی کے فن کی خصوصیات۔

چھٹا باب : شاہ برہان اور شاہ امین کے نثری کارنامے

نویں صدی میں اُردو نظم و نثر کی تصانیف کی کثرت۔ سلاطین بیجاپور کی سرپرستی۔ شاہ برہان کی پیدائش و وفات۔ منظوم تصانیف۔ ارشاد نامہ۔ منفعت الایمان۔ سک سہیلا۔ حجۃ البقاء۔ تفسیم الکلام۔ رموز الواصلین۔ بشارت الذکر۔ وصیت الہادی۔ نکتہ واحد۔ پنج گنج۔ کفر نامہ۔ نثری تصانیف۔ حکمۃ الحقایق۔ مقصود ابتدائی۔ ذکر جلی۔ کلمۃ الاسرار۔ معرفت القلوب۔۔۔ ہشت مسایل۔ رسالہ تصوف۔ تصانیف نثر پر تبصرہ۔ شاہ برہان کے طرز بیان کی خصوصیات۔ شاہ امین کے حالات زندگی۔ منظوم تصانیف۔ رموز السالکین۔ محبت نامہ۔ مفتاح التوحید۔ قربیہ۔ وجودیہ۔ مدح شاہ برہان۔ کشف انوار۔ رسالہ نظم و نثر۔ رسالہ منظوم۔ کری نامہ۔ نثری تصانیف گنج مخفی۔ گفتار شاہ امین۔ رسالہ نظم و نثر۔ عشق نامہ۔ شرح کلمہ طیب۔ ذکر نامہ۔ ارشاد نامہ۔ وجودیہ۔

ساتواں باب : شاہ برہان اور شاہ امین کے خلفا اور تلامذہ

نثر کی ترقی۔ مذہبی تحریروں کی طرف رجحان۔ اس دور کے مشہور مصنفین۔ مولانا عبداللہ مصنف : احکام الصلواۃ : میراں جی خدانما۔ : شرح تمہید :۔ : رسالہ وجودیہ :۔ : چکی نامہ :

؛شرح تمہید کے مختلف ترجمے۔ شاہ میراں حسینی۔ ؛خلاصۃ الرویا؛۔ میراں یعقوب۔ ؛شمایل الاتقیا؛
شاہ برہان الدین قادری راز الٰہی۔ ؛وجودیہ؛۔ شاہ نور محمد قادری ؛ رسالہ نور دریا ؛۔ ؛نوبطون؛
؛ عابد شاہ ؛۔ ؛گلزار السالکین ؛۔ ؛کنز المومنین ؛۔ عبد الصمد۔ ؛تفسیر وہابی ؛۔ محمد شریف۔
؛ گنج مخفی ؛۔ حبیب اللہ قادری ؛تحفۃ المرسلہ ؛۔ ولی اللہ قادری ؛معرفت السلوک ؛۔
شاہ میر ؛اسرار توحید ؛۔ ؛انتباہ الطالبین ؛۔ ؛ نوبطون ؛۔ ؛ رسایل قادریہ ؛۔ ؛عوارف
المعارف ؛ اور چند اور کارنامے جن کے مصنفین کا پتہ نہ چل سکا۔ مذہبی نثر پر تبصرہ۔

آٹھواں باب ؛۔ قدیم نثر کا شاہکار (سب رس)

ادب کے ارتقا کے لیے ساز گار فضا۔ نثری قصوں کی ابتداء۔ پہلا نثری قصہ ؛ سب رس؛
وجہی کے حالات زندگی۔ تصانیف۔ ؛قطب مشتری ؛ اور اس کا ادبی پایہ۔ ؛سب رس؛ ایک ادبی
کارنامہ۔ زمانہ۔ ؛سب رس؛ نام کے مضمرات۔ ؛سب رس؛ کے ماخذ اور مماثلات۔ مقامات تصوف
تمثیلوں سے مقابلہ۔ ؛سب رس؛ عشق حقیقی کی تمثیل۔ ؛سب رس؛ عشق مجازی کی تمثیل۔ کردار
حسن دل۔ معاشرت پر تنقید۔ اسلوب۔ مقفیٰ مسجع طرز۔ عربی، فارسی الفاظ کہاوتوں کا استعمال۔
ادبی خوبیاں۔

نواں باب ؛ قدیم زبانوں کے ترجمے

مشرق میں قصہ گوئی۔ قصوں کی ماخذ سنسکرت زبان ؛طوطی نامہ ؛ (شکا شپ تتی)، ؛طوطی نامہ؛
کے فارسی خلاصے۔ نخشبی ابو الفضل علامی۔ سید محمد قادری۔ مختلف اردو ترجمے۔ طوطی نامہ ابو الفضل کے مترجم
کے بارے میں غلط فہمیاں۔ ابن نشاطی کا ترجمہ۔ ملا سید محمد قادری کا طوطی نامہ۔ عبارت کے نمونے۔ طوطی نامہ اور
اس کی تکنک۔ ؛سنگھاسن بتیسی ؛۔ ؛ ملکہ زمان و کام کندلا ؛۔ ؛ کام روپ کام لتا ؛۔ ؛ قصہ جنگ امیر حمزہ؛
؛طلسم ہوشربا ؛۔ ؛گل ہرمز انار رانی ؛۔ ؛ نوطرز مرصع ؛۔ ؛ نوطرز مرصع کا اسلوب ؛۔ ؛ بہار دانش اور
؛مفرح القلوب ؛۔ ؛ دلبر و مہر افروز ؛۔ ؛ چار چمن ؛۔ ؛ گلستان ؛

دسواں باب: دہلی کے شعرا اور اُردو نثر

مغلوں کا دکن پر تسلط ۔ ریختہ کا رواج ۔ میر جعفر زٹلی کا نثری کارنامہ ۔ محمد حسین کلیم ۔ فضلی کی : دہ مجلس ؛ دہ مجلس کے نسخے ۔ سراج الدین علی خان آرزو کی تصانیف ۔ عبدالولی عزلت ۔ مرزا رفیع سودا تیقیلی ۔ سعادت یار خان رنگین ۔ انشاء اللہ خان انشاء ۔ مرزا جان طپش ۔ اس دور کی نثر پر تبصرہ ۔

گیارھواں باب: نثر کی توسیع

بارھویں صدی میں نثر کی وسعت ۔ مذہبی کتابوں کی نوعیت ۔ (۱) تراجم قرآن شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن ۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن ۔ (۲) فقہ : سراج الایمان ؛ تقسیم میراث ۔ احوال میت ۔ ترجمہ کیدانی (۳) حدیث ۔ انوار محمدی ۔ ترجمہ زواجر ۔ مجموعہ المسایل ۔ تصوف ۔ مجمع العطایا ۔ کتابوں کی جنگ ۔ رسالہ بدر الدجیٰ ۔ قواعد زبان کے سلسلے میں یورپین مصنفین کے کارنامے ۔ یورپ اور ہند کے تعلقات ۔ پہلا یورپی مصنف جان جوشوا کیٹلر ۔ چیمبرلین ۔ ڈیوڈ مل شلز ۔ جے ہان فریڈریش فرٹز کیسانویں گٹی ۔ فرگوسن ایوارس ایبل ۔ ہندوستانی حروف تہجی مصنف نامعلوم ۔ لے بے ڈف ۔ ہیڈلے ۔ جان کرسٹوف ۔ ریڈی لنگ ۔ رسالہ قواعد ہندی مصنف ۔ ریختہ ہندی کی صرف و نحو ۔ انشا کا آغاز ۔ انشا کی تعریف ۔ انشا کے بارے میں سلمان ندوی، گارساں ڈی ٹاسی کی آرا ۔ : دستور النثر : ۔ : دستور الہدایت : ۔ : دن انشا : ۔

تاریخ :۔ ترجمہ تاریخ فیروز شاہی ۔ تاریخ ہندوستان ۔ بہادر نامہ ۔ سیر ۔ اس دور کی مشہور ہستی باقر آگاہ ۔ حالات زندگی ۔ تصانیف ۔ منظوم تصانیف کے نثری دیباچے ۔ دیباچہ مراۃ الجنان ۔ دیباچہ دیوان ۔ دیباچہ ہشت بہشت ۔ دیباچہ فراید در فواید ۔ دیباچہ گلزار عشق ۔ دیباچہ تحفہ احباب ۔ آگاہ کی مکمل تصنیف نثر : ریاض السیر ۔ بدر الدولہ کی تصنیف نثر الجواہر ۔ بدر الدولہ کے حالات زندگی ۔ تصانیف قصص ملکہ روم و فقہیہ ۔ قصہ دلالہ مختالہ ۔ اس دور کا خاتمہ ۔

۱
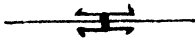
کلمۂ آغاز

تاریخی پس منظر ۔ جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش اور اُردو ۔ ہندستان کی لسانی تاریخ میں گیارھویں اور بارھویں صدی کا انقلاب ۔ عرب اور ایرانی سیاحوں کے بیانات ۔ نئی مخلوط زبان کی نیو ۔ مسعود سعد سلمان کا اُردو دیوان ۔ مسعود کے زمانے کے لگ بھگ ماقبل اُردو کے نمونے ۔ : چوراسی وشنوؤں کی وارتا : : سدھ ہیم چندرانوشاسن : ۔ : کمار پال پرتی بودھ : ۔ : پربندھ چنتامنی : ۔ : ہمیر راسو : ۔ : پرتھی راج راسو : ۔ عہد غزنوی میں ہندوستانی زبان کا استعمال ۔ دیوان مسعود سعد سلمان ۔ نئی بولی کی لسانی خصوصیات : نئی بولی کی حالت کا کچھ اندازہ لگانے کے تین ماخذ ۔ فارسی شعرا کا کلام ۔ لغات ۔ سفرنامے ۔ منفرد اجزائے کلام کے ابتدائی آثار ۔ : پرتھی راج راسو : کے پرستاد کے خاتمے کی نثری عبارتیں ۔
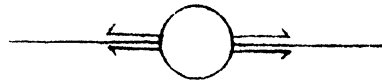
کلمہ آغاز

زبانیں اپنے ارتقاء کے ابتدائی مرحلے میں عموماً اپنے ہی لسانی ذخیرے اور فکری سرمایہ سے کام لے کر اپنی تعمیر کے مراحل میں قدم آگے بڑھاتی ہیں۔ لیکن بعض زبانوں کی صورت میں ایسا بھی پیش آیا ہے کہ ایسے مرحلے میں انھیں نہ صرف اپنے ہی لسانی اور قومی فکری سرمایے سے مدد ملی، بلکہ اپنے اطراف کی کچھ ترقی یافتہ زبانوں اور اپنے ہی قومی فکری سرمایے کے علاوہ دوسری قوموں کے فکری سرمایے سے بھی کافی امداد حاصل ہوئی۔ زبانوں کے اس دوسرے گروہ میں اردو بھی شامل ہے۔ اردو کو اپنے نشوونما کے ابتدائی مرحلوں میں ایک طرف تو ہندوستان قدیم اور قرونِ وسطیٰ کے ادبی سرمایے سے مدد ملی تو دوسری طرف وہ فارسی ادب کے نمونوں سے بھی فائدہ اٹھا سکی۔

جدید ہند آریائی کے آغاز کا زمانہ، ہند آریائی ماہرینِ لسانیات نے سنہ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ مقرر کیا ہے۔ اور اس کے قریب کے زمانے میں اردو کا بھی آغاز تصور کیا جاتا ہے۔

یہ زمانہ دراصل ہندوستان کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش ہی کا زمانہ ہے بلکہ اس زمانے میں ہندوستان کی سیاست، معاشرت، معیشت سب ہی میں ایک نیا اور دوررس انقلاب آیا۔ بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ انقلاب جو سنہ ۱۰۰۰ء میں آیا اس کے لیے دو تین سو سال پیشتر (سنہ ۶۸۲ء اور سنہ ۷۱۲ء) ہی سے یعنی مسلمانوں کے پہلے حملے سندھ سنہ ۱۵ھ ہی سے راہیں ہموار ہو رہی تھیں۔ سنہ ۱۵ھ (۶۶۸۲) میں عثمان بن عاص کی سرکردگی میں عربوں کا ہندوستان پر پہلا حملہ ہوا اور اسلامی جہاز تھانہ (بمبئی کے قریب ایک مقام) پر لنگر انداز ہوئے۔ اس کے بعد دیبل (دیول) پر حملہ ہوا۔ لیکن یہ حملے

سیاسی اعتبار سے ناکام رہے۔ اس حملے کے نتیجہ کے طور پر سماجی حیثیت سے کئی اہم تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔

بالآخر ۷۱۲ء (۹۹ھ) میں محمد بن قاسم نے یادگار حملہ کیا جس نے سندھ میں مسلمانوں کی چھوٹی سی نو آبادی قائم کردی۔ اس کے بعد سے مسلمانوں کے اثر سے ہندوستانی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ اسلامی عقائد اور طرز فکر کی تبلیغ اس وقت سے شروع ہوئی۔ (انگریز مورخ) لین پول کی روایت کے مطابق ہر سال (۵۰) ہزار اہل ہند اسلام قبول کرتے تھے۔[۱]

ان نومسلموں اور بیرونی مسلمانوں کی آپس کی بول چال کا ذریعہ عربی فارسی آمیز مقامی زبان ہوا کرتی ہوگی جس کو انھوں نے ایک عام نام "ہندی" یعنی اہل ہند کی زبان سے موسوم کیا تھا۔ نو وارد مسلمان بھی جن کی مادری زبان عربی یا فارسی تھی، جب اہل ہند سے معاملہ کرتے تو ان ہی کی زبان اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ اس کا ثبوت اس زمانے کے بعض عرب اور ایرانی سیاحوں کے بیانات سے ملتا ہے۔ جو ۳۰۰ھ سے لیکر ۳۷۵ھ تک ہندوستان آئے۔ ان میں شہریار بن بزرگ۔ ابن حوقل بشاری۔ اصطخری اور مورخ مسعودی قابل ذکر ہیں۔

شہریار بن بزرگ ۱۰۱۳ء (۴۰۰ھ) میں ہندوستان آیا تھا۔ وہ اپنی تصنیف "عجائب الہند" میں لکھتا ہے:

> "ایک عرب نے الورا کے راجہ مہارک (؟) کی شان میں ہندی میں قصیدہ لکھا تھا اس سے راجہ اتنا خوش ہوا کہ اسے دربار میں طلب کرکے انعام واکرام دیا نیز یہ کہ بادشاہ کی فرمائش پر اس نے قرآن کا ترجمہ بھی ہندی میں کیا۔"[۲]

---

[۱] لین پول "میڈیول انڈیا"۔ مقدمہ صفحہ (۳۱)

[۲] "عجائب الہند" مطبوعہ لیڈن صفحہ (۳)

ابن حوقل جس نے ۳۵۰ھ میں سندھ اور ملتان کا سفر کیا تھا لکھتا ہے :

" منصورہ ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے " [1]

اس کی تائید اصطخری کے بیان سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

" ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے " [2]

یہ عربی آمیز سندھی وہی زبان تھی جس کے متعلق مسعودی نے ۳۰۴ھ میں اپنی مشہور کتاب مروج الذہب میں لکھا ہے ۔ :

" فهذا جملٌ من اخبار ملوك السند والهند ولغة السند خلاف لغة الهند۔ " [3]

یعنی " یہ جملے سندھ اور ہند کی تاریخ کے متعلق ہیں اور سندھ کی زبان بقیہ ہند کی زبان سے مختلف ہے "

بشاری اپنی کتاب " احسن التقاسیم " میں لکھتا ہے :

" عرب ، سندھ میں ہندوؤں سے ملے ہوئے تھے اور انھوں نے ہندوستانی رسم و رواج اختیار کر لیا تھا ۔ ہندوستانی عورتوں سے شادی بیاہ کرتے تھے نیز انھیں اہلِ ہند کی زبانوں سے بھی دلچسپی تھی ۔ اس لیے انھوں نے ہندوستانی نام و خطاب قبول کیے ۔ " [4]

ان بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستانی رسم و رواج اور زبان سے متاثر ہو رہے تھے اور ایک مخلوط زبان کی نیو پڑ رہی تھی ۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ

---

[1] ۔ سفرنامہ ابن حوقل طبع لیڈن صفحہ ۲۳۲

[2] ۔ پنجاب میں اردو صفحہ ۔ ۔ سفرنامہ اصطخری صفحہ ۱۷۷ ۔ طبع لیڈن

[3] ۔ " مروج الذہب " باب (۹) صفحہ ۳۸۱ طبع لیڈن

[4] ۔ " احسن التقاسیم " صفحہ ۱۶۳ طبع لیڈن

اس نئی بولی کی مزید نشو ونما، عہدِ غزنوی میں محمود کے حملے کے بعد سے ہونے لگی تھی۔ یوں تو محمود کے باپ سبکتگین نے ۳۶۶ھ ہی میں وادیٔ عمان میں دو لڑائیاں لڑیں اور وادی نیلاب تک کا کچھ علاقہ فتح کرلیا تھا لیکن ہندوستان کی اصلی فتوحات محمود سے شروع ہوئیں اس نے ہندوستان پر (۱۷) حملے کیے۔ مشرق میں کالنجر اور مغرب میں سومنات یعنی گجرات تک بڑھا چلا گیا۔ پھر ۴۰۹ھ میں قنوج اور متھرا کو فتح کرلیا۔ تواریخ میں مذکور ہے کہ جس وقت محمود کو تھانسر کی تسخیر کا خیال ہوا تو اس نے لاہور کے راجہ انندپال سے صلح کرلی۔ معاہدہ کے بموجب راجہ نے محمود کے لشکر کو بہت سی آسانیاں بہم پہونچائیں۔ اس کے عوض محمود نے بھی اس علاقے کو نقصان نہیں پہونچایا۔ راجہ نے اپنے بھائی کے ہمراہ ۵۰۰ چاکر (غلام) اور ۲۰۰ تاجر روانہ کیے تھے جو اسلامی لشکر کی ضروریات کو پورا کرتے تھے ان سوداگروں اور اسلامی لشکریوں کے تبادلہ خیال کا ذریعہ یہی نوخیز زبان تھی۔ محمود کا انتقال ۴۱۸ھ میں ہوا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی البیرونی کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

"محمود ہندوستانیوں سے ان کی زبان کے ذریعے قریب ہونا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے نقروی سکّے درہم پر ہجری سنہ میں ایسی عبارت کندہ کرائی تھی جو مخلوط تھی سنسکرت لفظوں کے ساتھ عربی فارسی الفاظ بھی تھے۔ الفاظ یہ ہیں:

" ایا کتم ایکم محمد اوتار نرپتی محمود ایام تنکو محمود پور گھٹے ہٹو جنیا نا سمپت "۔ [۱]

جس کے معنی ہیں " ناقابلِ تعریف ایک ذات ہے۔ محمدؐ اس کے اوتار رسول ہیں۔ محمود اس کے بندوں کا رکھوالا راجہ ہے۔ یہ سکہ محمود پور میں سنہ ہجرت نبوی "۔

یہ بھی مشہور ہے کہ کالنجر کے راجہ نے "زبانِ ہندی" میں سلطان کی مدح لکھ کر بھیجی تھی

---

[۱] "انڈو آرین اینڈ ہندی" صفحہ ۱۶۹

سلطان نے اپنے دربار کے شعرا کو یہ شعر سنائے۔ ان کی تعریف پر سلطان نے کالنجر کے راجہ کو پندرہ قلعوں کی حکومت کا پٹہ لکھ کر دے دیا۔ ؎۱

اس واقعہ کا ذکر فرشتہ اپنی تاریخ میں اس طرح کرتا ہے:

"انندا بہ زبانِ ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد سلطان آن را بہ فضلائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ، ہمگی تحسین و آفریں کردند" ؎۲

گو محمود کی وفات کے بعد اس کی اولاد کے قبضے سے بہت سا مفتوحہ علاقہ نکل گیا۔ تاہم غزنہ اور پنجاب پر ان کا تسلط عرصہ دراز تک رہا۔ شہاب الدین محمد غوری کے محمود کی اولاد کو غزنہ سے بے دخل کر دینے کے بعد جب سلطان مسعود اور ابراہیم نے پنجاب میں پناہ لی تو لاہور گویا چھوٹا سا غزنہ بن گیا۔ جس میں کئی شعرا، علما اور ادیب، ایران سے آکر بس گیے تھے۔ ان شعرا میں عنصری۔ فرخی۔ اسدی وغیرہ مشہور ہیں۔ مسلسل روایتوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ محمود کے جانشین مسعود کے درباری شاعر مسعود سعد سلمان نے تو ایک ہندی دیوان بھی مرتب کیا تھا ؎۳

؎۱ "پنجاب میں اردو" صفحہ ۵۸ و "پرشین اینڈ مغل" صفحہ ۱۲

؎۲ "تاریخ فرشتہ" مطبع نول کشور جلد اول صفحہ ۳۱

؎۳ مسعود سعد سلمان (۵۲۱ھ تا ۴۸۰ھ) کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ہندی میں اپنی یادگار ایک دیوان چھوڑا۔ دراصل اس کے آبا و اجداد ایران کے تھے۔ لیکن وہ خود لاہور میں پیدا ہوا۔ گو عرفی نے اپنے تذکرے "لباب الالباب" میں اسے بھی ایرانی نژاد بتایا ہے۔ لیکن خود اس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا مولد ہندوستان تھا۔ ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے اس زبان میں شاعری کی ہوگی۔ چنانچہ محمد عوفی اپنے تذکرے لباب الالباب میں لکھتا ہے:

"او را سہ دیوان است یکے بہ تازی دیگے بپارسی دیگے بہ ہندوی" اس قول کی مزید تقویت امیر خسرو کے بیان سے ہوتی ہے وہ اپنی مثنوی غرۃ الکمال کے دیباچے میں کہتے ہیں:

"پیش ازیں از شاہانِ سخن کسے را سہ دیوان نبود مگر مرا کہ خسرو ملک کلام مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آن سہ دیوان در عبارت عربی، فارسی و ہندی است و در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نہ کرد بجز من" — دیباچہ غرۃ الکمال صفحہ (۶۶)۔

اس دیوان کی روایت کو جو مختلف ذریعوں سے برابر چلی آرہی ہے، تسلیم کرلیا جائے تو گیارھویں صدی عیسوی میں یعنی پانچویں صدی ہجری میں اُردو کا آغاز نزاعی بات نہیں رہتی۔

یہ صحیح ہے کہ مسعود سعد سلمان کا دیوان اب ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ اس لیے اس دیوان کی زبان کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ہندی کے چند علمار کی تحقیقات سے اس زمانے کے لگ بھگ کی زبان کے کچھ نمونے اس وقت فراہم ہوگیے ہیں۔

"ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتہاس" کے مصنف رام چندر شکل نے تو "چوراسی ویشنوں کی وارتا" کو کھڑی بولی کی پہلی تصنیف مانا ہے۔ یہ جوگیوں اور سدھوں کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو آٹھویں صدی عیسوی کے قریب کی تصنیف ہے۔ لیکن ایک دوسرے محقق شیام سندر داس نے اس خیال کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ شیام سندر داس کے خیال کے مطابق گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی سے کھڑی بولی کا آغاز ہوتا ہے "چوراسی ویشنو دں کی وارتا" کے جو نمونے رام چندر شکل نے اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں ان میں چند لفظ ایسے ملتے ہیں جو آگے چل کر اُردو کا ہیولیٰ ثابت ہوتے۔ مثلاً "سرہ" ویشنو کا ایک دوہا ہے:

"گھور اندھارے چندمنی جمی اجو کرئی
پرم مہا سو دیکھ کے درتی آسیش ہری [1]

گھور۔ اندھارا۔ چند (قدیم اُردو) دیکھ وغیرہ وہ لفظ ہیں جو اُردو کے ارتقار تک اسی حالت میں باقی رہے۔

مشہور جینی عالم ہیم چندر نے "سدھ ہیم چندر انوشاسن" میں ایک خاص اپ بھرنش کے جو نمونے دیئے ہیں ان کو ڈاکٹر چیٹرجی نے کھڑی بولی کا ابتدائی روپ مانا ہے۔ چند نمونے حسب ذیل ہیں۔: [2]

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتی ہاس از: رام چندر شکل صفحہ (۱۱)۔ [2] ہیم چندر (۱۰۸۸ء – ۱۱۷۲ء) گجرات کے سولنکی راجہ جے سنگھ اور انکے پوتے کمارپال کے دربار سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے عہد کے مشہور عالم آچاریہ تھے جنکی دو کتابوں کا پتہ چلتا ہے ان میں سے ایک "شدھ ہیم چندر انوشاسن" جس میں اپ بھرنش پراکرت اور سنسکرت گرامر کے اصول لکھے ہیں۔ دوسری "کمار پال چرت" جو پراکرت نظم میں ہے۔

(۱) "بھلا ہوا جو ماریا بھینی مہارا کنتو ؎

لجے جنتو تو ویم بیا سے ہوجی بھگا گھر وائے نتو "

یعنی "اے بہن بھلا ہوا جو میرا شوہر مارا گیا، مجھے لجا آتی اگر وہ گھر بھاگ آتا "

(۲) "جیئو کسو نہ بھلی دھن پیو کا سو نہ اِٹھو

دونی وی ادسری نی وادی تن سوان گناتی وِٹھو "

"جیو" (زندگی، جیون) کس کو بھلی نہیں معلوم ہوتی، دھن کس کا من نہیں چاہتا ؟

دونوں ہی ادسر (وقت موقع) مل جائیں تب ولشٹھ (شریف آدمی) ان دونوں کو تنکا سا گنتے ہیں؟

(۳) جئی ناسواوے دوئی گھر کا اہو مون تجھو

و نو جو کھنڈے تو جیسے سو ہیو ہوئے نہ تجھو

"اے قاصد اگر وہ گھر نہ آئے تو تجھے اور مجھے کیوں منہ لٹکانا چاہئیے (اداس ہونا چاہیے) مگر وہ تلوار

توڑ دے سو میرا پھیو (پیا) نہیں ہو سکتا۔

(۴) لمھے عقو ریو ریو یہو را کا را ایوا

مدھی - نہاہی - گن آلو - کئی جاتا جو نہا کراتی

(بے بودھی کی عورت بے عقل) (کیا تو نہیں دیکھتی) (آسمان پیا) (کتنے آدمی) (کرتے ہیں دشتی)

" پُت جائے کون گنو اوگن کون موے نا

جا باپ کی بھومی دی کپ جائے اوارنے "

یعنی اگر بیٹا جنا تو کونسا گن (اچھائی ہے اور موے نا (مرنے میں تو) کون اوگن (بُرائی) جب باپ

کی زمین (وطن) کانپ رہی ہے اور دوں کے قدموں تلے۔

اس طرح کی ایک اور کتاب "سوم پربھسوری" کی کماریال پرتی بودھ" ہے۔ اس کی

زبان کے بارے میں سارے علما کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک طرح کی مخلوط بولی میں لکھی گئی ہے۔

؎ انڈو آرین اور ہندی صفحہ ۱۶۵

جس کا نشوونما بعد کو کھڑی بولی کی صورت میں ہوا۔ اس کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

گنگا جل پکھالیا دچ بستی کیسے ہوئے پوتر [1]

گنگا جل میں دھوئی ہو کیا کیسے پاک ہو سکتی ہے۔

پکھالنا سے پکھال اب بھی پانی سے دھونے اور پانی کے پیمانے کے معنی میں اُردو میں رائج ہے۔ "پربندھ چنتامنی"، نامی ایک اور کتاب ۱۳۰۴ء کے لگ بھگ کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف میرو تنگ۔ ہیم چندر ہی کے زمانے کے ایک عالم تھے۔ انھوں نے "پربندھ چنتامنی" میں راجاؤں کے قصے لکھے ہیں [2]

راجہ منج اور مرنال وتی کے بیان میں منج سے منسوب ایک دوہا نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

" جا متی پچھی سنپجے سا متی پہلی ہوئی [3]

"منج" بھنئی منا لیوئی دگھن نہ بیڑھی کوئی "

جا (جو)، مت (عقل)، پیچھ (پیچھے) کے معنوں میں اب بھی مستعمل ہے۔ سنپڑنا (پکڑنا) دکھنی میں پکڑنے اور حاصل ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "پہلی" کا روپ بالکل اُردو کا ہے۔ یعنی کسی کام کے پیچھے جو عقل پیدا ہوتی ہے وہ اگر پہلے ہوئے تو منج کہتا ہے، اے مرنال وتی اسے کوئی تکلیف (بیڑا) نہ ستا وے۔"

اس زمانے کے قریب کے لکھے ہوئے چند راسوؤں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یوں تو کئی "راسو" لکھے گیے پران میں دو بہت مشہور ہیں۔ ایک "ہیمر راسو" دوسرا پرتھی راج راسو"

ہیمر راسو اس کے مصنف شارنگ دھر بہت بڑے عالم تھے۔ رنتھمبور کے مشہور راجہ ہیمر دیو کے دربار میں ایک سردار راگھو دیو تھے جن کے تین بیٹے گوپال

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتی ہاس مصنفہ برج رتن داس صفحہ ۱۵

[2] " " " " " " " " ۱۶

[3] " " " " " " " " ۱۶

دامودھر اور دیو داس تھے۔ دوسرے بیٹے دامودھر سے تین بیٹے شارنگ دھر، لکشمی دھر اور کرشن تھے شارنگ دھر نے ایور وید میں ایک بلند پایہ تصنیف اپنی یادگار چھوڑی اس کے علاوہ سنسکرت کی قواعد کے مطابق بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس زمانے کی کھڑی بولی کے بھی کچھ نمونے ملتے ہیں۔ "ہمیر وراسو" نامی ایک طویل نظم بھی ان سے منسوب کی جاتی ہے۔ [1] اس کی زبان کو بھی بعض علمار نے ابتدائی کھڑی بولی کا نمونہ سمجھا ہے۔ اس راسو کا ایک شعر درج ذیل ہے۔

" ڈھولا ماریا دھلی ماہنہ مچھیو ملیچھ سریر "

یعنی "دھلی میں ڈھول بجایا گیا اور مسلمانوں کے جسم بے ہوش ہو گئے "

اس سلسلے کی تصانیف میں چندبردائی کی "پرتھوی راج راسو" جدید ہند آریائی کی پہلی منتن تصنیف بھی سمجھی جاتی ہے۔ چند بردائی، پرتھوی راج کا درباری شاعر تھا۔ اس نے پرتھوی راج کی سلطان شہاب الدین محمد غوری پر فتح کی یادگار میں یہ نظم لکھی تھی۔ یہ نظم تقریباً دو سو برس تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی۔ اور پندرھویں صدی عیسوی میں ضبطِ تحریر میں لائی گئی۔ اس لیے علمار کے مابین اس کی زبان کے اصلی ہونے کے بارے میں اختلافات ہیں [2]

تاہم اکثر علمار کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کے بعض حصے تو یقیناً اصلی ہیں۔ چنانچہ ایک شعر ذیل میں دیا جاتا ہے :

تج بیس پنچ دن کریں نواج
حق حق جن نہیں کاج [3]

ترکیبیں بھی آدھی ہندی اور آدھی فارسی ہیں مثلاً پلنگ پوش۔ جم جور (موت کا زور)

---

[1] ہندی ساہتیہ کا "اتی ہاس" مصنفہ برج رتن داس صفحہ (۱۶)
[2] ڈاکٹر گریرسن اس کو اصلی سمجھتے ہیں لیکن ڈاکٹر بولر اور مراری دھن نے اس کے خلاف مضامین لکھے۔ پروفیسر محمود شیرانی بھی اندرونی شواہد کی بنا پر اس کو مشتبہ قرار دیتے ہیں۔
[3] "پرتھوی راج راسو" مطبوعہ ناگری پرچارنی سبھا۔ چھند ۲۴ صفحہ (۵۲۱) جدید۔ تیرھویں داستان

بعض محاورے ایسے ہیں جواب بھی رائج ہیں مثلاً پانی ملتان بہہ گیا۔ ایک ضرب المثل ہے، استاد ذوق کا شعر ہے۔

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تاب حسن
اے ذوق پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا

پرتھی راج راسو میں یہ ضرب المثل یوں آتی ہے:

"اترے سا ہا ب گیئو ملتانہ پانی"

مسعود سعد سلمان کے قریبی زمانے کی زبان کے ان نمونوں کے ہماری دسترس میں آجانے کے بعد مسعود کا ہندی میں ایک دیوان مرتب کرنے کا خیال شاید محض ایک روایت باقی نہیں رہتا۔

اصل میں جیسا کہ پیشتر بتایا جا چکا ہے ۱۰۰۰ء میں ہندوستان ایک لسانی بحران سے گزر رہا تھا جس کی شمالی ہندوستان کی زبانوں کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آتی تھی ۱۰۰۰ء کے قبل کے زمانے تک آمد و رفت کے وسائل کی کمی کے سبب زبانوں کا نشو و نما مقامی ہوتا تھا اور ایک مقام کی بولی بولنے والوں کی اتنی تعداد دوسری بولی کے خطوں میں نہیں پہنچ سکتی تھی کہ بولیوں کا خلط ملط عمل میں آسکے لیکن مسلمانوں کے ہندوستان میں آمد کے کچھ عرصے کے اندر اندر ہی سارے شمالی ہند میں اور علاؤالدین خلجی کے زمانے سے دکن میں بھی ہند آریائی بولیوں کا میل ملاپ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اور ایک بولی جو مسلمانوں نے اختیار کرلی تھی اس کے آثار مختلف بولیوں کے علاقوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ملنے لگتے ہیں۔ اس بولی کی خصوصیات کے سلسلے میں ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے حسب ذیل باتیں بتائی ہیں:

(۱) اس میں اسماء، افعال اور صفات "آ" پر ختم ہوتے ہیں
(۲) اس میں حروف جار اور ضمائر کی شکلیں۔

'کا'۔ 'میں'۔ 'پر'۔ 'سے'۔ اس۔ اُس۔ جس۔ کس۔ میں وغیرہ ہیں۔ یہ خصوصیات کم و بیش اس نئی بولی میں ملتے ہیں۔

مذکورہ بالا شواہد کی موجودگی میں اس بات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نئی

زبان جو نشو و نما پانے لگی تھی، اس کی ابتدائی حالت کیا تھی۔

اس جدید بولی کے اولین نثری آثار تو باضابطہ اور مسلسل صورت میں بہت بعد میں دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے تحریری نثری آثار کے وجود سے پہلے اس کا فطرتاً عرصہ تک بول چال کی زبان کے طور پر ہندوستان کے ایسے سارے علاقوں میں رائج رہنا قرین قیاس ہے جو مسلمانوں کے زیر اثر آ چکے تھے۔ مسعود سعد سلمان کا دیوان جو اب تک کی تحقیقات سے اُردو کے اولین تحریری آثار کا نقطہ آغاز مانا گیا ہے۔ اگر وہ کسی زمانے میں غلط بھی ثابت ہو جائے تو پھر بھی مذکورہ نمونوں سے اس زمانے کی زبان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو کے وہ لفظ جو مسعود سعد سلمان اور اس زمانے کی بعض فارسی تحریروں یعنی لغتوں سفرناموں وغیرہ میں ملتے ہیں۔ وہ بھی دراصل اس زمانے کی بول چال کے ادھورے اور منفرد تحریری آثار ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں۔

ان آثار کی اہمیت اُردو نثر کے آغاز کی چھان بین کے سلسلے میں اس لیے گھٹائی نہیں جا سکتی کہ وہ کافی اور مربوط مواد کی عدم موجودگی میں اس زمانے کی بول چال کی زبان کے نمونوں کے باقیات ہیں یہ اور بات ہے کہ نثر کی اصطلاحی تعریف ان پر صادق نہیں آتی تاہم ان کے پیچھے جو خیال کام کر رہا ہے وہ اہم چیز ہے۔ یہ الفاظ جو فارسی تحریروں کے بیچ بیچ میں آ گئے ہیں۔ ایک مربوط خیال کے اجزا ہیں کیونکہ یہ بات تصور میں نہیں آ سکتی کہ قوموں کے ذہنی نشو و نما کے کسی مرحلے میں بھی وہ صرف منفرد لفظوں میں خیالات کو ظاہر کرتی رہی ہوں گی۔ یہ خیال سارے علمی نفسیاتی اور لسانی اصولوں کے لحاظ سے غلط ہو گا۔ کیونکہ یہ لسانیات کا مسلمہ اصول ہے کہ زبان کی اکائی لفظ [1] نہیں، جملہ ہے۔ یعنی انسان نے جب بھی بولنا شروع کیا وہ جملوں میں بولنے لگا نہ کہ الفاظ میں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جملے کبھی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "ایلیمنٹ آف دی سائنس آف لنگویج" دوسرا ایڈیشن۔ تاراپور والا صفحہ ۹۔

لفظی جملے (SENTENCE-WORDS) رہے ہوں۔

اس اصول کی روشنی میں ان منفرد لفظی آثار کا بھی مطالعہ کرنا ہوگا۔ جو اس زمانے کے اظہار خیال کا ذریعہ ہیں اور جنھیں فارسی دانوں نے ہندوستانی عوام کو اپنا مافی الضمیر سمجھانے کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ یہی در اصل ان قلمبند شدہ اردو لفظوں کی اہمیت ہے جو ہم کو فارسی کی تحریروں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ بول چال کی زبان کے لفظ ہیں جن کے جملے کے دوسرے اجزاء فارسی میں ہیں۔

چونکہ اس زمانے میں اردو یا ماقبل اردو کی نثری تصانیف دستیاب نہیں ہوتیں۔ نہ ہی منظوم تصانیف ملتی ہیں۔ اس لیے اس زمانے کی بول چال کی زبان کا اندازہ کرنے کے لیے ہم کو جو مواد مل سکتا ہے اس کے ماخذ تین ہیں۔

(ا) اس زمانے کے فارسی شعرا کا کلام

(ب) فارسی لغات

(ج) ایرانی عرب سیاحوں کے سفرنامے

(۱) فارسی شعرا کا کلام

فارسی شعرا میں یوں تو سب سے پہلے مسعود سعد سلمان قابل ذکر ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے منوچہری نے اپنے کلام میں ہندوستانی کے لفظ برتے تھے۔

ا۔ فارسی شعرا کا کلام: منوچہری ۴۰۹ھ — منوچہری کا وہ شعر جس میں اس نے ہندوستانی کے لفظ استعمال کیے ہیں، یہ ہے:۔

الانا موناں دارند روزہ

الاتا ہندواں گیرند لنگھن[1]

---

[1] لنگھن الانگھن سے نکلا جس کے معنے روزہ کے ہیں۔

مسعود سعد سلمان
۴۵۱ھ — ۴۹۲ھ
۱۰۵۹ء — ۱۰۹۸ء

مسعود سعد سلمان سے جو دیوان منسوب کیا گیا ہے وہ توفی الوقت ہماری دسترس میں نہیں۔ تاہم اس کے فارسی دیوان میں جو ہندستانی لفظ ملتے ہیں وہ بھی حقیقت میں اس زمانے کی بول چال کی زبان کے نمونے ہیں۔ چنانچہ ذیل کا شعر اس سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) چو رعد زابر بغزید کوس محمودی ÷ برآمد از پس دیوار حصن مارا مار [1]

پروفیسر عبدالغنی [2] اور پروفیسر محمود شیرانی نے مسعود کا ذیل کا شعر بھی اسی سلسلے میں نقل کیا ہے جس میں "برشگال" کا لفظ آتا ہے۔ شعر یہ ہے:-

برشگال اے بہار ہندوستاں ÷ ای نجات از بلائے تابستاں

یہ سمجھنا کہ برشگال سنسکرت "ورش کال" سے لیا گیا ہے، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ فارسی اور سنسکرت متحد الاصل زبانیں ہیں اور یہ دونوں لفظ ایک ہی ماخذ کے دو الگ الگ ترقی پائے ہوئے روپ ہیں۔ فارسی شعرا ان لفظوں کے باندھنے پر ظاہر ہے اس لیے مجبور ہوئے کہ وہ بول چال کی زبان کے لفظ تھے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں بھی ہندوستانی لفظ باندھے گیے ہیں:-

اے پرستار رنگ وسکھ درپن ÷ وی گرفتار عشق شمع دگن [3]

یا

دل نمی ارزد کہ امنیش کسن ÷ وارہاند یا بہ بیوہاری دھار [4]

اس کے علاوہ بقول پروفیسر شیرانی

"خواجہ کے دیوان فارسی میں بعض باتیں ایسی موجود ہیں جن کو ہندوستان کا پرتو مانا جا سکتا ہے۔" [5]

---

[1] قلمی دیوان مملوکہ اے۔ کے فاتی، بحوالہ "پرشین انڈ مغل" و "پنجاب میں اردو" صفحہ ۶۳
[2] "ہسٹری آف پرشین لنگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ" صفحہ ۱۸
[3] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۳۳
[4] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 صفحہ
[5] پنجاب میں اردو صفحہ ۶۰

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

"فارسی زبان میں بارہ ماسہ کی صنف کی نظموں کا رواج نہیں ہے اور نہ سنسکرت میں ایسی نظمیں موجود ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ خواجہ نے دوازدہ ماہیہ لکھنے میں جسے غزلیات مشہور یہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پنجابی کی تقلید کی ہے" [1]

ان شواہد کی موجودگی میں مسعود کا ہندی میں دیوان مرتب کرنا بھی بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ہند اور ایران کے تعلقات کے سبب نہ صرف پنجاب آئے ہوئے ایرانی شاعر ہندوستانی کے لفظ اپنے فارسی کلام میں استعمال کرتے تھے۔ بلکہ ہندوستان سے ایرانیوں کے گہرے تعلقات کی بدولت کئی ہندوستانی لفظ سفر کرکے ایران پہونچ رہے تھے۔ محمود غزنوی کے درباری شعرا میں کئی ایسے شاعر گزرے ہیں جن کے کلام میں ہندوستانی لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں فرخی منوچہری اور سنائی قابل ذکر ہیں۔

فرخی [2] کے ایک شعر میں مندرجہ ذیل ہندوستانی لفظ ملتا ہے :-

بگونہ شل انغانیاں دو پرہ و یکسر ٭ چو دستہ دستہ بہم تیرہائے بے سوفار [3]

شاہنامہ فردوسی میں فردوسی نے بھی کئی ہندوستانی لفظ، جیسے کوتوال۔ بودھ (بت) وغیرہ استعمال کیے ہیں۔ کوتوال دراصل کوٹ والا یعنی مالک قلعہ تھا۔ فردوسی کا شعر ہے ؎

چو آگاہ شد کوتوال حصار ٭ برآو بخت با رستم نامدار [4]

کوتوال کی تشریح شرف نامہ کے مصنف اس طرح کرتے ہیں :

"واز شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بہ خراساں و فارس مشہور شدہ۔"

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ (۶۱)
[2] " " " " ۱۵
[3] " " " " ۵۰ [4] پنجاب میں اردو

سنائی
۵۲۵ھ یا ۵۴۵ھ

فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ محمود کے زمانے میں پنجاب آئے تھے۔ انھوں نے اپنے قصیدے میں کچھ ہندوستانی لفظ استعمال کیے ہیں۔ قصیدے کے شعر حسب ذیل ہیں:

تو پے مرگ ہرگز بجائے نہ یابی ✤ ز تشک لغت ہائے اپنی وانی
اسامی دراین عالم است ارنہ جائے ✤ چہ آب وچہ میدہ وچہ نام وچہ پانی

سنائی کا ایک اور شعر ہے:

نہ درآں معدہ خدرہ میدہ ✤ نہ درآں دیدہ قطرہ پانی [۱]

اور

تنگھنت گر کند ترا فربہ ✤ سیر خوردن ترا زنگھن بہ

عثمان مختاری
۵۴۴ھ

یہ غزنہ کے باشندے اور فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے والیٔ سندھ کی مدح میں قصاید لکھے تھے ان میں سے ایک قصیدہ کے ایک شعر میں کچھ ہندی الفاظ یوں باندھے ہیں:

زمن بدیدے بادے بجستہ گفتے چول ✤ مگر نہ دیدے برمن نشستہ گفتا "مار" [۲]

(ب) لغات

فارسی کے شعرا کے کلام کے علاوہ جن میں ہندوستانی کے لفظ دستیاب ہوئے ہیں کچھ فارسی لغات بھی ملتی ہیں جن میں ہندوستان کی اس عام بول چال کی زبان کو فارسی کے ذریعہ ایرانیوں کو سکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان لغات میں بعض تو سادہ نہج پر لکھی گئیں اور کچھ منظوم اور خالق باری کی طرح کی منظوم لغات ہیں۔ ان منظوم لغات سے اس زبان کے عام طور پر بول چال میں مروج ہونے کا مزید ثبوت ملتا ہے جس کو ذہن نشین کرنے کے لیے نظم کا آسان پیرایہ اختیار کیا جاتا تھا۔ جو روپ لفظوں کے ان لغات میں ملتے ہیں ان سے اس زمانے کی زبان اور اس کی لسانی ہیئت کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس سلسلے کی کتابوں میں مندرجہ ذیل لغات کا تذکرہ ضروری ہے۔ جن کی تفصیل پروفیسر محمود شیرانی [۳] اور حکیم

---

[۱] پنجاب میں اردو۔ صفحہ ( ) [۲] پنجاب میں اردو صفحہ ۹۵ [۳] ملاحظہ ہو پنجاب میں اردو صفحہ ۲۷۲

شمس اللہ قادری [1] نے دی ہے۔

ہندی فرہنگ نگاروں میں پروفیسر شیرانی تقدم مولانا فخرالدین مبارک غزنوی کی لغت "فرہنگ نامہ" کو دیتے ہیں۔

فرہنگ نامہ ۷۱۵ھ

فخرالدین (د ۶۹۵ھ / ۷۱۵ھ) عہد علاو الدین خلجی کے مشہور شاعر تھے۔ جن کا ذکر ضیاالدین برنی اور فرشتہ دونوں نے کیا ہے۔ اس میں انھوں نے فارسی الفاظ کی تشریح بعض موقعوں پر ہندی میں کی ہے۔ اس کے نمونے یہ ہیں۔

"ابر نیساں" کے بارے میں لکھتے ہیں:—

"اہل ہند آں را باراں سواتی نامند و آں ابتدائے زمستاں و انتہائے برشگال است" [2]

دیگر نمونے حسب ذیل ہیں:

پرستو — مرغیکہ ہندش بھکراج گویند

تاک — ہندش چھیکا نامند

قاقلہ — سایہ پرورکہ ہندش تیری گویند

دستور الافاضل ۷۴۳ھ

اس کے مصنف مولانا رفیع معروف بہ حاجب خیرات تھے۔ جس کے بارے میں پروفیسر شیرانی نے بتایا ہے کہ اس میں کچھ اردو کے لفظ بھی موجود ہیں۔

بحر الفضائل فی منافع الافاضل ۷۹۰ھ

یہ بھی ساتویں صدی ہجری ہی کی تصنیف ہے یہ سات جلدوں پر مشتمل تھی۔ حکیم شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی اب صرف دو جلدیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ابتدائی جلدوں میں فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ اکثر ہندوستانی مترادفات بھی درج کیے گیے ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو "اردوئے قدیم" صفحہ ۳۲ طبع ثانی۔ [2] پنجاب میں اردو صفحہ ۲۷۲

حکیم شمس اللہ قادری کے خیال کے مطابق اُردو زبان کی تاریخ میں یہ الفاظ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان سے اس زمانے کی زبان کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

چونکہ یہ آٹھویں نویں صدی ہجری کی تصانیف ہیں اس لیے ان کا ذکر اس زمانے کے کارنامو ں میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف بر سبیلِ تذکرہ ان کا ذکر کر دیا گیا جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بول چال کی یہ زبان عام طور پر مروج تھی۔ جیسا کہ پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ

"یہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برجی ہے نہ پنجابی نہ راجستھانی نہ بنگالی د گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اردو ہے جو اس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔"

لغات میں کچھ منظوم بھی ہیں۔

منظوم لغات میں اب تک ایک خالق باری کا ہم کو علم ہوا تھا لیکن حال کی تحقیقات نے کئی منظوم لغات کا پتہ چلا ہے۔ جو گجرات اور بمبئی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک کا ذکر سید سلیمان ندوی نے "نقوشِ سلیمانی" میں کیا ہے۔ اس کی تصنیف کا سنہ اور مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ یہ لغت اس طرح کی دوسری لغات کی طرح اس زبان کو ایرانیوں اور عربوں سے روشناس کرنے کے لیے ابتدائی دور میں لکھی گئی تھی۔ "نقوشِ سلیمانی" میں اس کے حسب ذیل دو اشعار لیے گیے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں بیک وقت عربی، فارسی، ہندوستانی کے لفظ استعمال کیے گیے ہیں۔ شعر یہ ہیں:-

اللہ، خدا، ہے کرتار ❊ الخالق، آفرید، سرجن ہار

الانیا، گیتی، سنسار ❊ الاحق، نادان، گنوار

ایک اور منظوم لغت پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے خانگی کتب خانے میں محفوظ ہے جس کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:-

الالہ پرستیدہ پوجیا ❊ المعلوم دانستہ بوجھیا

المجد سودہ لکھانیا ✤ المعروف شناختہ پچھانیا

ان چند تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو کے نشوونما کے ابتدائی دور میں منظوم لغات کی تصنیف و تالیف کا ایک وسیع سلسلہ جاری تھا منظوم لغات کی اہمیت اسلیے تھی کہ عام لغات کے مقابلے میں نظم میں باندھے ہوئے لفظ نو وارد زبان سیکھنے والوں کے ذہن میں آسانی سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

سفرنامے

ہندوستان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششوں میں ان عرب اور ایرانی سیاحوں کے کارناموں کو بھی بڑا دخل ہے جو دور دراز کا سفر اختیار کر کے ہندوستان آئے اور یہاں کے حالات اور رہنے سہنے کے طریقوں کا مطالعہ کیا اور ان کا تحریری مواد بھی چھوڑا جن میں اور چیزوں کے علاوہ ہمارے موضوع کے لحاظ سے وہ اشارے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جو ان سیاحوں نے ہندی زبان کے بارے میں چھوڑے ہیں۔

ابن بطوطہ ۷۲۵ھ

ان سفرناموں میں ابن بطوطہ کا "سفرنامہ" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ابن بطوطہ آفریقہ کے ایک شہر طنجہ کا رہنے والا تھا۔ وہ جس وقت ہندوستان آیا۔ دہلی کی سلطنت پر فیروز شاہ تغلق کی حکومت تھی۔ اس نے ہندوستان کی بہت سی چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے تقریباً (۴۰) لفظ دیے ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

کوتوال۔ سموسہ۔ انبہ (آم)۔ کشری۔ گسائیں۔ منڈی۔ پیادہ۔ نارگہ
گلہ بان۔ بدخانہ۔ قطارہ (کنارہ) شادش۔ مرطبان (مرتبان)۔
ٹٹو۔ بورا۔ سین۔ ڈول۔ جوتری۔ دیوڑھی۔ کھار۔ چاکر

ان الفاظ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عام بول چال کی زبان موجودہ اُردو کے کس قدر قریب پہونچ گئی تھی۔ بعض لفظ مثلاً کوتوال۔ سموسہ۔ گسائیں۔ منڈی چاکر۔ ٹٹو۔ بورا۔ سین۔ ڈول وغیرہ ٹھیک وہی لفظ ہیں جو اب اُردو میں مروج اور مستعمل ہیں۔ انبہ۔ بدخانہ میں موٹی تبدیلیاں ہوگئیں۔ ان سفرناموں کے علاوہ اس زمانے کی تواریخ

میں بھی اُردو کے الفاظ ملتے ہیں۔ چنانچہ ضیاء الدین برنی کی تاریخ " فیروز شاہی" میں صفحہ ۲۴۱ پر ملک فخر الدین کھنڈا اور ملک رکن الدین انبہ کے نام نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں کچھ اسی قسم کے اور عرف ملتے ہیں مثلاً ایک امیر " ہرن مار" کہلاتا ہے۔ دوسرے امیر کا خطاب " تورا باند" لکھا گیا ہے۔ فرشتہ نے قطب الدین کے زمانے کو کال قطب الدین[1] کہا — قطب الدین ایبک کو رعایا نے اس کی سخاوت پر " لکھ بخش[2]" کا خطاب دیا تھا۔ اس عہد کے سکّوں پر لفظ " شری امیر" کندہ ہوتا تھا۔[3]

قاضی سراج منہاج ۶۲۴ھ عہد التمش میں قاضی سراج منہاج ۶۲۴ھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے۔ اپنی تاریخ میں کوچ بہار اور اس کے قرب و نواح کے فتوحات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

" وایں را زبان دیگر است ؛ میان لغت ہندوست "[4]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ " لغات ہند" کے نام سے ایک ہندی زبان جو پنجاب سے لیکر بنگال تک وسیع تھی، پیدا ہو چکی تھی۔

خلیج فارس اور بحر ہند کے ذکر میں لکھتے ہیں:

" آب سنگمتی گویند چوں بہ دریائے ہندوستان در آید اورا بہ لغت ہندی سمندر گویند "[5]

اوپر کی تفصیلات سے اس کا تھوڑا سا خاکہ ذہن میں آجاتا ہے کہ باضابطہ تحریری نثر کے آثار دستیاب ہونے سے پہلے اُردو زبان اپنی سیّال حالت میں عام طور پر بول چال میں مروج تھی۔ باہر سے آنے والے ایرانی اور عرب یہاں کے رہنے والوں اور خاص طور پر نومسلموں سے تعلقات کے مدنظر اس زبان کو سیکھنے اور اختیار کرنے پر مجبور ہوتے جا رہے تھے۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳ مطبوعہ نول کشور [2] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳ مطبوعہ نول کشور
[3] ملاحظہ ہو " نقوش سلیمانی" صفحہ ۳۷ [4] بہ حوالہ " نقوش سلیمانی" صفحہ ۳۷
[5] " طبقات ناصری" سراج منہاج کلکتہ

اس باب کے آخری حصے کی تصنیفات سے جو ایک طرف تو نوواردوں کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے لکھی گئیں۔ دوسری طرف ہندوستانیوں کو عربی اور فارسی سے واقف کرانے تصنیف کی گئیں تھیں۔

سماجی زندگی میں اس زبان کے مقام اور اس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بول چال کی زبان ابھی تحریر کے طور پر مستعمل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کے مربوط نثری آثار اس زمانے میں دستیاب نہیں ہوئے۔ اُردو کے نشو ونما کا یہ دور جبکہ وہ محض بول چال کی زبان کی حیثیت سے ترقی کرتی رہی۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے لیکر آخر چھٹی صدی ہجری کے وسیع عرصے پر حاوی ہے۔

ابتدائی دو تین سو سال کے زمانے میں ہم کو مربوط نثر کے تحریری آثار دستیاب نہیں ہو سکتے اور قیاس یہ ہے کہ شاید اس کو ضبط تحریر میں لانے کے مواقع بھی نہیں تھے۔ کیونکہ زبانوں کی نشو ونما کے ابتدائی مراحل ہمیشہ تکلمی رہے ہیں۔ بولی کی صورت میں مستقل حیثیت اختیار کر لینے کے بعد ہی زبانوں کے تحریری آثار نشو ونما پانے لگتے ہیں۔ اُردو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ کلام کے ان منفرد آثار یعنی کلموں کو اجزائے کلام کی اس اہمیت کے مدنظر اُردو نثر کا نقطۂ آغاز تصور کیا جاسکتا ہے۔

۲

نثر پاروں کا آغاز

زبان کی نشو و نما کا دوسرا مرحلہ نثر پارے (جملے) نثر پاروں کی اہمیت
بزرگوں کے مقولے ۔ معین الدین اجمیری ۔ قطب الدین بختیار کاکی ۔
فرید الدین گنجشکر ۔ نظام الدین محبوب الٰہی ۔ نصیر الدین چراغ دہلوی
بوعلی قلندر پانی پتی ۔ شرف الدین یحیٰی منیری ۔ اشرف جہانگیر
زین الدین خلد آبادی ۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت ۔ قطب عالم
شاہِ عالم ۔ اس زبان کی ہر دل عزیزی کا ایک اور ثبوت قدیم دور
کے ایک بزرگ سید محمد امجہری کی رائے منقول از (مناقب محمدی
سوانح سید محمد امجہری) ۔

نثر پاروں کا آغاز

ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے اُردو کی تشکیل میں ایک قدم اور آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اُردو کے نثر پاروں یا ملفوظات کا دور ہے۔ جو ساتویں صدی ہجری کے اختتام تک جاری رہا۔ اس سو سال کے عرصے میں اُردو مستقل صورت اختیار کرتی گئی۔ اس کا اندازہ ان بزرگوں کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے اطراف کے عوام کی بول چال کی زبان کی رعایت یا اس کے استعمال کرنے کی مجبوری کے مدنظر اپنی فارسی تصانیف میں ہندی عوام اور خواتین سے تخاطب کے موقعوں پر کچھ اُردو کے جملے بھی شامل کر لیے ہیں۔

یہ ابتدائی آثار گو مربوط نثر کی تعریف میں نہیں آسکتے تاہم نثر کی تعریف سے خارج بھی نہیں کیے جا سکتے۔ کیونکہ بزرگوں کے یہ ملفوظات نظم میں نہیں اور اُردو میں ہیں اس لیے استخراجی طور پر ہم انھیں نثر یا نثر پاروں میں شمار کرنے پر مجبور ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اُردو کی حد تک یہ گویا نثر کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں ساتویں صدی ہجری کا آغاز وہ زمانہ ہے جبکہ دہلی میں محمد غوری کی قایم کی ہوئی مملوک بادشاہت اپنی ابتدائی کش مکش کے دور سے گزر کر کسی حد تک استقلال کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ اگلے دور کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ امن و امان کا دور تھا۔ بڑے بڑے اہل قلم، صوفی، شاعر، تاجر اور صناع، ایران و عرب سے ہندوستان آرہے تھے اور نئی شائستگی اور نئی زبانیں رکھنے والی قوموں کے ربط سے جو لسانی نتائج فطرتاً پیدا ہونے چاہئیں تھے وہ نشو و نما پا رہے تھے۔ اس زمانے میں ایرانی ادب پر تصوّف کا بہت گہرا اثر تھا۔ اور نئی قوم اور نئے مذہب کے لوگوں سے ہندوستان میں ربط پیدا ہونے کے بعد ان علماء کو اس کی ضرورت سختی سے محسوس ہوئی کہ ہندوستانی عوام کو اپنے مذہب کے

حقایق، تصوف یعنی ہمہ گیر محبت کی زبان میں سمجھائیں۔ اس زمانے میں جتنے علمار ہندوستان آئے انھوں نے تصوف ہی کی اصطلاحوں میں مذہب اسلام کو پیش کیا۔ تاکہ محبت اور پریم کی مفاہمت کے ذریعہ نئے تصورات رکھنے والے عوام کے درمیان زیادہ مستحکم تعلقات پیدا ہو سکیں۔ ان بزرگوں کے بہت سے سلسلے تھے۔ جیسے چشتی۔ قادری۔ نقشبندی۔ سہروردی وغیرہ ان میں سے کوئی عرب سے کوئی ایران سے اور کوئی افغانستان سے آئے تھے۔ ان کی اپنی زبانیں بھی مختلف تھیں۔ لیکن انھوں نے یہاں کے لوگوں کو ان کی زبان میں جس کو وہ ہند کی مناسبت سے "ہندی" کہتے تھے، اسی میں مخاطب کیا تاکہ ان کا پیام گھر گھر پہونچ سکے۔ اس سے قبل بدھ مت کی تلقین کرنے والوں نے بھی اس "گر" کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی عوامی زبان یعنی "پالی" کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا تھا۔ گوتم بدھ کی اپنے چیلوں کو خاص ہدایت تھی کہ وہ عوامی بولی میں اپنے مذہب کی تلقین کریں۔ پنڈت ایودھیا سنگھ ہری اودھ اپنی تصنیف "ہندی بھاشا اور ساہتیہ کے وکاش"[1] میں ایک واقعہ لکھتے ہیں جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

وہ کہتے ہیں "ایک دفعہ دو برہمن بھکشو اور انجیل مہاتما بدھ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ اے بھگوان مختلف ذات پات کے لوگ آپ کے پاک بولوں کو ناپاک کر رہے ہیں اس لیے ہمیں حکم دیجیے کہ ان چھندوں کو ہم سنسکرت میں لکھیں۔ مہاتما نے کہا بدھ مت کی تبلیغ سوائے "پالی" کے کسی اور زبان میں کرنا میری توہین ہے۔ میری باتوں کو اپنی ہی بھاشا میں سمجھنے کی کوشش کرو"۔

ان صوفی بزرگوں کے ہندوستان میں آنے اور ارشاد و ہدایت کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی سے اس نوخیز زبان کا تسلط زیادہ وسیع ہوتا نظر آتا ہے۔ تحریری آثار کا یہ ارتقار ایک حد تک منطقی بھی ہے یعنی اس سے پہلے کے دور کے منفرد الفاظ جن کے جملوں کے دوسرے اجزا

---

[1] صفحہ ۲۲۔ نیز ملاحظہ ہو ہندی بھاشا اور ساہتیہ شیام سندر داس صفحہ ۱۳

فارسی کے نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ اب اُردو میں مکمل طور پہ بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ تحریری آثار کا دوسرا مرحلہ ہے جس میں کم سے کم ایک مربوط خیال کے اظہار کی حد تک فارسی کے سہارے چھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی کے نتیجے کے طور پر اکثر بزرگوں کی فارسی تحریروں کے درمیان اُردو کے کچھ جملے بھی مل جاتے ہیں۔ اُن جملوں کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ فارسی کے مصنفین اور بزرگانِ دین کو ایسے موقعوں پر اُردو جملوں سے مدد لینی پڑتی تھی۔ جب وہ ہندی عوام سے گفتگو کرتے یا ان کے خیالات کو ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ نوخیز بولی اب ہندوستان کے لاکھوں عوام کی زبان بن چکی تھی۔ اور ان کے لیے فارسی میں افہام و تفہیم کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اسی لیے فارسی یا عربی بولنے اور لکھنے والے بزرگوں کو بھی اس زبان سے مدد لینی پڑتی تھی۔

ان فارسی علماء کا اُردو ادب کی تاریخ پر بڑا احسان ہے کہ ان کے احساسِ حقیقت پسندی نے حسبِ ضرورت ہندوستانی زبان سے کچھ جملے اپنی اصلی صورت میں محفوظ کر دیئے ہیں۔

خواجہ معین الدین اجمیری

ولادت ۵۳۰ھ سنہ ۶۳۰ھ

اس سلسلے کے بزرگوں میں جن سے اُردو کے مربوط جملے منسوب ہیں سب سے پہلے جن کا ذکر آتا ہے وہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری ہیں۔ اگر ملک محمد جائسی کی ہندی تصنیف "اکھراوٹ" کے شرح نگار[1] کے بیان کو صحیح مانا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین اجمیری اس زبان میں گفت و شنید فرماتے تھے۔ وہ لکھتا ہے:-

"توہم نہ کند کہ اولیا اللہ بغیر از عربی تکلم نہ کردہ زیرا کہ جملہ اولیا اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بودہ بس بہ ہر ملک کہ بودہ زبان آں ملک را بکار بردہ اند و گمان نہ کند کہ ہیچ اولیا اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردہ زیرا کہ اول از جمیع اولیا اللہ خواجہ بزرگ معین الحق والملت والدین بدین زبان سخن فرمودہ"[2]

---

[1] یہ کتاب معروف سے متعلق ہے گو رسم الخط فارسی تھا لیکن زبان برج بھاشا یا اجتھانی ہے۔ اسکے کئی ترجمے اور شرحیں فارسی میں ہوئیں اُردو میں عشرتی نے ۱۲۲۵ھ میں اسکی دوسری تصنیف پدماوت کو نظم کیا تھا۔

[2] ملاحظہ ہو اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کلام صفحہ ۲۴

اس کی تائید خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات سے بھی ہوتی ہے۔ ان کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کا پیشہ طب تھا۔ یعنی ان کو رات دن عوام سے سابقہ رہتا تھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ خواجہ صاحب ہندوستانی مریضوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے۔

خواجہ صاحب ۵۶۱ھ میں شہاب الدین محمد غوری کی فتح سے تقریباً تیس پینتیس سال پہلے اجمیر آئے ان کا مولد اصفہان تھا۔ اجمیر میں تصوف کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بھی کھولا تھا۔ وہ اپنے پیشے طب کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھے۔ اسی مقبولیت کے باعث ایک ہندو خاتون نے ان سے عقد کر لیا تھا [۱] خواجہ صاحب فارسی کے بڑے اچھے شاعر اور فارسی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پیشے کے علاوہ ان کا نجی مشغلہ ارشاد و ہدایت تھا۔ اس کی وجہ سے بھی ان کا ہندوستانی زبان اختیار کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خواجہ صاحب کے ملفوظات کسی تاریخ یا تذکرہ میں دستیاب نہیں ہوتے۔ البتہ ان کے خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی کے کئی مقولے دستیاب ہوئے ہیں۔

قطب الدین بختیار کاکی اولیاء
۵۸۲ھ — ۶۳۴ھ

قطب الدین بختیار کاکی حسینی سید اور معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے۔ ان کا تعلق ماوراء النہر کے ایک معزز خاندان سے تھا۔

ابھی وہ کم سن ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے ڈیڑھ سال ہی کی عمر میں تعلیم کے لیے ایک ہمسایہ کے حوالے کر دیا وہ انھیں شیخ ابو حفص کے پاس لے گیا جو اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ شیخ نے ان کی تعلیم و تربیت میں بہت دلچسپی لی۔ لیکن سن شعور کو پہونچنے کے بعد انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ خواجہ صاحب نے انھیں دہلی میں اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ ان دنوں دہلی میں شمس الدین التمش (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء) کی حکومت تھی، وہ بڑا خدا ترس اور پرہیز گار بادشاہ تھا۔ وہ بھی آپ کے ارادت مندوں میں

---

[۱] ملاحظہ ہو مضمون رسالہ سیاست "ہندوستان قرون وسطیٰ میں" از آر۔ بسنت راو۔ و تذکرہ "خزینۃ الاصفیا"

داخل ہوگیا۔ دھلی میں بہت دن تک انھوں نے تبلیغ واشاعت دین کا فرض انجام دیا۔ دھلی میں حضرت نظام الدین محبوب الٰہی اور بابا فرید شکر گنج ان کے مشہور خلفا ہیں۔ بختیار کاکی کا انتقال سنہ ۶۳۴ھ میں ہوا۔[1]

بابا فرید گنجشکر کے ملفوظ "جواہر فریدی" میں بختیار کاکی سے ایک اور جملہ منسوب کیا گیا ہے۔ "جواہرِ فریدی" میں لکھا ہے: جب بختیار کاکی دھلی میں مقیم تھے۔ بابا فرید گنج شکر آشوبِ چشم کی وجہ سے آنکھ پر پٹّی باندھے ہوئے پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت بختیار کاکی نے جب ان سے پٹّی باندھنے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے یہ اُردو جملہ فرمایا کہ "آنکھ آئی ہے"۔ جس کے جواب میں بختیار کاکی نے ارشاد فرمایا:

"اگر آنکھ آئی ہے تو سو آئی ہے"[2]

بابا فرید شکر گنج
سنہ ۵۸۰ھ – سنہ ۶۶۴ھ

شیخ کے والد جمال الدین سلمان، محمود غزنوی کے بھتیجے تھے۔ جو شہاب الدین غوری کے عہد میں کابل سے لاہور آئے اور کچھ دن یہاں قیام کرنے کے بعد بادشاہ کے حکم سے ملتان پہنچے۔ وہاں مُلّا وجیہہ الدین خجندی کی دختر مریم خاتون سے انھوں نے عقد کیا۔ مریم خاتون ہی کے بطن سے شیخ فرید الدین گنجشکر سنہ ۵۸۰ھ میں ملتان میں تولد ہوئے۔ شیخ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضؓ سے ملتا ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ملتان میں حاصل کی۔ ایک دن ملتان کی مسجد میں منہاج الدین سے فقہ میں "نافع" کا درس لے رہے تھے کہ خواجہ قطب الدین بختیار

---

[1] ان کے انتقال کے متعلق عجیب روایت ہے، مشہور ہے کہ سماع کے دوران قوال کے اس شعر پر ع "کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ٭ ہر زماں از غیب جانِ دیگر است" آپ کو وجد آیا اور جاں بحق تسلیم ہوئے۔

[2] اس جملے کے متعلق تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری اپنی کتاب "اُردوئے قدیم" میں پیر کے ارشاد کے بارے میں دوسرا جملہ نقل کرتے ہیں یعنی "اگر آنکھ آئی ہے این را چرا بستہ دید" محمد غوث قلندر پانی پتی کے ملفوظ تذکرہ غوثیہ میں مندرجہ بالا جملہ درج ہے۔ یہ روایت بھی عام ہے کہ شکر گنج کے خاندان والوں کی آنکھ ایک بڑی ایک چھوٹی ہوتی ہے۔ اس طرح سوائی آنکھ آپ کے خاندان کی خصوصیات سمجھی جاتی ہے۔

کاکی کا اس طرف گزر ہوا۔ بختیار کاکی نے ان سے پوچھا "اے طفل چہ میخوانی" جواب دیا "نافع" فرمایا نفع آور ہو" اس پہلی ملاقات میں وہ اپنے مرشد بختیار کاکی سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے ہمراہ دھلی جانے کے لیے تیار ہو گیے۔

حضرت نے فرمایا ابھی علوم ظاہری کی تکمیل کرو اور کہا "زاہد بے علم مسخرۂ شیطان است" چنانچہ اس کے کچھ دن بعد وہ قندھار و ملتان گیے۔ وہاں اپنے پیر حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں دھلی پہونچے۔ یہاں سے خرقۂ خلافت لیکر پنجاب کے شہر اجودھن میں پہونچے، وہیں ۶۶۴ھ میں (۱) بابا صاحب کا انتقال ہوا۔

بابا فرید کے اکثر مقولے "سیر الاولیا" (ملفوظ شیخ نظام الدین) اور "جواہر فریدی" (ملفوظ بابا فرید شکر گنج) میں محفوظ ہیں۔ پہلا ان میں سب سے مشہور و معروف "پونوں کے چاند والا" فقرہ ہے۔ جو انھوں نے جمال الدین ہانسوی کے بیٹے برہان الدین ہانسوی کی نسبت ان کی والدہ "مادرِ مومناں" سے کہا تھا۔

یہاں ایک خاص امر کی طرف اشارہ ضروری ہے وہ یہ کہ ان بزرگوں نے جو اُردو جملے ارشاد فرمائے ہیں ان میں سے اکثر عورتوں سے مخاطبت کے دوران میں ملفوظ ہوئے ہیں، چنانچہ اکثر قدیم دینی کتابیں بھی خواتین کو مذہبی مسایل سمجھانے کے لیے ہی لکھی گئی ہیں۔ ان میں مختلف "چکی نامے" "سہاگن نامے" "لوریاں" "پہیلیاں" وغیرہ شامل ہیں۔

مادرِ مومناں، شیخ جمال الدین ہانسوی کی، جو بابا فرید کے، محبوب خلیفہ تھے، کنیز تھیں شیخ کی خاطر بابا صاحب بارہ برس ہانسی میں مقیم رہے۔ بعد میں جمال الدین ہانسوی نے ان خاتون سے عقد کر لیا تھا۔ یہ کنیز، جمال الدین ہانسوی کے پیغام شیخ کی خدمت میں لایا کرتیں جب جمال الدین ہانسوی کا انتقال ہوا تو "مادرِ مومناں" جمال الدین کی قبا مصلے اور عصا لیکر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ بابا نے یہ تمام چیزیں حضرت کے کمسن صاحبزادے

---

(۱) ڈاکٹر عبدالحق اپنی کتاب "اُردو کی ابتدائی نشو و نما" میں صوفیائے کرام کے کام میں بابا کا سنہ ولادت ۵۹۹ھ اور سنہ وفات ۶۶۴ھ لکھتے ہیں۔ "خزینۃ الاصفیا" میں ۵۶۹ھ سن ولادت اور ۶۶۴ھ سن وفات درج ہے۔

برہان الدین کو عنایت کردیں اور ان کا جانشین مقرر کردیا۔ اس موقع پر "مادرِ مومناں" نے برہان الدین کی کمسنی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا کہ "خوجا بالا ہے" اس پر شیخ نے فرمایا:

"پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

"سیر الاولیاء"[1] کی اصلی عبارت درج ذیل ہے:

"مادرِ مومناں کہ خادمہ شیخ جمال الدین بود مصلے و عصا شیخ جمال الدین از شیخ الشیوخ العالم یافتہ بود مولانا برہان الدین صوفی پسر خورد شیخ جمال الدین کہ پدر شیخ قطب الدین منوّر بود در عالم حضر بود۔ بخدمت شیخ الشیوخ العالم آمد۔ شیخ الشیوخ العالم بہ مرحمت مولانا برہان الدین مذکور را تعظیم و تکریم نمود و بشرف ارادت و بیعت خود مشرف گردانید۔ و چند روز بر خود داشت۔ بوقت مراجعت خلافت نامہ و آن مصلے و عصا با نعمتے کہ مولانا شیخ جمال الدین رواں کردہ بود بہ مولانا برہان الدین صوفی بخشید۔ و فرمود از جہت ما مجازی بود تو ہم مجازی و ایں ہم فرمود باید کہ چند گہے در صحبت مولانا نظام الدین باشی یعنی سلطان المشائخ دریں محل مادر مومناں بخدمت شیخ الشیوخ العالم عرضداشت کرد "خوجہ بالا است" بہ زبان ہندی گفت "مادرِ مومناں پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے۔" یعنی ماہ شب چہاردہم در اول شب خورد باشد کہ بہ تدریج بہ کمال می رسد۔"

"سیر الاولیاء" ہی میں ایک اور مقولہ ملتا ہے جو بابا فرید نے شیخ علی احمد صابر سے اس وقت کہا تھا جب وہ اپنے خلفا کو ایک ایک سمت روانہ کرکے نصیحتیں کر رہے تھے۔ بابا صاحب نے حضرت صابر کی طرف دیکھ کر فرمایا جس کو "سیر الاولیاء" کے جامع میر خورد[2] نے اس طرح نقل کیا ہے: "اے صابر برو برگ با خواہی کرد" یعنی ترا میش خوش خواہد گزشت۔

---

[1] "سیر الاولیا" ملفوظ شیخ نظام الدین مطبوعہ مطبع محب ہند باہتمام منشی چرنجی لال صفحہ ۱۸۲ اور ۱۸۳

[2] ہ

" جواہر فریدی" میں ایک اور واقعہ مذکور ہے۔ کہتے ہیں سرسہ کے مقام پر بابا فرید ایک بزرگ کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ ایک روز کچھ لوگ راستے میں چھپ کر بیٹھ گیے۔ جب بابا فرید کو معلوم ہوا تو ناخوش ہوئے اور ہندی میں فرمایا:

" سرسہ کبھی سے سہ کبھی نرسہ" [۱]

اس کے علاوہ "جواہر فریدی" ہی میں ان کا ایک "ذکر" بھی ہندی زبان میں منقول ہے؛ جو حسب ذیل ہے :-

" اینو ہہ تون انھونہ تون اہن تون"

(یہاں تو' وہاں تو' سب جگہ تو)

" جواہرِ فریدی" کے اس ہندی "ذکر" کی تصدیق دار المصنفین کے کتب خانہ میں مخزونہ ایک رسالے "جواہرِ خمسہ" ([۲]) سے ہوتی ہے۔ یہ رسالہ ۱۰۹۷ھ کا مرتومہ ہے کس میں بابا شیخ فرید کے بارے میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :-

" بندگی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید گنجشکر قدس اللہ سرہ ذکر بہ زبانِ ہندی وضع فرمودند در عمل آوردہ اند در باب این اند۔"

ایک اور مقولہ بھی اسی کتاب میں منقول ہے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مرید نے بابا صاحب سے دریافت کیا جسم میں عقل کا مقام کونسا ہے؟ انھوں نے جواب دیا:

" بیچ سر کے"

بابا شیخ فرید کے خلیفہ خواجہ بدر الدین اسحاق کے ملفوظہ میں مذکور ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کو "بھیا" کہا کرتے تھے [۳]۔

ان مقولوں کے علاوہ "اُردو کے نشوونما" میں صوفیائے کرام کا کام" اور "تاریخ داستان

---

[۱] جواہر فریدی مخطوط مخزونہ، کتب خانہ آصفیہ، نیز ملاحظہ ہو "پنجاب میں اُردو" صفحہ

[۲] نقوش سلیمانی صفحہ (۲۱)

[۳] ملاحظہ ہو "اُردوئے قدیم" اڈیشن دوم ۱۹۲۷ء۔ صفحہ ۲۲۔

اُردو" میں ان سے کچھ اشعار بھی منسوب کیے گیے ہیں لیکن مولانا سلیمان ندوی کو ان اشعار کی اصلیت کے بارے میں شُبہ ہے۔ ایک شعر یہ ہے:

"وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے ❊ خیز دراں وقت کہ برکات ہے"

ڈاکٹر عبدالحق نے حضرت قطب عالم کے "جمعاتِ شاہی" سے بابا فرید کا مندرجہ ذیل منظوم قول بھی درج کیا ہے:۔

اسا کیری بھی سو ریت ❊ جاؤں نائے کہ جاؤں سیت

بابا صاحب سے ہندی اور پنجابی میں چند "کافیاں" بھی منسوب کی جاتی ہیں لیکن بعض علماء ان کافیوں کو نانک کی لکھی ہوئی سمجھتے ہیں۔ لیکن پروفیسر محمود شیرانی اور ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، نیز ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کافیاں بابا فرید کی نہیں بلکہ نانک کے معاصر کسی اور فرید کی ہیں۔

نظام الدین محبوب الٰہی
۶۳۴ھ تا ۷۲۵ھ

بابا فرید گنجشکر کے خلیفہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے ملفوظات ان کے دو شاگردوں نے جمع کیے ہیں۔ ان میں سے ایک "سیرت الاولیا" ہے جسے سید محمد مبارک علوی کرمانی المدعو میر خورد نے مرتب کیا۔ اور دوسری "فواد الفواید" امیر خسرو کے دوست میر حسن سنجری[2] نے تالیف کی۔ گو ان ملفوظات میں ان کا فرمودہ کوئی قول نہیں ملتا لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس سلسلے کے سارے بزرگ ہندوستانی عوام کی ارشاد وہدایت کے لیے ہمیشہ اُردو زبان استعمال کرتے رہے تو قیاس بھی چاہتا ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین نے بھی ضرور اس زبان کو اظہارِ مطلب کا ذریعہ بنایا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے ملفوظات محفوظ نہ رہ سکے۔ اور شاید اب ناپید ہیں۔ اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیری سے لیکر اس سلسلے کے کئی بزرگ اور پھر خود ان کے خلفاء خواجہ

---

[1] ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین

[2] یہ امیر خسرو کے بڑے گہرے دوست تھے۔

بندہ نواز اور نصیر الدین چراغ دھلوی اس نوخیز زبان میں گفت و شنید اور تکلم و تفہیم فرماتے تھے۔
جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ان ملفوظات میں آپ سے منسوب کوئی جملہ نظر نہیں آتا۔ البتہ حضرت ہاشم حسینی العلوی کے ملفوظ "مقصود المراد" میں ایک جملہ ملتا ہے۔ حضرت ہاشم حسینی حضرت شیخ نظام الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اقوال دہراتے ہیں:

"چہ خوش گفتار شاہِ نظام است" "نظام کرتا آپ کرتار" [1]

اس قول کے بارے میں حکیم شمس اللہ صاحب قادری [2] کا خیال ہے کہ یہ ملفوظ حضرت نظام الدین کا نہیں بلکہ ہاشم حسینی العلوی کے کسی مرید نظام الدین نامی کا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ حضرت شیخ نظام الدین ہی کا ملفوظہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ جس ادب و احترام سے حضرت ہاشم حسینی نے ان کا تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت ہاشم کے پیرِ طریقت ہی ہیں، نہ کہ ان کے شاگردوں میں سے کوئی اور۔

نصیر الدین چراغ دہلوی
۷۵۲ھ

اس عہد کے دوسرے مشہور بزرگ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی ہیں۔ خواجہ نصیر الدین، حضرت نظام الدین کے خلیفہ اعظم اور حسینی سیّد تھے۔ ان کا وطن لاہور تھا لیکن خواجہ نصیر الدین کی ولادت اودھ میں ہوئی۔ وہ بڑے زاہد اور جیّد عالم تھے۔ اسی بنا پر حضرت نظام الدین محبوب الٰہی نے انھیں "چراغ دہلوی" کا خطاب دیا تھا۔ ان کی عوام میں مقبولیت کی وجہ سے بادشاہِ وقت محمد تغلق کو ان سے ڈر پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے ان کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ان کے ملفوظ "خیر المجالس" میں کئی نثر پارے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنی کتاب "تاریخ زبانِ اُردو" میں ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: علی مولا بدایونی، حضرت نظام الدین کے متعلق جو اس وقت سن بلوغ کو پہونچ چکے تھے۔ یہ پیشین گوئی

---

[1] ملاحظہ ہو ملفوظہ ہاشم حسینی العلوی صفحہ ( )
[2] ملاحظہ ہو "اُردوئے قدیم" طبع سوم صفحہ ( )

فرماتے ہیں :

"علی مولا چوں دید آغاز کرد بہ زبان ہندی" ارے مولانا یہ بڑا ہوسی"
یعنی اے مولانا ایں مرد بزرگ خواہد شد" مولانا علاوالدین گفت "علی از کجا می
گوئی" "گفت" من در آرد و چیزے می بینم یکے آں است کہ بہ زبان ہندی
گفتند"،

"جو مندا سا بندی سو پائین بسری"
یعنی "آں کہ دستار بر سر بندد او در پائے کسے افتد"

اس میں ایک اور جملہ اس طرح درج ہے :

"فرمودند کہ در عہد موسیٰ بت پرستی بود روزے او را تپ آمد بر سر پائے بت
سر نہاد و گفت۔
"تو مرا گسائیں تو میرا کرتار مجھ اس تاپ تھیں چھڈا [1] ہیچ جواب نیامد"

اس کے علاوہ ان کا ایک اور مقولہ ملتا ہے جو انھوں نے اپنے مرید شیخ اخی سراج کو بنگالہ جانے کی ترغیب دیتے وقت کہا تھا جس وقت حضرت نصیر الدین نے شیخ اخی کو بنگالہ جانے کا حکم دیا تو شیخ نے جواب دیا، وہاں حضرت علاوالدین موجود ہیں ان کی موجودگی میں میرے جانے کی ضرورت نہیں اس پر انھوں نے ہندی میں جواب دیا :

"تم اوپر وے تل" [2]

شاہ بو علی قلندر پانی پتی
۷۲۴ ہجری

شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی حضرت امام اعظم کی اولاد میں سے تھے اور اپنے وقت کے یگانہ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ وہ فارسی میں تصانیف کثیرہ کے مالک تھے فارسی میں ان کی مندرجہ ذیل تصانیف مشہور ہیں "جامع علم توحید" "رسالہ حکمنامہ" کچھ عارفانہ

---

[1] "تاریخ زبان اردو" صفحہ (۱۴۲) [2] "اردوئے قدیم" طبع دوم صفحہ (۲۳)

مثنویاں اور چند فارسی مکتوبات جو انھوں نے اپنے مرید اختیار الدین کے نام لکھے تھے۔[۱]
اُردو میں ان کی کوئی تصنیف یا تالیف نہیں ملتی۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب میں مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا اور ایک مقولہ اور دوہا دیا ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"ایک مرتبہ امیر خسرو نے ان کو اپنا گانا سنایا جس کو سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اپنا بھی کچھ کلام سنایا اسے سنکر امیر خسرو بہت آبدیدہ ہوئے، حضرت نے فرمایا "ترکا کچھ سمجھ دا ہے" امیر خسرو نے کہا، اسی لیے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھا"

مندرجہ ذیل دوہا بھی ان ہی سے منسوب کیا جاتا ہے :

"سجن سکھارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کہ بھور کدھی نہ ہوئے" [۲]

شرف الدین یحییٰ منیری
۶۶۲ھ تا ۷۸۲ھ

شیخ شرف الدین کا تعلق بہار کے مشہور صوفی خاندان سے تھا۔[۳] شیخ کے دادا حضرت تاج فقیہہ بیت المقدس سے ۵۷۶ھ میں منیر تشریف لائے۔ منیر کی تاج شاہی "مٹھائی" ان ہی کے عہدِ شیریں کی یادگار آج تک بھی خاص وعام کے دل پسند ہے۔ ان کے تین فرزند اسرائیل، عبدالعزیز اور اسمٰعیل وہیں رہ بس گیے۔ جناب اسرائیل حضرت مخدوم یحییٰ منیری، کے والد ماجد تھے۔ ان کی شادی پیر شہاب الدین، "جگ جوت" کی لڑکی سے ہوئی۔ اور ان ہی کے بطن سے شرف الدین یحییٰ منیری پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے علم وفضل کا حال سُن کر بیعت کے ارادے سے دہلی گیے۔ لیکن وہاں جاکر نجیب الدین فردوسی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگیے۔ کیونکہ اس وقت سلطان المشائخ کا انتقال ہوگیا تھا۔ بیعت کے بعد وطن کا قصد کیا اور راستے میں کئی دن عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔ ان کے زہد و اتقاء کا دور دور تک چرچا تھا۔ انھوں نے ایک بزرگ سید اشرف جہانگیر سمنانی،

---

[۱] "اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۲۱) [۲] اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۲۱)
[۳] خزینۃ الاصفیا "صفحہ ۱۸۶، نیز مضمون "بہار میں مثنوی نگاری" از اختر اورینوی مطبوعہ "ساقی" کراچی، مارچ ۵۴ء

کے ہندوستان آنے کی پیشین گوئی کی تھی۔

تصانیف فارسی میں ان کی دو کتابیں "ارشاد السالکین" اور شرح "آداب المریدین" بیان کیجاتی ہیں۔ پروفیسر حسن عسکری استاد تاریخ پٹنہ کالج نے اپنے مضمون "قرونِ وسطٰی کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت" مطبوعہ سالنامہ "ساتھی" ستمبر ۱۹۵۲ء (پٹنہ) میں ایک اردو نثری قلمی نسخہ کی اطلاع دی ہے اور اسے حضرت شرف الدین یحیٰی منیری سے منسوب کیا ہے۔ گو یہ اس وقت ہماری دسترس میں نہیں لیکن ان کا اس زبان میں رسالہ یادگار چھوڑنا ناممکن نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ان کا بہت سا اردو کلام دوہروں، کہ مندروں، اور عمل کی شکل میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ ان کے مریدِ خاص زین بدر عربی نے ۷۴۹ھ میں "معدن المعانی" کے نام سے ان کے ملفوظات کا مجموعہ تالیف کیا تھا۔ اس ملفوظ، نیز دوسرے صوفیوں کے ملفوظات سے اس عہد کی زبان کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے "معدن المعانی" سے اپنی تصنیف "نقوشِ سلیمانی" میں ان کے چند نثر پارے اور آنکھوں کی تکلیف دور کرنے کا ایک منظوم نسخہ بھی نقل کیا ہے۔ نسخہ یہ ہے:

"لودھ پھٹکر مردہ سنگ ٭ ہلدی، زیرہ ایک ایک ٹنک
افیون، چنا بھر مرچیں چار ٭ ارد بھر موتھا اسیں ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے ٭ نینا پیر اپل میں ہرے"۔ [۱]

اس نسخہ کو یحیٰی تنہا صاحب مصنف "سیر المصنفین" نے خسرو سے منسوب کیا ہے لیکن تنہا صاحب نے خسرو کی کسی تصنیف کا حوالہ نہیں دیا۔ اس لیے ندوی صاحب ہی کا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ "معدن المعانی" سے سید سلیمان ندوی نے کچھ اردو کے فقرے بھی نقل کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی کے عرض کرنے پر کہ
"یہ زبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است" بات بھلی پر سانہ کرے"

---

[۱] نقوشِ سلیمانی صفحہ ۴۸

حضرت شیخ نے اس کی تائید میں فرمایا :

" بعدازاں بندگی مخدوم عظمہ الہ برزبان مبارک راند" دیس بھلا پردور" [1]

اسی واقعہ کو پروفیسر حسن عسکری اپنے مقالہ " شمالی ہند کے صوفیائے کرام کی ہندی دوستی" مطبوعہ معاصر" جلد (۴) میں دوہرے کی شکل میں مظفر بلخی کے مکتوب سے منقول کرتے ہیں، دوھرہ یوں ہے :-

" باٹ بھلی پر سانکری نگری بھلی پر دور ؛ ناہہ بھلا پر پا تلا کر ھر چوز "

" نقوش سلیمانی" میں ندوی صاحب نے دیسنہ ضلع پٹنہ کے کتب خانہ اصلاح میں مخزونہ حضرت شرف الدین یحیٰ منیری کے ایک فالنامہ کا بھی ذکر کیا ہے جو ستائیس فقروں پر مشتمل ہے چند اردو فقرے حسب ذیل ہیں :-

۱۔ جو من کی ہنسی کیا ہوئی سو ہوئی

۲۔ ناہیں کچھ کرو نصیب لاگی بات ہے

۳۔ راج پاٹ چل کے دیا تمکون

۴۔ آگے برے دن گیے اب سکھ پاؤ گے [1]

ایک کچ مندرہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے جس کا ذکر پروفیسر عبدالغنی نے اپنی تصنیف " پرشین لنگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ " میں کیا ہے ۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی تصنیف " اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ان کے چند دھرے نقل کیے ہیں ۔ گو یہ اس مقالے کے موضوع سے راست تعلق نہیں رکھتے تاہم زبان کا اندازہ کرنے کے لیے نقل کیے جاتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل دوھرے میں شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کا نام بھی آیا ہے :

" شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے ۔ گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے " [2]

---

[1] " نقوش سلیمانی " صفحہ ۹۴

[2] " اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام " صفحہ ۲۰

اشرف جہانگیر سمنانی
سنہ ۶۸۰ھ ۔ سنہ ۸۰۸ھ

اشرف جہانگیر سمنانی، صوفی کامل اور زاہد باعمل تھے۔ ان کے والد سلطان ابراہیم سمنان کے بادشاہ تھے۔ والد کی وفات کے بعد سید اشرف جہانگیر نے کچھ دنوں تک امور سلطنت کی دیکھ بھال کی، پھر تخت و سلطنت چھوڑ کر فقیر ہو گیے۔ سات سال کی عمر میں انھوں نے قرآن حفظ کیا۔ اور چودہ سال کی عمر تک علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کر لی جب وہ چودہ سال کے ہوئے تو والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے اپنی مرضی کے خلاف لوگوں کے مجبور کرنے پر تاج و تخت قبول کیا لیکن کچھ عرصہ بعد پھر سب کچھ چھوڑ کر شیخ رکن الدین علاؤ الدین سمنانی اور دوسرے عالموں اور زاہدوں سے ربط پیدا کیا۔ ۲۳ سال کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اور پہلے واچھ (سندھ) میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی خدمت اقدس میں گیے۔ پھر وہاں سے دھلی چلے گیے۔ جہاں علما اور فاضلین وقت جمع تھے۔ دھلی سے شیخ علاؤ الدین علاؤ الحق بنگالی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان کی بہت عزت و تکریم کی اور خرقۂ خلافت عطا کرنے کے بعد جونپور جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے جواب دیا، وہاں ایک شیر ہے، میں ان سے کیسے بسر آسکتا ہوں۔ (شیر سے ان کی مراد شیخ رکن الدین ابوالفتح۔ یعنی بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کے نبیرہ سے تھی)۔

شیخ نے جواباً کہا "تم خود شیر ہو تمہیں کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے"، مطلب یہ کہ علم و فضل میں تم کسی سے کم نہیں۔ کیفیت یہ تھی کہ جہاں سے وہ گزرتے بڑے بڑے علما و فضلا آکر قدمبوس ہوتے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک مقام پر خلفائے راشدین پر بحثیں ہو رہی تھیں، کیونکہ انھوں نے ایک رسالہ خلفائے راشدین کی مدح میں لکھا تھا اور اس میں حضرت علیؓ کو دیگر صحابائے کرامؓ پر کسی قدر فوقیت دی تھی۔ اس بنا پر عوام کو ان پر شیعہ ہونے کا شبہ ہوا۔ لیکن بعد میں لوگ ان کے علم و فضل کے قائل ہو گیے۔ شہر جونپور کی سیر کے بعد کچھوچھہ (اودھ) گیے، وہاں کچھ دن قیام کے بعد شیخ بدیع الدین کے ہمراہ حرمین شریفین، مدینہ منورہ، نجف اشرف وغیرہ کی زیارت کی۔ واپسی میں اپنے وطن سمنان بھی گیے۔ وہاں سے کابل، غزنی قندھار اور ترکستان کا سفر کیا۔ اجمیر اور اجودھن میں خواجہ معین الدین اجمیری اور بابا فرید گنجشکر

کے مزاروں کی زیارت کی پھر گجرات اور گلبرگہ بھی گیے۔ گلبرگہ میں خواجہ بندہ نواز کے ہاں کچھ روز قیام کرنے کے بعد کچھوچھہ جا کر مقیم ہو گیے اور وہیں ۸۰۸ھ میں وفات پائی [1]

تصانیف

انھوں نے فارسی میں بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ حامد حسن قادری مصنف "داستان تاریخ اردو" کے بیان کے بموجب انھوں نے اردو نثر میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ (جس کے بارے میں آگے تفصیل دی گئی ہے) ان کے ملفوظ "لطائف اشرفی" [2] میں کئی اردو مقولے اور الفاظ ملتے ہیں۔ اسی ملفوظ میں ایک حکایت اس طرح آئی ہے:-

"سید اشرف جہانگیر سمنانی جب ردولی سے گزر رہے تھے اس کے قریب گاؤں میں مولانا کریم الدین دانشمند رہتے تھے۔ سید موصوف ان سے ملنے جانے لگے تو کسی نے مولانا کو جا کر اطلاع دی۔ انھوں نے فرمایا "ہی ہی" حضرت ایشان را نشاید کہ در خانہ من بیائند ایشان بسیار مرد بزرگ اند" و مثل ہندوی فرمودند کہ

"جھیری کے منہ کھنڈا سمائے"

ان کے ملفوظ میں سانپ بچھو کے کئی منتر اور دواؤں کے کئی نسخے بھی ملتے ہیں جو اردو میں ہے کچھ ہندی الفاظ بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ جیسے 'چونا' 'میتھی' وغیرہ "لطائف اشرفی" ہی میں ذیل کے واقعہ کے سلسلے میں ایک اور فقرہ بھی ملتا ہے۔

شیخ راجا نامی ایک بزرگ زہد و اتقا میں بڑے مشہور تھے۔ وہ کوئی کام خلافِ شرع نہ کرتے تھے۔ ایک دن حضرت مخدوم ایک مجذوب ابراہیم نامی سے ملنے تشریف لے گیے۔ شیخ راجا بھی ہمراہ تھے۔ ابراہیم نے جو تارک الصلوٰۃ تھے۔ سید موصوف کو کھانے پر مدعو کیا۔ سید موصوف شریکِ طعام ہو گیے۔ ابراہیم

---

[1] "خزینۃ الاصفیا" صفحہ (۳۹۷) [2] "لطائف اشرفی" مطبوعہ نصرت المطابع دہلی صفحہ ۱۰۷، ۱۳۰

نے پوچھا آپ کا دوسرا ساتھی (مراد شیخ راجا) کہاں ہے۔ اسے بھی بلا لیجیے اس پر راجہ نے جواب دیا "میں تاریک الصلوٰۃ کے ساتھ ہم طعام ہونا نہیں چاہتا" مجذوب کو بہت غصہ آیا اور اسی غصہ میں ان کے تکیہ کھینچ مارا۔ جب حضرت مخدوم نے آکے بیچ بچاؤ کیا تب مجذوب کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ حضرت نے شیخ سے پوچھا راجہ تم نے یہ کیا کم عقلی کی جو کھانا نہیں کھایا، اس پر شیخ راجہ نے جواب دیا:

"عجیب مردمان اند و بہ زبان ہندی گفت

"بن پرکھ آپنے ایسوں کہنہ آپتے ویسوں کہنہ [1]"

وہ متبسم ہوئے اور کہا عقیدہ اور طلب، اس مرتبہ تک ہونی چاہیے کہ ناممکن اور ممکن میں تمیز ہو سکے۔ "تاریخ فیروز شاہی" از ضیائے برنی اور "تاریخ فیروز شاہی" از سراج عفیف میں بہت سے الفاظ اور مقولے ملتے ہیں پہلا تو وہ مشہور معروف جملہ ہے جس کی تذکرہ نگاروں نے طرح طرح سے تشریح کی ہے۔

محمد تغلق نے ۷۵۲ھ میں سندھ کے دار الخلافہ ٹھٹہ پر فوج کشی کی اور اس حملہ میں مارا گیا اس سے دس سال پہلے بھی اس نے سندھ پر ایک ناکام حملہ کیا تھا اور اس میں ناکامی کے بعد گجرات کا رخ کیا تو سندھیوں نے جو جملہ کہا تھا، وہ مختلف طریقوں سے پیش کیا گیا ہے، ہاشمی فرید آبادی نے اپنے مضمون "اردو کی حقیقت تاریخ سے" میں اس جملے کو اس طرح لکھا ہے:

"برکت شیخ پٹھا ایک موا ایک نٹھا"

لیکن بعض اور علماء نے اسے مختلف صورت میں پیش کیا ہے۔ شمس سراج عفیف [2] کی تاریخ میں جو کلکتہ سے چھپی ہے "پٹھا" کے بجائے "تھیا" نیز "نٹھا" کی بجائے "نٹھیا" درج ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی [3] اور مولانا سلیمان ندوی اس کو اس طرح پڑھتے ہیں:-

---

[1] "لطائف اشرفی" صفحہ ۴۰۹ نیز ملاحظہ ہو "معاصر" جلد ۴ صفحہ ۸۵۰، اس میں "لیئو پرکھیو آپن ویسوں کہنہ ایسوں کہنہ"

[2] "تاریخ فیروز شاہی" مصنفہ شمس سراج عفیف صفحہ (۲۳۱)

[3] "پنجاب میں اردو" صفحہ (۷۹)

" برکت شیخ تھیا ایک موا ایک نھیا " ؎۱

سید ہاشمی فرید آبادی اس کو جس صورت میں پیش کرتے ہیں اس کے جواز کے طور پر وہ یہ تفصیل دیتے ہیں:

"شیخ حسین المعروف بہ شیخ پٹھا (متوفی ۶۰۶ھ) ٹھٹھہ کے نامی بزرگ تھے۔ آخری لفظ "نھا" کے بجائے " بروزن 'پٹھا' یا 'نٹھا' زیادہ قرین قیاس سمجھتے ہیں۔ "ناٹنا" اور 'انٹھنا' دہلی کے مضافات میں پلٹ جانے یا مکر جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور پنجابی و گجراتی میں بھاگ جانے کے معنی میں آیا ہے۔

زین الدین خلد آبادی
۷۰۱ھ تا ۷۷۱ھ

ان کا نام سید داؤد حسین تھا۔ ۷۰۱ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں حج کیا۔ واپسی میں ہندوستان آئے جس وقت محمد تغلق نے دہلی والوں کو دولت آباد جانے کا حکم دیا۔ مولانا زین الدین بھی کمال الدین سامانہ کے ساتھ دولت آباد آئے۔ یہاں آکر برہان الدین اولیا کے ہاتھ پر ۷۳۶ھ میں بیعت کی۔ یہ اپنے وقت کے بڑے جید عالم تھے۔ ۷۷۱ھ میں خلد آباد ہی میں انتقال ہوا۔ ان سے ایک اردو جملہ منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے وقتِ آخر جب اُن کے مرید نصیر الدین بدھری نے کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے لیے وصیت کرنے کی خواہش کی تو منہ پھیر کر قبلہ روئے اور اردو میں کہا:

"منجہ مت بلا وہ" ؎۳

مخدوم جہانیانِ جہاں گشت
متوفی ۷۸۵ھ

حضرت مخدوم جہانیانِ جہاں گشت "قطبِ عالم" اور شاہِ عالم' اس عہد کے آخری بزرگ ہیں جن کے اردو اقوال دستیاب ہوتے ہیں اور انھیں پر یہ عہد ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت مخدوم، شاہ راجو قتال کے حقیقی بڑے بھائی اور شیخ احمد کبیر کے فرزند تھے۔ یہ بڑے باکمال بزرگ تھے۔ ان کی بزرگی کا اعتراف سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بھی کیا ہے۔ شیخ

؎۱ "نقوش سلیمانی" صفحہ ۴۶۔ ؎۲ "اردو کی حقیقت تاریخ سے" رسالہ اردو جلد ۳۲ نمبر ۱، ۲
؎۳ "روضۃ الاقطاب" مصنفہ رونق علی صفحہ ۲۱۴

شیخ امام الدین سے خرقۂ خلافت لینے کے بعد مصر شام عراق بلخ بخارا اور خراسان کا سفر کیا مکہ میں ان کے ہمراہ امام عبداللہ یافعی تھے جنھوں نے نصیرالدین چراغ دہلی کے متعلق ان سے فرمایا تھا کہ "چراغ دہلی است" ان کے بھائی راجو قتال (والد حضرت خواجہ بندہ نوازؒ) بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں تغلق تاجداروں کے سران کی چوکھٹ پر جھکتے تھے۔ مخدوم جہانیانِ جہاں گشت دو تین مرتبہ دہلی بھی آئے۔ دوسرے بھائی ہمیشہ یادِ الٰہی میں غرق رہتے تھے جب فیروز تغلق خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت نے فرمایا:

"کا کا فیروز چنگا ہے"

بادشاہ نے اسی پرسشِ حال کو موجب افتخار سمجھا۔

پروفیسر سید حسن عسکری نے اپنے مضمون "بہار کے ایک شطاری صوفی" [1] میں امام الدین راجگیری کے قلمی ملفوظ" اوراد امام الدین راجگیری" کے حوالے سے مخدوم جہانیاں کا ایک اور قصہ بھی لکھا ہے۔:

کسی نے مخدوم جہانیانِ جہاں گشت سید جلال الدین سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ وہی اوراد اور اعمال ہیں جو وہ بھی پڑھتا اور کرتا ہے جو خود مخدوم لکھتے اور کرتے ہیں لیکن اس کو اس کا خاطر خواہ جواب نہیں ملتا۔ اس پر مخدوم صاحب نے جواب دیا:

"کھانڈا ہے پھانڈا کہاں"

یعنی "خندق تو موجود ہے اس سے نکلنے کا ذریعہ کہاں ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے سچے عرفان کی کمی ہے۔ پروفیسر حسن عسکری نے لکھا ہے کہ امام الدین راجگیری کے ملفوظ "اوراد امام الدین راجگیری" میں اور بھی بہت سے ہندی جملے ملتے ہیں لیکن مجھے اس ملفوظ کے دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

---

[1] "A 14th century Shuttari Sufi saint of North Bihar"
مطبوعہ جرنل انڈین ہسٹری کانگریس منعقدہ ناگپور ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۵۱

قطبِ عالم
سنہ ۷۹۰ء تا ۸۸۰ھ

سید برہان الدین قطب عالم۔ سید جلال الدین جہاں گشت کے پوتے تھے۔ ان کا تھوڑا سا حال مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تصنیف "اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں لکھا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت مخدوم جہانیاں کے چھوٹے بھائی اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد سید راجو قتال کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحی نے "گلِ رعنا"[1] میں لکھا ہے کہ موصوف بچپن میں اپنے ننھیال بٹوہ (گجرات) چلے آئے تھے۔ وہاں 'قطبِ عالم' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام سراج الدین محمد بن عبداللہ تھا اور 'شاہِ عالم' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ دونوں باپ بیٹے اپنی خاندانی بزرگی و عظمت کے ساتھ خود بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ گجرات کے بادشاہ ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جب وہ بٹوہ میں مقیم تھے۔ ایک رات نمازِ تہجد کے لیے اٹھے۔ صحن میں ایک لکڑی پڑی ہوئی تھی، اس سے ٹھوکر لگی پانوں میں چوٹ آئی اور خون بہنے لگا اس وقت ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلا۔ جسے پروفیسر عبدالغنی نے اپنی تصنیف "پرشین ... ایٹ دی مغل کورٹ" میں "مراۃ اسکندری" کے حوالہ سے اس طرح نقل کیا ہے:

"لوہ ہے یا لکرہے یا پتھر ہے یا کیا ہے"[2]

لیکن "اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں "تحفۃ الکرام" کے حوالے سے یہ جملہ یوں منقول ہے:

"لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے"

سراج اورنگ آبادی کے پیرِ طریقت سید عبدالرحمٰن چشتی کی تصنیف "مرات الاسرار" میں ایک اور واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ سندھ کے حاکم جام جانو نے اپنی دو لڑکیوں میں سے ایک کی نسبت شاہ عالم (فرزند قطبِ عالم) سے اور دوسری کی محمد شاہ، بادشاہ گجرات سے کی تھی۔ جس لڑکی کی نسبت شاہِ عالم سے ہوئی تھی۔ وہ حسن و جمال میں اپنی بہن سے

---

[1] تذکرہ "گلِ رعنا" صفحہ ۱۴۱
[2] "پرشین ... ایٹ دی مغل کورٹ" صفحہ (۸)

بہتر تھی۔ محمد شاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے حاکم سندھ پر دباؤ ڈال کر نسبت بدلوا دی۔ شاہِ عالم کو یہ سن کر ملال ہوا۔ انھوں نے باپ سے اس کی شکایت کی۔ اس وقت قطب عالم کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا:

"بیٹے تسا نصیب دھون ویجہ"[1]

اس واقعہ کو مولانا عبدالحی نے "گلِ رعنا" میں بھی (دونوں) نقل کیا ہے۔[2]

شاہ عالم
سنہ وفات ۸۸۰ھ

یہ قطبِ عالم کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ نام سراج الدین تھا لیکن شاہِ عالم کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کو یہ خطاب شاہ بارک اللہ چشتی نے دیا تھا۔ جو حضرت نظام الدین اولیا کے مرید و خلیفہ تھے۔ ایک بار انھوں نے بے اختیاری میں ان کو "شاہِ عالم" سے مخاطب کیا۔ اسی وقت سے ان کا یہ خطاب مشہور ہو گیا۔ شاہ عالم نے جب یہ واقعہ اپنے والد قطب عالم سے بیان کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا:

چشتیوں نے پکائی اور اسے بخاریوں نے کھائی"

ان کے ملفوظہ "جمعات شاہی" میں ایک اور واقعہ مذکور ہے[3] کہتے ہیں:
ایک روز شاہِ عالم کہیں جا رہے تھے۔ ان کے صاحبزادے مخدوم شاہ (احمد) بھی ہمرکاب تھے سلطان شاہ بادشاہِ گجرات کا بھی اسی وقت اس طرف سے گزر ہوا۔ اس نے سلام نہیں کیا آپ کے صاحبزادے نے شاہِ عالم کو اس کے غرور کی طرف توجہ دلائی تو ہندی میں جواب دیا۔

"ارجن جی کارونہ بہایا موئے تو تجھ سے فقیروں کی برسوں تین کناسی کرے"

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں "اردو" عام طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔

حضرت شاہِ عالم کے بعد بھی کئی علما اور بزرگانِ دین جیسے سید محمد جونپوری۔

---

[1] "مراۃ الاسرار" کتب خانہ روضتین۔ گلبرگہ [2] "گلِ رعنا" صفحہ ۱۴
[3] تحفۃ الکرام صفحہ ۱۴۱، "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۲۰)

بہاؤالدین باجن، حضرت ہاشم حسینی، شاہ علی جیو گام وہی ذہنی۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ شاہ محمد غوث گوالیاری، وجیہہ الدین احمد علوی وغیرہ کے مقولے اور ملفوظات بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ بزرگ آٹھویں اور نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔

مذکورہ بالا بزرگوں میں سے کئی ایسے ہیں جن کی تصانیف اُردو نظم و نثر کی شکل میں بھی ملتی ہیں۔ کیونکہ ان بزرگوں کو "زبانِ ہند" سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا ثبوت پندرھویں صدی عیسوی کی ایک تصنیف "مناقب محمدی"، سے ملتا ہے۔ اس کے مرتب علی شیر شیرازی، حضرت سید محمد اجہری کے خاص مرید تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے ہندی زبان کی خصوصیت کے متعلق گفتگو کی، جس کا اقتباس درج ذیل ہے :

" عرض داشتیم یا سیدنا تا در لغات ہند از ہر زبان ہا حروف بیشتر است چنانچہ کسے غیر از مردان ایں اقلیم نہ تواند ہمہ حروف ایں دربار ادا نمود مثل ایمان کہ بہ سخت ترین زبان گویا نند ...... فرمود چوں آدم را خدا از بہشت در سراندیل افگند واو بہ ہر زبان ہا واقف بود فرزندان ابوالبشر بعضے یک لغت اخذ کرد و بعضے دو چہار لغت تا نوح۔ او نیز از ہمہ زبان ہا تکلم کردی۔ واز قبیل ہا برخاست و ہر یکے زبانے آموختہ بہ ملکے استقامت کرد۔ آن زبان منسوب بہ آن ملک شد۔ ہر گاہیکہ از ہند ہمہ لغت بیرون گشتہ۔ رومی و فارسی زبان ہا وغیرہ ہمانا نام زد شدند۔ زین موجب ہندیان می توانند، ہر زبان بیاموزند مانند صاحب زبان آن و دیگران را گو بہ ہندی رغبت افتد چنانکہ نگوید کہ زادہ ہند گوید " [1]

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون نوشتہ پروفیسر حسن عسکری۔ "شمالی ہند کے صوفیائے کرام کی ہندی دوستی" مطبوعہ معاصر صفحہ (۷۹)

اس گہری دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے "لغاتِ ہندی" میں اپنے وہ یادگار کارنامے چھوڑے۔ جن کا ذکر آنے والے ابواب میں اپنے موقع سے آرہا ہے ⁂
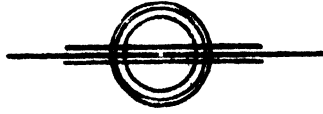
۳

مربوط نثر کی شروعات

زبان کے ارتقا میں تاریخی جبریت اُردو نثر کی ابتدا کے متعلق مختلف آرا، آزاد کی رائے۔ محمد یحییٰ تنہا کی رائے (فضلی کی کربل کتھا)۔ ڈاکٹر عبدالحق اور احسن مارہروی کے نظریئے (بندہ نواز کی معراج العاشقین) حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور کی رائے (گنج العلم کے رسالے)۔ حامد حسن قادری کی تحقیق رسالہ تصوف مصنفہ اشرف جہانگیر سمنانی۔ اُردو نثر کا آغاز جدید مواد کی روشنی میں "رسالہ جنونیہ" "جنونیہ" اور "ہفت اسرار"۔ رسالہ تصوف مصنفہ راجو قتال۔ راجو قتال اول در راجو قتال ثانی۔ راجو قتال اول کی دیگر تصنیفات "سہاگن نامہ" اور دیوان۔ راجو قتال کی تصنیف کے متعلق مزید شہادتیں ۔

۳

مربوط نثر کی شروعات

چھٹی صدی ہجری کے آغاز سے لیکر ساتویں صدی ہجری تک کے جو ملفوظات یا اقوال پیش کیے گیے ہیں ان کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اُردو عوام کی بول چال کی زبان ہونے کی حیثیت سے فارسی کے مستند مصنفین اور خاص طور پر اہلِ ارشاد وہدایت پر اپنا اثر ڈالنے لگی تھی۔ یہ زمانہ دہلی میں مملوک بادشاہوں کے سلسلے کے اختتام اور خلجی خاندان کے ہندوستان میں تسلط کا زمانہ تھا۔

خلجیوں نے سنہ ۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۰ء (سنہ ۶۹۰ھ تا ۷۲۰ھ) تک حکومت کی۔ اس اثنا میں نہ صرف حدودِ سلطنت میں وسعت پیدا کی بلکہ اس تہذیبی اور لسانی سرمایہ میں انھوں نے اپنے پیش رو حکمرانوں سے حاصل کیا تھا، اضافہ کیا اور اس کو سارے ہندوستان میں پھیلایا۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں دکن بھی پہلی مرتبہ دہلی کے تسلط میں آیا۔ ان حکمرانوں نے اس زبان کو جسے انھوں نے اپنی زبان چھوڑ کر اختیار کیا تھا۔ ہندوستان میں تبادلۂ خیال کے لیے اتحاد کی ضرورت سے سارے ملک میں ایک زبان کی حیثیت سے پھیلایا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی لسانی شواہد کی بنا پر لکھتے ہیں :-

> " مسلمان حکمرانوں کے پے در پے سلسلوں اور دہلی کے عہدہ داروں اور دیگر لوگوں کے ذریعے اس زبان کو صوبوں میں مشرق، مغرب، شمال و جنوب ہر ایک سہولت بخش مشترک زبان کے طور پر پھیلنے میں مدد ملی۔" [1]

۱۔ دی آریجن اینڈ ڈولپ منٹ آف دی بنگالی لینگویج مقدمہ صفحہ ۱۲

اپنی دوسری تصنیف " انڈو ایرین اور ہندی " میں بھی انھوں نے اسی خیال کا اعادہ کیا ہے جو حسب ذیل ہے :

" یہ دکن تھا جس نے شمالی ہند کے لیے ادب کا نمونہ چھوڑا اور برج بھاشا (جو علاقہ واری) زبان تھی، کے برعکس خاص ہندی اور ہندوستانی کی ترویج کی " ۲ ؎

اصل میں شمالی ہندوستان سے مسلمان آکر جوق در جوق دکن کے تلنگی، مرہٹی اور کنڑی بولنے والے علاقوں میں اپنے قدم جما رہے تھے اور انھیں اس مقصد کے لیے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو سب کی سمجھ میں آسکے۔ اس طرح یہ ہند آریائی بولی ۱۲۹۴ء کے قریب ڈراوڑ دیس میں بھی پہنچ گئی۔

محمد تغلق ۱۳۲۵ء ۔ ۱۳۵۱ء (۷۲۵ھ ۔ ۷۵۲ھ) نے جب ۱۳۲۸ء (۷۲۷ھ) میں دھلی کے بجائے دیوگرھی کو اپنا پایہ تخت بنایا تو دھلی کی حکومت کی ساری کل اپنے تہذیبی اور لسانی سرمایے کے ساتھ دکن میں منتقل ہوگئی۔ دھلی کے نظم و نسق کے اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ جتنے متوسط اور ادنیٰ طبقے کے لوگ دکن آئے وہ اسی زبان کے ابتدائی ہیولیٰ کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کے علاوہ دکن کے دھلی کا جز بن جانے کے بعد شمال سے عام لوگوں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں کی آمد و رفت کا سلسلہ بہمنی سلطنت کے قیام ۱۳۴۷ء ۔ (۷۴۷ھ) تک جاری رہا جس کی وجہ سے دکن کا اس ہند آریائی بولی کے ساتھ ربط اور بھی استوار ہوتا گیا۔

مسلمانوں کے تعلقات اہل ہند سے جیسے جیسے وسیع ہوتے گیے انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اس ملک کے بسنے والوں کے خیالات سے واقف ہوں اور جو نیا فکری اور اعتقادی سرمایہ وہ خود اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس سے اہل ملک کو واقف کرائیں اس مقصد کے لیے انھیں سوائے اس زبان کو اختیار کرنے کے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ مولوی عبدالحق اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں :

" اردو کی ابتدائی تصنیفات کا محرک اسلام کے عقاید اور تصوف کے مسائل

کو ہندوستان کے عوام اور خاص طور پر نومسلموں کو سمجھانے کی ضرورت اور خواہش تھی "[1]

اس لیے اس دور کی تحریروں پر مذہبی عنصر غالب دکھائی دیتا ہے نومسلموں اور خاص طور پر عورتوں کی مذہبی تعلیم ان کا ایک مقدس فریضہ بھی تھا۔ ان کے لیے عربی، فارسی کا استعمال ممکن نہ تھا۔ اس لیے ان بزرگوں کو یہ مخلوط زبان اختیار کرنی پڑی۔ اس طرح یہ بولی بولی خاص ارادہ اور شعور کے بغیر ایک سماجی ادارہ کی حیثیت سے تاریخی جبریت (Historical - Determinism) کے اصول کے تحت نشوونما پاتی اور پھیلتی گئی۔ اس عوامی بولی کو عوام کی خدمت، ان کی ذہنی تربیت اور ان کے قریب تر آنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ یہی بڑے اور فطری محرکات تھے۔ جنھوں نے اُردو نثر کی داغ بیل ڈالی۔

چنانچہ اُردو مربوط نثر کے ابتدائی آثار ہم کو ایسے بزرگوں ہی کی تحریروں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ جو اپنے زمانے میں ارشاد و ہدایت کا کام کرتے تھے۔

اُردو نثر کی ابتدا کے متعلق مختلف رائیں

اُردو تذکرہ نگاروں میں سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "آب حیات" میں جہاں اُردو نظم کا سہرا ولی دکھنی کے سر باندھا ہے۔ نثر کے اولین رسالے کے مصنف کی حیثیت سے وہ فضلی کو پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

" محمد شاہ کے عہد ۱۱۴۵ھ میں ایک بزرگ تھے جن کا تخلص فضلی تھا انھوں نے " دہ مجلس " کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ غالباً یہی اُردو کی پہلی تصنیف ہوگی "[4]

محمد حسین آزاد کے بعد محمد یحییٰ تنہا مصنف "سیر المصنفین"[2] اور عبدالحیٰ مصنف "گل رعنا"[3] نے بھی فضلی کی "کربل کتھا" ہی کو اُردو نثر کا پہلا کارنامہ بتایا ہے لیکن آزاد کی دوسری تحقیقات کی طرح اُردو نثر کے بارے میں اس نظریہ کو بعد کے محققین نے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

---

[1] "اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۱۶) [2] "سیر المصنفین" صفحہ (۲۴) [3] "گل رعنا" صفحہ ۲۴۴
[4] "آب حیات" مقدمہ صفحہ ( )

چنانچہ خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" کی دریافت کے بعد مولوی عبدالحق نے اس کو مرتب کرتے ہوئے جو مقدمہ اس پر تحریر فرمایا ہے اس میں وہ اس رسالے کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیتے ہیں :

"ابھی تک جتنی کتابیں ملی ہیں ان میں معراج العاشقین سب میں قدیم ہے اس لیے اردو کی پہلی تصنیف سمجھی جاسکتی ہے "[1]

بعد میں پروفیسر احسن مارہروی نے "منشورات[2]" (تاریخ نثر اردو) میں مولوی عبدالحق کی تحقیق پر اکتفا کرتے ہوئے ان کی ہمنوائی کی ہے۔ اردو کے ایک اور محقق حکیم شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم"[3] میں شیخ عین الدین گنج العلم، متوفی ۷۹۵ھ کے رسالوں کو اردو نثر کا سب سے پہلا کارنامہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے بھی "اردو شہ پارے"[4] حصہ اول میں حکیم شمس اللہ قادری کی رائے سے اتفاق کیا ہے لیکن پروفیسر حامد حسین قادری نے "تاریخ داستان اردو" میں حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ تصوف کو جو (۸۰۸ھ) کی تصنیف ہے۔ اردو نثر کا پہلا کارنامہ قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں :

"خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے جن کا مزار کچھوچھا شریف علاقہ اودھ میں ہے۔ اردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر ۸۰۸ھ (۱۳۰۸ء) میں تصنیف کیا۔ نثر اردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے"[3]

جدید مواد

لیکن مرتب اپنی تحقیق کے سلسلے میں ایک مختصر سا رسالہ دستیاب ہوا ہے۔ جو بیجاپور کے سرکاری عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ اردو منظوم رسالے "پندنامہ" اور "چکی نامہ" بھی منسلک ہیں۔

اس رسالہ میں اردو مقولوں کی تشریح فارسی میں کی گئی ہے۔ یہ رسالہ "جنو تیر" کے نام سے موسوم ہے چنانچہ آغاز کی عبارت کا وہ حصہ جس میں اس کے نام کی طرف اشارہ کیا گیا، حسب ذیل ہے :

---

[1] مقدمہ "معراج العاشقین" صفحہ ۱۰ [2] "منشورات" صفحہ ۲۳ [3] اردوئے قدیم
[4] "اردو شہ پارے" صفحہ ۱۹

"الحمد لله رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوٰة علیٰ رسوله محمداً و آله اجمعین بعد ایں را می گوید حرص و ہوس گرفتار شوی محمد و خان روزی این فقیر نشسته بود یار موافق و محب صادق میر سید حسن محمد این کلام ہندی خواندند و تکلیف کردند که معنی این کلام ہندی بگه بند بنا بر ضرور ہرچه خاطر این خام آمد نجامه بند کرده "جنونیه" نام نهاده"

کیٹلاگ میں بھی اس رسالے کا نام "جنونیہ" ہی درج کیا گیا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے :

M.7. "A Manuscript written in 795 A.H. in a script mixed "Nask" And "Talik" style Comprising three works viz. 'Jonuniya' Chakinama and "pand nama."

اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۷۹۵ھ کا مکتوبہ ہے لیکن یہ سنہ متن رسالہ میں کہیں لکھا ہوا نہیں ملا، پتہ نہیں مرتب فہرست نے اس سنہ کو کہاں سے اخذ کیا۔ البتہ رسالہ کے ترقیمہ میں اور ایک مقام پر کاتب نے سنہ ۵ھ درج کیا ہے ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے :.

"چوں از خانہ بیرون می آئی سہ بار آیت الکرسی بخوانی با ہر کاریکہ روی ساز واز او نیک شود و در چشم سرمہ بکن و در ہفتہ موی سر موی بغل بگیر و موی بینی پاک بکن یا علی۔ انار بخور دا ستخوان ہر بار مشکن و ترش مخور کہ شہوت تو کم گردد یا علی! انگشت ناخون مخور کہ شیطان می خورد۔ دوازدہ ماہ و پانزدہم ماہ حجامت مکن کہ علت شود و تمت تمام شد کاتب نظام شد سنہ ۵ھ"

اگر ترقیمہ کے سنہ پر اعتبار کر لیا جائے تو یہ رسالہ ۵ھ کے پہلے کا لکھا ہوا ثابت ہوگا اس کا مطلب یہ کہ اس رسالہ کی تصنیف غزنوی دور سے متعلق ہو جاتی ہے مسعود سعد سلمان (۴۵۲ھ ۔ ۴۹۲ھ) کے دیوان کے تذکرے اور خواجہ معین الدین چشتی کے بارے میں اس زبان میں تکلم کرنے کے شواہد کے علاوہ اس دور کے دوسرے تحریری مواد کی موجودگی ہیں جو پہلے باب میں پیش کیا جا چکا

ہے۔ سنہ ۵ھ میں ایسے ملفوظ کا ضبطِ تحریر میں آنا ناممکن نہیں معلوم ہوتا اور اس سنہ ۵ھ کو تسلیم کر لینے پر اس کا مصنف مسعود سعد سلمان کا معاصر قرار پاتا ہے۔

لیکن چند اندرونی شواہد کی بنا پر مجھے اس سنہ کے معتبر ماننے میں تامل ہے۔

یہ شواہد حسب ذیل ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ اس میں ایک مقام پر خواجہ حافظ کا ایک مصرعہ نقل کیا گیا ہے اس سے متعلق عبارت حسب ذیل ہے۔

"نزدیکِ عارفان ہر سخن کہ از عوام الناس ظاہر می شود خواہ نیک باشد خواہ بد ایشان ہمہ راست می شوند حضرتِ حافظ دریں محل می فرماید"

"ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق"

حافظ کا زمانہ ظاہر ہے کہ سنہ ۵ھ سے پہلے کا نہیں۔ حافظ سنہ ۷۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۷۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس سے صریح نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ رسالہ آٹھویں صدی ہجری کے اواخر سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔

(۲) اسی رسالے میں ایک اور مقام پر حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ عبارت حسب ذیل ہے۔

"حضرت مخدوم شرف الدین منیری در مکتوب خود فرمودہ ....."

مخدوم کا سنہ ولادت سنہ ۶۶۱ھ اور سنہ وفات سنہ ۷۸۲ھ ہے۔ اس لحاظ سے اس رسالے کی تصنیف کا جو قدیم ترین سنہ مقرر کیا جا سکتا ہے وہ سنہ ۷۸۲ھ کے بعد کا ہوگا۔

رسالے کی زبان، اس کے اسلوب جملوں کی وضع اور بندش سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیف ہے۔ اس رسالہ کا موضوع بھی اردو کے ابتدائی نثری رسالوں کی طرح جواب تک دستیاب ہوئے ہیں اخلاق اور تصوف کے نکات و رموز پر مشتمل ہے۔

"جنونیہ" ایک مختصر سا رسالہ ہے اس لیے ذیل میں مکمل درج کیا جاتا ہے۔ زبان کو سمجھنے میں فارسی کی تشریحی عبارتوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

رسالہ جنونیہ

قولہ (۱) "بات کی بات کرافات کرافاتست" یعنے جائے سخن سخن است وجائے خرافات کرافاتست۔ معنیش چناں باشد یعنی نزدیک عارفان ہر سخن کہ از عوام الناس ظاہر می شود خواہ نیک باشد خواہ بد ایشان ہمہ راست می شوند حضرت حافظ درایں محل می فرماید:

"ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق"

قولہ (۲) "وہاں بسائی تین کا نوں دو اجڑے ایک بستا نہیں"

معنی ظاہر آن است آن جا آباد کردند سہ دیہہ دو ویران بودند و یکی آبادانی نداشت۔ مراد مصنف آن باشد از سہ دیہہ شاید کہ یکی دنیا باشد، دوم بہشت سوم دوزخ۔ یعنی ہر دو ویرانند۔ زیرا کہ جای کہ "آدمیان" نمی باشد و یکی آبادانی۔ (نداشت یعنے ایں عالم دنیا ہر کہ می آید گذشتہ می رود۔ پس ہیچ روش آبادانی شود۔ و مصنف بہ ایں معنی کہ گفتہ باشد کہ یکی آبادانی نداشت چنانچہ شیخ سعدی قدس سرہٗ

می فرمایند ؎

رفت منزل بہ دیگرے پرداخت ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت
ایں عمارت بسر نبرد کسے واں دگر پخت ہمچناں ہوسے

قولہ (۳) "وہاں بسائی تین کمہار۔ دو لولی ایک کون ہات نہیں"

معنی ظاہر آن است کہ آنجا آباد کردند سہ کلال دو از دست لنج بودند و یکی دست نداشت مراد از سہ کلال آبادان کردن آنست یعنے سہ کس را بہ ظہور آوردند

سوم طالب مولی دوم طالب عقبیٰ یکی طالب دنیا

دو واز دست لنج بودند یعنے طالب دنیا و طالب عقبیٰ از آن جہت کہ دست در طلب

(قوسین کی عبارت سالار جنگ کے نسخہ سے ماخوذ ہے۔

مولی دراز نہ کردند۔

قولہ(۴) " اٹھویں گھڑی تین ہانڈی دو پھوٹی ایک کوں تلا ہے نین "

معنی ظاہر این است کہ این ہا سہ آوند ساختند۔ از آن دو شکستہ بودند ویکی تہہ نہ داشت معنی اش ہم چوں معلوم می شود۔

قولہ(۵) " دو کچی ایک پکتا نہیں "

معنی ظاہر آن است کہ دو خام ماندند ویکی پختہ نمی شود۔ ومعنیش آن باشد یعنے طالبِ دنیا و طالبِ عقبیٰ۔ ایک دو خام خیال بودند کہ ما عبادت کردیم چوں

قولہ(۶) " ان پر بلائی تین مہمان "

معنی ظاہر آن است کہ بر بلای آن سہ برنج سہ مہمان طلب کردند معنیش آن باشد یعنے برائے این کار سہ کس را طلب کردند یکی علم، دوم عقل، سوم عشق۔

قولہ(۷) " دو اوتھی ایک آوتا نہیں "

معنی ظاہر آن است کہ دو رنجیدہ شدند ویکی نمی آید یعنے علم و عقل ہر دو دیدند کہ این کار از دست نہ خواہد شد۔ عاجز شدہ ماندند۔ حضرت مخدوم شرف الدین منیری در مکتوب خود فرمودہ عشق آمدن نہ بود نہ آموختن عشق۔ عشق را خانہ این است بر نرحا دین ورش بستہ نے کسی را بابیکی نمی آید با این معنی۔

قولہ(۸) " ان پر کون فرمائی تین میکین "

بر ایشان سہ خشت انداختند۔ معنی اش آن باشد کہ بریں سہ کس نظر کردند آیا از دست ایشان این کار خواہد بر آمد۔

قولہ(۹) " دو چوکیں ایک لاگتی نہیں "

معنی ظاہر آن است کہ دو خطا شدند ویکی نمی رسد۔ معنی اش آن باشد کہ دیدند کہ از علم و عقل این کار شدنی نیست از آن قطع نظر کردند ویکی نمی رسد۔ معنی عشق کہ ہیچ حیلہ است او نمی رسد ہمیشہ طالبان از عشق حاصل و عشق بہ فضل او حاصل می کرد "۔

جیسا کہ رسالے سے ظاہر ہے، اُردو کے نو مقولوں کی تشریح فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ اس رسالہ کے مصنف اور وجہ تصنیف کا پتہ رسالے کی ذیل کی عبارت سے چلتا ہے۔

"الحمد اللہ رب العالمین و لعافیۃ للمتقین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمداً و آلہ اجمعین۔

بعد از میگوید حرص و حوا گرفتار شوی محمود خان روزی ایں فقیر نشستہ بود یار موافق و محب صادق میر سید حسن محمد ایں کلام ہندی خوانند و تکیکف (تکلیف) کروند کہ معنی ایں کلام ہندی بگوئند"۔

رسالہ کے آخر میں یہ اشعار ہیں۔:

کہ احمد کی ناؤنکی صورت پو ساز ‏ سو پیدا کیا ہے خُدا نے نماز

قیام اس میں جیون "الف" ہے پیدا ‏ رکوع اس میں جیون "ح" رھیا ہی نیکا

جو سجدہ سو او "میم" کے ہے مثال ‏ یو قعدہ سناؤں کہ آخر کا "دال"

دو جا میم سو پیٹ کے ہے مثال ‏ دو پا دال بھی بنانے آخر کا دال

محمد کی نادن کی صورت او پر ‏ بھی پیدا کیا ہے خدا سب بشر

اس رسالے کے علاوہ اسی کے ساتھ منسلک دو اور رسالے ہیں جن میں سے ایک کا نام "چکی نامہ" اور دوسرے کا نام "پن نامہ" ہے۔ نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"خوش حال سکیا نکی قبیلی میں تا نہ ‏ ٭ ‏ چلو سب سھلیاں میزوانی کنا نہ

ساتو سھلیاں ملکر نانی کے گھر آیاں ‏ ٭ ‏ کنوارا سیانی حکمت کی لایاں

ہفت اسرار بعض محققین نے خواجہ بندہ نواز کی تصانیف میں ایک رسالے "ہفت اسرار" کا ذکر کیا ہے۔ اس کی زبان کے بارے میں علما میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا بیان ہے کہ یہ رسالہ فارسی زبان میں لکھا گیا تھا لیکن حکیم شمس اللہ قادری نے اسے اُردو کا رسالہ بتایا ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں۔:

"خواجہ بندہ نواز نے دکنی زبان میں سات مقولے ارشاد فرمائے تھے ان کے ایک مرید نے اس کی مبسوط شرح لکھی اور اس کا نام ہفت اسرار رکھا"۔ [۱]

ڈاکٹر زور کا بیان ہے :

"یہ مشہور ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے کسی مرید نے آپ کے سات اقوال کی ایک طویل تفسیر اُردو میں لکھی ہے ۔ یہ ہفت اسرار کے نام سے موسوم ہے اور غالباً اس وقت بالکل ناپید ہے"۔ [۲]

ڈاکٹر زور کے بیان سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ "ہفت اسرار" اب ناپید ہے ۔ اس کے علاوہ حکیم شمس اللہ قادری کی اور ڈاکٹر زور دونوں کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقولوں کی شرح فارسی میں طویل کی گئی تھی۔ بظاہر جنونیہ پر یہ تعریف صادق نہیں آتی کیونکہ یہ ایک مختصر رسالہ ہے ۔ نیز محمود خان نے، جن کی فارسی عبارت اوپر نقل کی گئی ہے حضرت خواجہ بندہ نواز کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے ۔ اس کے علاوہ رسالہ "جنونیہ" کی زبان مقولات اور ملفوظات کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے ۔ خواجہ بندہ نواز کے رسالے کافی نشوونما پائی ہوئی نثر کا نمونہ ہیں، اس لیے یہ شبہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ چونکہ "رسالہ جنونیہ" میں بھی مقولے ہیں اس لیے یہ خواجہ بندہ نواز کا ناپید رسالہ "ہفت اسرار" ہے ۔

ان شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "جنونیہ" مربوط نثر کا اولین نمونہ ہے اور ۷۹۵ھ کے قریبی زمانے کی تصنیف ہے ۔ "ہفت اسرار" کے تذکرے سے ایک بات ضرور متعین ہو جاتی ہے وہ یہ کہ اُردو کی نشوونما کے اس دور میں ایسے رسالے عام طور پر لکھے جاتے تھے ۔ جن میں اُردو مقولوں کی تشریح فارسی میں کی جاتی تھی ۔ یہ رسالے ابتداً ہندوستانی عوام کے لیے لکھے جاتے ہوں گے ۔ بعد میں فارسی داں لوگوں کو سمجھانے کے لیے ان کی فارسی میں تشریح کر دی جاتی ہو گی ۔

اس طرح یہ رسالہ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۹ھ) کے رسالوں اور رسالہ اشرف جہانگیر سمنانی (متوفی ۸۰۸ھ) نیز دوسرے تمام رسالوں کے مقابلے میں جن کا اب تک علم ہوا ہے، قدیم تر

---

[۱] "اُردوئے قدیم" صفحہ (۱۸) ؛ [۲] "اُردو شہ پارے" صفحہ (۲۱)

ثابت ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ رسالے کے مصنف کے بارے میں مرتب کو باوجود تلاش کے کچھ مواد دستیاب نہ ہو سکا۔

رسالہ اشرف جہانگیر سمنانی "جنونیہ" کے بعد دوسری قدیم تصنیف سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ تصوف ہے جو ۷۵۸ھ کی تصنیف بتائی گئی ہے[۱] اور جسے پروفیسر حامد حسن قادری نے اُردو نثر کی پہلی تصنیف کی حیثیت عطا کی ہے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مقولات پچھلے باب میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ تصوف کے اس رسالے کے بارے میں قادری صاحب رقمطراز ہیں۔ :

"اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیف نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اُردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہانگیر کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا۔ اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔" [۲]

لیکن پروفیسر صاحب نے اپنی "داستان تاریخ اُردو" میں اس رسالے کے محض تذکرہ پر اکتفا کیا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ یہ رسالہ انہیں کہاں سے دستیاب ہوا؟ اس لیے میں پروفیسر صاحب سے اس رسالے سے متعلق تفصیلات معلوم کرنی چاہی تھی جس کے جواب میں موصوف نے تحریر فرمایا :

"سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ نثر میرے پاس نہیں ہے۔ نہ میں نے دیکھا۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی کے ایک مضمون سے میں نے اس کا تذکرہ کر دیا تھا"۔

پروفیسر قادری کے اس خط کے ملنے کے بعد میں نے جناب نذر علی صاحب دردؔ کاکوروی سے اس رسالے سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی موصوف نے جو جواب عنایت کیا اس کے متعلقہ حصے ذیل میں درج ہیں :

---

[۱] تاریخ داستان اُردو صفحہ (۱۹) [۲] "داستان تاریخ اُردو" صفحہ (۲۰)

"جناب حامد حسن قادری نے جس رسالے کی نشان دہی کی ہے، وہ میرے پاس نہیں ہے نہ میں نے صاحب موصوف کو دیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پرچہ 'یادگار لاہور' میں "اُردو اور شمالی ہند" کے عنوان سے میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں میں نے اس کا تذکرہ کیا ہے، یہاں اورنگ آباد میں حضرت شاہ قادر اولیا کی درگاہ میں، محبوب علی شاہ نامی ایک خادم تھے (عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو گیا)۔ ان کے پاس سیّد اشرف جہانگیر والی کتاب کو میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ قلمی کتاب تھی اس کتاب کے صفحہ (۱۸) کا ٹکڑا یہ ہے :-

"اے طالب آسمان زمین سب خدا بس ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بہتیر سب ذات ہی ذات ہے "۔

چونکہ مرتب مقالہ کی دسترس میں یہ رسالہ نہیں ہے اور اس کا بھی پتہ نہیں کہ یہ رسالہ اب موجود بھی ہے یا نہیں۔ اس لیے اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے تاہم جناب نذر علی صاحب دَرد کاکوروی کی عنایت سے جو نمونہ دستیاب ہوا ہے وہ اتنا مختصر ہے کہ اس سے رسالے کی زبان اور موضوع کے بارے میں کسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور اگر کچھ مترشح ہوتا ہے تو یہ کہ اس کی زبان سید اشرف جہانگیر کے ملفوظات کی زبان سے بہت مختلف اور شاید "معراج العاشقین" کے بعد کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ سوائے اس کے کہ جملوں کی ساخت میں فرق ہے کوئی اور بات ایسی نہیں دکھائی دیتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے آغاز کی تصنیف ہے۔
میں نے اس رسالے کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب سے رہنمائی چاہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کو اس رسالے کے اصلی ہونے کے بارے میں شبہ ہے۔ چنانچہ میرے استفسار کے جواب میں موصوف نے جو خط مجھے تحریر فرمایا تھا اس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے

" جس رسالے کا ذکر حامد حسن قادری صاحب نے کیا ہے وہ بہت مشتبہ ہے اور وہ پائے ثبوت کو نہیں پہنچا۔ "

شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے

حکیم شمس اللہ قادری نے حضرت عین الدین گنج العلم کے چند نثری رسالوں کا ذکر اپنی تصنیف "اردوے قدیم" میں کیا ہے۔ جو ان کے بیان کی رو سے ۷۲۵ھ کی تصنیف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"آپ نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے دکھنی زبان میں تصنیف کیے تھے۔ منجملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعہ میں کالج قلعہ سینٹ جارج کے کتب خانے میں موجود تھے۔ ان کے اوراق کی مجموعی تعداد چالیس تھی۔ اور ان میں فرائض وسنن کے متعلق مختلف احکام ومسائل تحریر تھے۔" [۱]

حکیم صاحب مرحوم نے ایک ملاقات میں مجھ سے یہ بھی بیان کیا تھا کہ یہ رسالے انھوں نے دیکھے تھے لیکن اردوے قدیم کے کسی ایڈیشن میں ان کے اقتباسات شامل نہیں کیے گیے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے بھی شیخ عین الدین گنج العلم کے ان رسالوں کا تذکرہ "اردو شہ پارے" جلد اول میں کیا ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"ان کی نسبت مشہور ہے کہ دکھنی میں چند چھوٹے چھوٹے رسالے تالیف کیے تھے ان میں سے تین کے مخطوطے کہتے ہیں کہ فورٹ سینٹ جارج کالج مدارس کے کتب خانہ میں محفوظ تھے ان رسائل کی ضخامت صرف (۴۰) صفحات بتائی جاتی ہے وہ مذہبی موضوع پر لکھے گیے۔ یہ اطلاعات حکیم شمس اللہ صاحب پر مبنی ہیں۔" [۲]

حالاتِ زندگی شیخ عین الدین گنج العلم
۷۰۶ھ لغایۃ ۷۹۹ھ

شیخ عین الدین گنج العلم علاء الدین خلجی کے زمانہ حکومت میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ان کا سنہ ولادت ۷۰۶ھ ہے۔ ان دنوں گجرات ارباب فضل وکمال کا مرکز ومرجع تھا۔ حدیث وفقہ کی بہت سی کتابیں گجرات میں لکھی گئیں جن کی تفصیل اس طرح لکھی گئی ہے۔

---

[۱] "اردوے قدیم" صفحہ (۲۱)
[۲] "اردو شہ پارے" صفحہ (۱۹)

شیخ شہاب الدین نے "نور المسافر" اور "بستان المحدثین" سلاطین گجرات کے نام پر لکھیں امام بدر الدین نے صحیح بخاری کی تعلیقات لکھیں۔

شیخ علاؤ الدین نے اسی زمانے میں "تبصیر الرحمن" ضخیم تفسیر لکھی۔ اس کے علاوہ شیخ الاکبر کی "فصوص" اور شہاب الدین سہروردی کی "عوارف" کی شرحیں لکھیں۔ شیخ عین الدین نے بھی گجرات کا سفر اختیار کیا اور علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ وہاں سے فارغ ہوکر وہ دیوگڑھ (دکن) گئے جس کو محمد تغلق نے دولت آباد کا نام دیکر دہلی کی بجائے پائے تخت بنادیا تھا۔ جو علماء وفضلا یہاں جمع ہوگیے تھے۔ ان میں سے بعض جیسے سید خوندمیر علاؤ الدین۔ بہاؤ الدین ذکریا شمس الدین صلا مغانی شیخ منہاج الدین وغیرہ کا تذکرہ فرشتہ نے کیا ہے۔ عین الدین خوندمیر کے مرید ہوگیے اس کے بعد ۷۳۰ھ میں عین آباد ساگر تشریف لائے۔ یہاں سے بیجاپور چلے گیے۔ بیجاپور سلطان علاؤ الدین حسن گنگوے بہمنی کی سلطنت کا جزء تھا۔ شیخ نے حسن گنگوے بہمنی اور اس کے چار جانشینوں کا زمانہ دیکھا۔ آخر (۸۹) سال کی عمر میں ۷۹۹ھ میں وفات پائی۔ "روضۃ الاولیا" اور "خزینۃ الاصفیا" میں ان کی عمر (۱۳۲) سال بتائی گئی ہے۔ ساتھ ہی "روضۃ الاولیا" میں مذکور ہے کہ آپ سید الاقطاب رئیس العشاق، خواجہ محمد گیسو دراز کے استاد تھے۔

تصانیف

شیخ نے بہت سی کتابیں لکھیں ان کی تصانیف کی جملہ تعداد (۱۳۲) بتائی جاتی ہے [۱]۔ فارسی میں ان کی مندرجہ ذیل دو کتابیں مشہور ہیں:

(۱) قاضی منہاج الدین جوزجانی کی "طبقات ناصری" کا تکملہ جسے مشہور مورخ ابوالقاسم فرشتہ نے دیکھا تھا اور اپنی تاریخ کی تدوین میں اس سے استفادہ بھی کیا تھا۔ شیخ نے اس کتاب کا نام "ملحقات طبقات ناصری" رکھا تھا۔

(۲) "اطوار الابرار" ان کی ایک اور مشہور تصنیف ہے جن میں اکابر اولیا کے حالات لکھے ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری نے ان کے اُردو رسالوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کی تعداد نہیں بتائی صرف یہ لکھا ہے کہ ان رسالوں میں فرائض وسنن کے متعلق مسائل درج کیے گیے تھے۔

---

[۱] "روضۃ الاولیاء" صفحہ (۱۸)

اور یہ رسالے مدراس کے قلعہ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے میں محفوظ تھے [۱]۔ لیکن نصیر الدین ہاشمی نے ان رسالوں کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا ہے۔ "دکن میں اُردو" چوتھے ایڈیشن میں وہ لکھتے ہیں :

"بعض اصحاب شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اور پہلا ناثر قرار دیتے ہیں مگر چونکہ ہم نے اُن کو دیکھا نہیں اور بعض وجوہ سے یہ رسائل ہنوز تحقیق طلب ہیں اس لیے ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے" [۲]

رسالہ شاہ راجو اس عہد کا آخری نثری رسالہ سید شاہ راجو کا رسالہ تصوف ہے جو راقم الحروف کو اس مقالے کے مواد کی چھان بین کے دوران دستیاب ہوا ہے۔ یہ رسالہ کتب خانہ روضتین گلبرگہ (دکن) میں محفوظ ہے اور اُردو فارسی کے حسب ذیل رسالوں کے ساتھ منسلک ہے۔

(۱) رسالہ الوہیت	(۸) رسالہ دارالاسرار بندہ نواز
(۲) رسالہ حضرت شاہ راجو	(۹) رسالہ جہانگیری
(۳) رسالہ سیر التواریخ	(۱۰) رسالہ حضرت شاہ میراں
(۴) تحفۃ الملک	(۱۱) رسالہ وجودیہ
(۵) مجمع الفواید	(۱۲) رسالہ داشتن چہار پیر و چہار خانوادہ
(۶) رسالہ حکمت التوحید	(۱۳) رسالہ معراج السالکین
(۷) رسالہ شکارنامہ بندہ نواز	(۱۴) رسالہ وجودیہ از شیخ فریدالدین گنج شکر

ان میں سے نمبر ۱-۳-۴-۵-۶-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴ فارسی کے رسالے ہیں اور ۲-۷-۸ اُردو کے۔ یہ سارے رسالے ایک جلد میں بندھے ہوئے ہیں جو کتب خانہ کی فہرست میں سلسلہ نشان (۲۶۱) پر "مجموعہ رسائل" کے نام سے درج کیے گیے ہیں۔

نمبر ۲ کے علاوہ دوسرے دو رسالوں کا ذکر خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کے سلسلے میں کیا گیا ہے یہاں جو رسالہ قابل ذکر ہے وہ رسالہ نمبر ۲ یعنی "رسالہ شاہ راجو" ہے۔ یہ رسالہ (۱۶) سولہ صفحات کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں مذہب اسلام کے عقاید اور تصوف کے نکات درج ہیں ابتدائی

---

[۱] "اُردوے قدیم" صفحہ (۴۱) [۲] دکن میں اُردو طبع چہارم صفحہ ۲۵

دور کے بعض رسالوں کی طرح یہ رسالہ بھی سوال، جواب کی شکل میں لکھا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ مذہب اسلام کے حقایق اور تصوف کے نکات خواہش مندوں کے لیے مختصر طور پر ضروری مواد
فراہم کرنے کے مقصد سے یہ تصنیف کیا گیا۔

نمونہ یہ ہے

جان العزیز اول کچھ نہ تھا آسمان نہ تھا نہ زمین نہ عرش نہ کرسی نہ چاند نہ تارے نہ کچھ تھا
اور ذات حق تعالی اپنے میں آپی تھا۔ اس حد تلک کے صفتوں کا بھی ظہر نہ تھا۔ نہ اپنی خبر رکھتا تھا
نہ غیر کی۔

سوال۔ کس واسطے خبر نہیں رکھتا تھا ؟

جواب۔ کہ خبر رکھنا صفاتوں سوں تعلق رکھتا ہے ہور اپنی ذات سوں اپے ایسا مشغول
تھا جو کس صفتا نکا گنجائش نہ تھا جس وقت صفتا نکا گنجائش نہ تھا تو خبر رکھنا بھی ممکن نہیں۔

سوال۔ صفتاں قدیم یا جدید

جواب۔ قدیم میں ظہور اس کا ذات مربی میں مخفی ہے جیونکے شراب ذات میں عطر پھول میں۔

سوال۔ اس مرے کا ناوں کیا۔

جواب۔ اس مرے کو غیب ہویت بولتے ہیں۔

سوال۔ غیب ہویت کے معنی کیا ؟

جواب۔ اول کچھ نہ تھا ہور اپنے موں آپ تھا تو منداں کیا جس وقت سبحانہٗ تعالےٰ
یو منداں کرنا چاہا ہور غیب نے حضوریت کا ارادہ کیا۔ اول آپ میں اپی جانا کہ میں۔

سوال۔ اس مرتبہ کا ناواں کیا ؟

جواب۔ ابدیت بعد از جانیا کہ میں ایسا ہوں

سوال۔ اس مرتبہ کا ناوں کیا

جواب۔ اس مرتبہ کا ناواں وحدت بولتے ہیں۔ یہو حقیقت میں محمد ہور برزخ کبریٰ ناوں
رکھتے ہیں۔

سوال۔ ازمو دو نسبت ہوتے ہیں یو وحدت کے نسبت ہوتے ہیں سو کون کون ۔

جواب۔ ایک احدیت دوسرا واحدیت

سوال۔ احدیت سو کیا واحدیت سو کیا

جواب۔ جس اعتبار جو خالص ہے نبی کا چہ علم ہی اس نسبت کا ناوں احدیت ہے
جس اعتبار چارو اعتبار ثابت ہوتی ہیں اس نسبت کا ناوں واحدیت ہے۔

سوال۔ چارو اعتبار کیا

جواب۔ جس وقت آپس ہیں ہونکو (ملکو) جانیا یعنی وجود ہون تو اعتبار وجود کا اس ماما کیا
ہو اپ سین جانیا سو عدم سون جلینیا ہے تو اعتبار علم کا ثابت ہوا۔ ہور جس وقت آپ سین جانیا تو
آپ سین اپنی پرورش ہوا تو اعتبار نور کا ثابت ہوا۔ ہور جس وقت آپ سین آپ میں اپنی پرورش ہوا تو
اپنے کون نظر آیا۔ تو اعتبار شہود کا ثابت ہوا۔

سوال۔ وحدت کے معنی کیا

جواب۔ یک ذات قابلِ محض

سوال۔ احدیت کے معنی کیا

جواب۔ یک ذات بلا اعتبار صفات

سوال۔ جس وقت اپن اپسین جانیا تو ایسا ہی جانیا کیا یا نیں۔

جواب۔ جانے کیا وہ اجمال و جمع کے طریقہ پر۔

سوال۔ اس مرتبے میں اشیا کو ان کیا کہتے ہیں

جواب۔ شیونات ذات بولتے ہیں۔

سوال۔ شیونات ذات کے معنی کیا

جواب۔ ذات کیا قابلیاں

ل شاہ راجو نام کے جن سے یہ رسالہ منسوب ہے۔ دو بزرگ گزرے ہیں۔ ایک سید شاہ راجو قتال
جو سید محمد گیسو دراز حسینی کے والد اور جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے چھوٹے بھائی تھے۔

مخدوم قطب عالم گجراتی سید شاہ راجو اپنے چچا ہی کے فیض یافتہ تھے۔ ان بزرگوں کے ملفوظات گذشتہ باب میں پیش کیے جا چکے ہیں۔

اس رسالے کے شاہ راجو کی تصنیف ہونے کے بارے میں سوائے لوح کی مذکورہ بالا عبارت کے اندرونی یا بیرونی طور پر کوئی شہادت اس بات کی نہیں ملتی کہ یہ کس شاہ راجو کی تصنیف ہے کیونکہ اس نام کے ایک اور بزرگ گولکنڈہ کے حکمران ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں گزرے ہیں اس رسالے میں کوئی ترقیمہ بھی نہیں ہے۔ نہ قدیم دور کی کسی تاریخ میں اس رسالے کا تذکرہ ملتا ہے۔

راجو قتال ثانی سنہ وفات ۱۰۹۲ھ

سید شاہ راجو کا اصلی نام جو ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد تھے۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے اپنی "تاریخ گولکنڈہ" میں رضی الدین لکھا ہے[1] یہ خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے۔ شاہ اکبر حسینی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا حیدرآباد میں فتح دروازہ کے قریب رہتے تھے۔ ان کے معتقدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے بعض مشہور شعرا جیسے طبعی، قطبی وغیرہ نے ان کی مدح لکھی تھی۔ مثنوی "بہرام وگل اندام" کا مصنف طبعی جو گولکنڈہ کے آخری بڑے شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اپنی مثنوی میں سید شاہ راجو کی مدح ان الفاظ میں کی ہے۔:

ولی تو بڑا ہے ککر شاہ راجو
چل آیا ہے شاہ تیرے گھر شاہ راجو
خبر تیری معلوم نین بیخبر کون
خبردار جانے خبر شاہ راجو
کھڑا ہو کے خدمت منے تیری سورج
اڑانا کرنون کی چنور شاہ راجو

بہرام وگل اندام ۱۰۸۱ھ کے قریب کی تصنیف ہے۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۰۹۲ھ میں ہوا۔ لیکن ان بزرگ کی کسی تصنیف کا اب تک پتہ نہ چل سکا۔ نہ تو کسی "تذکرہ اولیا" ہی میں

---

[1] مجید صدیقی صاحب نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

یہ لکھا گیا ہے کہ شاہ راجو قتال حسینی اُردو کے مصنف تھے اور نہ کسی تاریخ ادب میں اب تک اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر "رسالہ شاہ راجو" انشا راجو کی تصنیف ہوتی تو ظاہر ہے کہ ان کے زمانے میں بیجاپور اور گولکنڈہ میں اُردو شعر و ادب کو جو ترقی ہو چکی تھی اس کا کچھ نہ کچھ پرتو اس رسالے کے موضوعات زبان اور اسالیب میں بھی کہیں نہ کہیں نظر آجاتا۔ میں نے اس سلسلے میں جس قدر چھان بین کی مجھے ناکامی ہوئی اور یہ بات کسی طرح قیاس میں نہیں آسکتی کہ شاہ راجو حسینی ثانی جو وجہی غواصی اور ابن نشاطی کے تقریباً معاصر تھے۔ "سب رس" "سیف الملوک بدیع الجمال" "طوطی نامہ" "گلشنِ عشق" جیسی معرکتہ الآرا اور بسیط تصانیف کے مقابلے میں ایسی مختصر اور ابتدائی قسم کی تصنیف لکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ اس رسالہ کا موضوع معرفت کے مسائل ہیں۔ تاہم جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے شاہ ملک بیجاپوری نے "احکام الصلوٰۃ" جیسی ضخیم تصنیف پیش کر دی تھی۔ اور میران یعقوب "شمایل الاتقیا" جیسی کتابیں تصنیف کر چکے تھے شاہ راجو خصوصیت کے ساتھ ایسی ابتدائی قسم کی تصنیف نہیں لکھ سکتے تھے۔ ہمعصر کارنامے ہمیشہ ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ شاہ راجو کے اس رسالے کی صورت میں معاصر تصانیف کا کچھ بھی اثر نہیں ملتا۔ پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس طرح کی تصانیف اپنے موضوع اور اسالیب دونوں لحاظ سے زیادہ تر آٹھویں اور نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے قرین قیاس بات یہی ہے کہ یہ رسالہ شاہ راجو اول ہی کی تصنیف ہے۔

اس قیاس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ شاہ راجو اول کے کچھ اور اُردو اور فارسی رسالے بھی دستیاب ہوئے ہیں جیسے "سہاگن نامہ" (اُردو) "تحفتہ النصائح" اور "دیوان راجا" جس کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے۔

حالاتِ زندگی سید شاہ راجو
[illegible]ھ ۔ ۷۹۵ھ

سید شاہ راجو اشرف جہانگیر اور عین الدین گنج العلم کے معاصر تھے۔ جن کی تصانیف اور فرمودات کا سراغ لگا ہے۔ سید شاہ راجو قتال سید محمد گیسو دراز کے والد اور جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا پورا نام سید یوسف حسینی تھا اور عرف سید راجا۔ ان کی بیوی بی بی رانی کہلاتی تھیں۔

اور سیدہ تھیں۔ بی بی رانی کے بھائی سید ابراہیم متوفی حکومت دہلی کی طرف سے دولت آباد کے صوبہ دار مقرر کیے گیے تھے۔ سید راجا سلطان المشائخ کے مرید اور ان کے خلیفہ خاص نصیر الدین چراغ دھلوی کے فیض یافتہ تھے۔

۷۲۸ھ میں جب سلطان محمد تغلق نے باشندگان دہلی کو دولت آباد جانے کا حکم دیا تو شاہ راجو بھی اپنے اہل و عیال کو ہمراہ لیکر ۲ رمضان المبارک ۷۲۸ھ کو دہلی روانہ ہوئے۔ گجرات سے ہوتے ہوئے چار ماہ کے سفر کے بعد ۱۷ محرم کو دولت آباد پہونچے اور قلعہ دولت آباد کے شمالی جانب یعنے کو خلد آباد میں سکونت اختیار کی۔ ان کے دوسرے ساتھیوں یعنے برہان الدین غریب امیر حسن علاء سنجری وغیرہ نے بھی یہی مقام قیام کے لیے پسند کیا۔ خلد آباد آنے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ آپ کا مزار خلد آباد میں ہے۔ گولکنڈہ کا آخری تاجدار ابوالحسن بھی آپ کے مزار کے پاس دفن ہے۔

سید راجو کے سن وفات کے بارے میں علما میں بہت اختلاف ہے۔ مولوی عطا حسین "سیر بندہ نواز" کے مصنف نے ۷۳۱ھ بتایا ہے۔ "برکات الاولیا" کے مصنف اور "محبوب الزمن" کے مولف نے بھی یہی سن کو مستند مانا ہے لیکن شیخ عبد القادر سرفراز نے بمبئی یونی ورسٹی کے مخطوطات کے کیٹلاگ میں سنہ وفات ۷۹۵ھ بتایا ہے اور یہ سنہ وہ اس وجہ سے معتبر سمجھتے ہیں کیونکہ "تحفۃ النصائح" جو سید راجو کی تصنیف ہے ۷۹۵ھ میں لکھی گئی۔ اس کی تائید ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی "تذکرہ اردو مخطوطات" میں کی ہے[۱]۔

اس کے علاوہ ۷۹۵ھ میں سید راجو کے بقید حیات ہونے کا ثبوت مصنف برکات الاولیا کے اس بیان سے بھی ملتا ہے، کہ جس وقت خواجہ بندہ نواز ۸۰۱ھ میں دکن تشریف لائے تو ان کے والدان کے ساتھ تھے[۲]۔

تصانیف سید شاہ راجو کی اب تک صرف ایک فارسی مثنوی "تحفۃ النصائح" کا حال معلوم تھا[۳]. یہ مثنوی انھوں نے اپنے فرزند سید محمد گیسو دراز کے لیے لکھی تھی۔ جیسا کہ ذیل کے

---

[۱] تذکرہ اردو مخطوطات ج ۱ صفحہ (۳۵) [۲] برکات الاولیا (ترجمہ روضۃ الاولیاء) صفحہ (   )
[۳] ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی بمبئی یونیورسٹی مرتبہ پروفیسر عبد القادر سرفراز صفحہ (   ) نیز تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ (۳۵)

شعر سے پتہ چلتا ہے :

" گویدہمی یوسف گدا در وعظ سخنی چند را

از بہر خلف خوش لقا بوالفتح آن نورالبصر"

اس کا ترجمہ شاہ راجو ثانی کے مرید قطب الدین قطبی نے ۱۰۴۵ھ میں کیا۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ تصنیف شاہ راجو ثانی کی ہے جس کا ترجمہ ان کے مرید نے کیا۔[۱]

مجھے ان کی ایک اُردو مثنوی "سہاگن نامہ" کا بھی پتہ چلا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔[۲] یہ ایک مختصر سی نظم ہے جو ساٹھ ابیات پر مشتمل ہے۔ ترقیمہ کی عبارت جو فارسی میں ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۱۴۷ھ میں قاضی عظیم الدین کی فرمائش پر قاضی بدیع الدجیٰ نے ہاشم پیر کے مکان میں نقل کیا تھا۔ ترقیمہ کی اصل عبارت حسب ذیل ہے :

" بہ ید احقر العباد بدیع الدجیٰ قاضی بمکنہ ہاشم پیر سرکار ناندیر و باشندہ صوبہ محمدآباد و بالا گھاٹ در قلعہ پالم بہ حسب الارشاد جامو صاحب قاضی عظیم الدین خان مدظلہ در یک گھڑی افتتاح یافت روز یکہ چرخ ۔

روز یکہ چرخ رشتہ عمرم رہا کند | ایں خاک تیرہ بند ز بندم جدا کند
یارب نگاہ دار تو ایمان آن کسے | کاید خط در ایں بخواند و بر من دعا کند

رسالے میں ابتدائی دور کی اکثر تصانیف کی طرح عورتوں کو دینی مسایل سے واقف کرانے کا ایک خاص نہج اختیار کیا گیا ہے۔ عورت کے احترام کے مدنظر اور عوام کے تخاطب کے انداز کے اتباع میں جگہ جگہ اسے "سہاگن" کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

سُن ری سہاگن سُن ری سُن | یکیک بول چیت دھر سن
کن سوی کپٹ یا کی کمان | کھولن کہنا بھید بہان

اس طرح سے عام عورتوں کے بدعتی عقاید تفصیل سے بتا کر ان کو ترک کرنے اور ان سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک خاص بات اس نظم میں یہ ہے کہ اکثر مشکل ہندی الفاظ کی تشریح

[۱] دکن میں اُردو [۲] مخطوطات جلد اول صفحہ ۳۵ نمبر فہرست ۳۱۴

ان کے نیچے فارسی میں کردی گئی ہے چنانچہ مذکورہ بالا اقتباس کے آخری شعر میں "سک اور سہرا" کے نیچے فارسی میں یعنے "منت و مراد" لکھا ہوا ہے۔ اس نظم کے آخری شعر میں سیدراجو کا بھی نام آیا ہے شعر حسب ذیل ہے :

"سیدراجو عابد ہے ✤ بخشن ہارا معبد ہے"

نظم کے کچھ اور شعر یہ ہیں :

سن ری سہاگن سن ری سن ✤ یکیک بول چت دھر سن
کن سوی پیٹ یا کی کمان ✤ کھول نہ کہنا بھید یہ سان
مت دیوا کین بھیجنگے ✤ بت دیویا کین پونجینگے
جانے جو سے پوج نکو ✤ سک اور سہرا کوچ نکو
(یعنے منت و مراد)
کین صدقہ کیسر کاری کی ✤ یا کین سر پر واری کی
دیوی ملیدی جن لاویں ✤ بے شک دوزخ میں جاویں
ناری کھریان باندی نا ✤ ماٹ ہور مٹکیاں ماندی نا
غیر از خدا کو سجدہ نہ کر ✤ کافر ہوکر دوزخ نہ پڑ
بی بیان پریاں شہ ریشم ✤ شیطان کی ہے راہ نشم
(نشم راہ بد را گویند)

چچا سہاگن نہ کہلا ✤ جمکھ سنواری ناچ لا
ٹوٹ کا ٹونا کر نکو ✤ کن فال تول کین پھر نکو
ارکل ترت کا چھوری سبک ✤ روزہ رکھ کر بھیک نہ منگ
پاڈماں جالنا مسلم چھور ✤ دین تے باغی کفر ہے کھور
چھو شک نرسویا کہ مونجا ✤ سو ہے کافر جن پونجا
(بت ها اند)
جو کوئی کاٹر لیوینگی ✤ سخت شکنجے کھینچینگی
(کاٹر بعضی را گویند)

سیّد شاہ راجو کا ایک فارسی دیوان موسومہ "دیوان راجا" کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس میں موجود ہے جس کا ذکر[1] ایتھے نے کیا ہے۔ کتب خانہ باڈلین[2] میں اور اسپرنگر[3] کے کیٹلاگ میں اس نسخے کے موجود ہونے کا پتہ دیا گیا ہے۔

ایتھے کو شاہ راجو کے زمانے کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے چنانچہ اس نے ان کا زمانہ بارھویں صدی ہجری بتایا ہے۔ غالباً اسے شاہ راجو اول اور شاہ راجو دوم میں تسامح ہوا ہے۔ میں نے اس دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ روضتین بھی دیکھا ہے۔ یہ نسخہ ایتھے کے بیان کیے ہوئے نسخے سے زیادہ مکمل معلوم ہوتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "دکن میں اُردو" میں ایتھے کے حوالے سے سید شاہ راجو کے دیوان میں اشعار ہندی کا بھی ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ انھیں اس دیوان میں "شاہ راجو" کا کوئی ہندی شعر نہیں ملا[4]۔

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ سیّد شاہ راجو نے اُردو نثر کے علاوہ نظم میں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

معاصرین

شاہ راجو، امیر خسرو اور امیر حسن علا سنجری کے معاصر اور پیر بھائی تھے۔ خسرو کے اُردو کلام کے متعلق بہت رد و قدح کی جاتی رہی ہے لیکن بالآخر دورِ جدید کی تحقیقات نے خسرو کو "کھڑی بولی" یعنے اُردو کا پہلا شاعر تسلیم کر لیا ہے۔ اور ان کے ریختیوں، لوریوں اور انملیوں کو ہندی کے علمائے ابتدائی ہندی (اور اُردو) کا نمونہ تسلیم کر لیا ہے۔ خسرو نے "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں اپنے ہندی دیوان کا ذکر کیا ہے[5]۔ اسی میں وہ اپنے معترضین کو یوں جواب دیتے ہیں:

"چو من طوطی ہندم از راست پرسی ❊ زمن ہندوی پرس تا نغز گویم

اور "آہوئے ہندیم من نے او شترے حجازم"

---

[1] ملاحظہ ہو "ڈیسکرپٹیو کیٹلاگ نمبر ۱۰۰۲۔ [2] کیٹلاگ ۱۷۷۹
[3] کیٹلاگ اسپرنگر ۳۴۹ھ
[4] "دکن میں اُردو" طبع چہارم ۱۹ (فٹ نوٹ)
[5] "مقالہ ہذا صفحہ ( )

یہ "ہندی" جس کی نغز گوئی پر خسرو کو فخر ہے اُردو ہی کا ابتدائی روپ ہے۔ خسرو نے فارسی میں ایک مثنوی "تغلق نامہ" بھی لکھی تھی جس میں غیاث الدین تغلق کا بیان ہے۔ اس میں ایک اُردو فقرہ ملتا ہے، جو یہ ہے :

" ہے ہے تیر مارا " [1]

ان کی مشہور تصنیف "خالق باری" کے بارے میں یہاں کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔

خسرو کے علاوہ آٹھویں صدی ہجری ہی کے ربع آخر میں مُلّا داؤد کا بھی نام ملتا ہے جنھوں نے ایک ہندی مثنوی "چندر بدن" لکھی تھی جس میں "لورک" اور "چندا" کا افسانہ بیان کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تصنیف "منتخب التواریخ" میں کیا ہے۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی اکبر کے زمانے میں بہت مقبول تھی در اصل یہ قصّہ فیروز شاہ تغلق کے وزیر خان جہاں مقبول کے بیٹے اور جانشین کے لیے مُلّا داؤد نے منظوم کیا تھا۔ اسے مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربّانی توحید اور معرفت کے رمز کے طور پر منبر پر استعمال کرتے تھے[2]۔ اس قصّہ کو خواصی مصنف "سیف الملوک و بدیع الجمال" نے بھی ۱۰۳۵ھ میں لکھا تھا[3]۔

شاہ راجو کے تیسرے اہم معاصر امیر حسن علا سنجزی ہیں۔ سنجزی شاہ راجو کے ہمراہ دکن آئے تھے۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے لیکن ان کے اُردو کلام کا حال ابھی تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ کچھ ہی عرصہ ہوا کہ جناب سخاوت مرزا کو اُردو کی ایک نایاب بیاض دستیاب ہوئی۔ جس میں امیر حسن سنجزی کے بھی کچھ اُردو اشعار مل گیے ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے مضمون "اُردو کی ایک نایاب بیاض" میں جو رسالہ اُردو (کراچی) میں شایع ہوا ہے سنجزی کے حالات لکھے ہیں اور کلام کو بھی روشناس کرایا ہے آٹھ اشعار پر مشتمل اس غزل کا پہلا اور آخری شعر ذیل میں دیا جاتا ہے۔

" ہر لحظہ آید در دلم دیکھوں اُسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود با آں صنم جوئے لائے کر

---

[1] "گجری اور اُردو زبان کی نشو و نما میں اہلِ گجرات کا حصہ" مقالہ از ... مطبوعہ رسالہ اُردو (کراچی) اکتوبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۸۵
[2] "صوفیائے کرام کی ہندی دوستی" مطبوعہ رسالہ معاصر نمبر ۲ صفحہ ۸۲، [3] "... " طبع چہارم) صفحہ ( )

بس حیلہ کردم اے حسن بے جاں شدم از دم بہ دم
کیسے رہوں تجھ جیو بن تم لے گیے سنگ لائے کر

سیّد شاہ راجو کے اتنے قریبی دوست کے مذکورہ بالا کلام کی موجودگی میں اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے اور سیّد شاہ راجو کا اُردو میں کچھ ملفوظ چھوڑنا کوئی خلاف قیاس بات نہیں رہ جاتی۔

(۴)

خواجہ بندہ نواز اور ان کے معاصرین کے نثری کارنامے

دورِ تغلق میں ثقافتی ترقی ۔ بہمنیوں کا عروج ۔ خواجہ صاحب کی دکن میں آمد ۔
حالات زندگی ۔ خواجہ صاحب کی عظمت کے متعلق رائیں ۔ تصانیف ۔ تصانیف
کی تعداد میں اختلاف ۔ ایک متنازع فیہ مسئلہ ۔ خواجہ صاحب نے اُردو میں تصنیف
و تالیف کی یا نہیں ؟ اُردو تصانیف کے بارے میں شواہد ۔ اُردو تصانیف
اُردو تصانیف کی نوعیت ۔ معاصر تصانیف اور متاخر تصانیف "معراج العاشقین"
"سہ بارہ" "ہدایت نامہ" "ہشت مسائل" "ہفت اسرار" "خلاصۃ التوحید"
'شکار نامہ' 'تمثیل نامہ' 'دار الاسرار' 'تلاوت المعراج' 'تلاوت الوجود' 'وصیت الہادی'
'رسالہ وجودیہ' تصانیف کے نمونے اور ان پر تبصرہ ۔ خواجہ صاحب کا اسلوبِ بیان ۔

معاصرین

اکبر حسینی ۔ عبداللہ حسینی ۔ شاہ داول ۔ سید محمد جونپوری
بہاؤالدین باجن ۔ کمال الدین ۔ شاہ قلندر
بدرالدین محمد مصنف "آداب الفضلا" ۔ قوام فاروقی
مصنف "شرف نامہ" ۔

۴

حضرت خواجہ بندہ نواز کے نثری رسالے

نویں صدی ہجری کی ابتداء اُردو ادب کی تاریخ میں مربوط اور مستقل نثری تصانیف کے آغاز کی وجہ ممتاز رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی میں تغلق خاندان کے حکمران موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ اس میں شک نہیں "عہدِ تغلق" تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہے۔ اس دور میں فنونِ لطیفہ کی کافی سرپرستی ہوئی۔ ادب، تعمیر، موسیقی، ثقافت سب ہی میں ایک نئے رجحان کا آغاز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی میں بھی یہ دور ایک طرح سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

یوں تو خلجیوں ہی کے دور سے ہندوستان کے دور دست علاقے نئے حکمرانوں کے زیرِ نگیں آرہے تھے لیکن ان کے بعد ان کے جانشینوں محمد تغلق اور فیروز تغلق نے دکن، بنگال، گجرات وغیرہ تک سلطنت کے حدود وسیع کر لیے تھے۔ محمد تغلق نے دکن میں دولت آباد کو پایۂ تخت بنا کر ملی جلی ثقافت اور زبان کے پھیلاؤ کے لیے ایک نیا میدان فراہم کر دیا تھا۔ اس وقت سے دہلی کے اکثر علماء و فضلا بھی دکن منتقل ہونے لگے لیکن دکن میں تغلق خاندان کی حکومت زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکی۔ محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز تغلق نے دہلی کو آباد کیا۔ اس سیاسی شکست و ریخت میں دکن شمالی ہند کے تسلط سے نکل گیا۔ اور ۷۴۸ھ (۱۳۴۸ء) میں ایک آزاد و خود مختار حکومت قایم کرلی۔

دکن کا پہلا خود مختار مسلمان حکمران علاؤالدین حسن بہمنی تھا جس نے بہمنی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ یہ خاندان ۷۴۸ھ تا ۹۳۲ھ (۱۳۴۸ء تا ۱۵۲۲ء) تقریباً دو ڈھائی سو سال تک دکن پر حکومت کرتا رہا۔ اس کا پہلا پایۂ تخت گلبرگہ تھا جہاں اُردو مربوط اور مستقل نثر کا پہلا کارنامہ لکھا گیا۔

یوں تو بہمنیوں نے فارسی کی کافی سرپرستی کی لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کو اس نوخیز زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا بھی احساس تھا جو دکن میں مختلف زبانیں بولنے والے طبقوں کے آپس میں تبادلۂ خیال کا ذریعہ بن چکی تھی اور بہ ضرورت رفتہ رفتہ ادب و شعر کے لیے بھی مستقل طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"یہ دکن ہی تھا جس نے شمالی ہند کے برخلاف یہاں کی زبان برج بھاشا تھی۔ ہندی یا ہندوستانی زبان کو اپنا کر ادبی نمونے کی مثال قایم کی" [1]

بہمنی دور دکن کی تاریخ میں نہ صرف اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس دور میں مربوط نثری تصانیف اُردو میں لکھی جانے لگیں بلکہ اس لیے بھی کہ بہمنی دربار نے بہ حیثیت مجموعی علوم و فنون کی سرپرستی کی۔ شعرا اور اہلِ قلم کی مدد کی اور ملی جلی تہذیب "ہند لمانی" تہذیب کو پروان چڑھایا جس کی ترقی میں بعد میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں نے بھی بیش از بیش حصہ لیا۔ محمد شاہ ثالث بہمنی سنہ ۸۶۷ھ سنہ ۸۸۷ھ (سنہ ۱۳۶۷ء۔ سنہ ۱۳۸۷ء) کے وزیر محمود گاواں نے دکن میں علم و فضل کو عام کیا۔ اسی نے فارسی کے مشہور شاعر عبدالرحمٰن جامی کو بھی دکن آنے کی دعوت دی تھی [2]۔ محمد شاہ ثانی (سنہ ۷۸۰ھ تا سنہ ۷۹۹ھ) نے فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کو دکن بلایا تھا [3]۔ اسی خاندان کا حکمران فیروز شاہ بہمنی (سنہ ۸۰۰ھ سنہ ۸۲۵ھ) خود بھی بڑا عالم تھا۔ تواریخ میں مذکور ہے کہ علم ہیئت سے اسے بڑی دلچسپی تھی اور سنہ ۸۱۰ھ میں اس نے بمقام دولت آباد ایک رصد گاہ تعمیر کرائی تھی [4]۔

شاہ راجو قتال کے شہرہ آفاق فرزند صدرالدین ابوالفتح ولی اکبر الصادق سید محمد بن یوسف الحسینی الملقب بہ "گیسو دراز" اسی زمانے میں گلبرگہ وارد ہوئے اور احمد شاہ بہمنی کے تخت نشین ہونے تک دکن میں ارشاد و ہدایت کا مرکز بنے رہے۔ احمد شاہ بہمنی (سنہ ۸۲۵ھ تا سنہ ۸۳۸ھ) کے زمانے تک دکن میں اُردو بولنے والے عوام کافی تعداد میں بس چکے تھے۔ اس زمانے کے حالات لکھتے ہوئے تاریخ دکن کے مستند مصنف ابوالقاسم فرشتہ نے یہاں کے بسنے والوں کے مختلف طبقوں کی تفصیل

---

[1] ملاحظہ ہو "انڈو ایرین اور ہندی" صفحہ ۱۰۴۔ [2] ملاحظہ ہو "تاریخ بہمنی" مصنفہ ہارون خاں شیروانی۔
[3] "شعر العجم" [4] "اردوئے قدیم" صفحہ ۱

اس طرح لکھی ہے :-

۱۔ "دکھنی" سے مراد وہ لوگ تھے جو سلطان علاؤالدین خلجی یا اس کے بعد شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ ہندوستان سے آکر دکن میں آباد ہوگیے تھے اور یہاں ان کی دو تین نسلیں گزر چکی تھیں یہ لوگ دکھنی کہلانے لگے تھے۔ بعد میں ان کی زبان دکھنی کہلانے لگی۔

۲۔ "غریب" وہ لوگ تھے جو ترکستان، ایران یا افغانستان سے وقتاً فوقتاً آکر دربار میں توسل پیدا کرتے تھے اور ان کی زبان بالعموم فارسی ہوتی تھی۔

۳۔ "حبشی" وہ لوگ تھے جو حبش یعنی ابی سینا کے باشندے تھے اور یمن کے راستے ہندوستان آئے تھے یہ لوگ عربی اور حبشی دونوں زبانیں بولتے تھے۔

ملک کے اصلی باشندے ان کے علاوہ تھے سلطنت کے شمال مغرب میں مرہٹے آباد تھے جنوب مشرق میں کنڑی اور تلنگی بولنے والوں کی بستیاں تھیں۔

خواجہ صاحب دکن میں تقریباً ربع صدی تک ارشاد وہدایت کا مرکز رہے۔ ارشاد و ہدایت کی ضرورت زیادہ تر ان لوگوں کے لیے تھی جو عوام کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب نے جو مذہبی رسالے لکھے ہیں وہ زیادہ تر انھیں عوام کے لیے لکھے ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں ارشاد و ہدایت اور احکام دین سکھانے کی ضرورت انھیں لوگوں کو تھی۔ خواجہ صاحب کے ان رسالوں کے لیے اُردو زبان کو استعمال کرنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دکھن میں یہ زبان عوام کی زبان بن چکی تھی۔

حالات زندگی خواجہ صاحب کا اصلی وطن دھلی تھا۔ جہاں ان کے بزرگ پانچویں صدی ہجری میں ہرات سے آکر بس گیے تھے۔

سلسلہ نسب و خاندان خواجہ صاحب صحیح النسب سید تھے۔ ان کا سلسلہ اٹھارہ واسطوں سے زید

مظلوم بن زین العابدین بن حضرت امام حسینؓ بن حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ملتا ہے [1]۔
خواجہ صاحب کے دادا حضرت ابی الحسن الجندی، محمد غوری کے ساتھ ہرات سے دہلی فتح کرنے کے لیے آئے تھے۔ اسی جنگ میں شہید ہو گیے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کی اولاد دہلی ہی میں بس گئی۔ ان کی اولاد میں سے سید یوسف عرف سید راجو قتال کے دو فرزند سید چندن اور سید محمد حسینی تھے۔

سید محمد حسینی دہلی میں ۴/رجب ۷۲۰ھ کو تولد ہوئے۔ ان کا نام محمد کنیت ابوالفتح اور لقب صدرالدین ہے۔ خواجہ صاحب کی کاکلیں بہت دراز تھیں اس لیے عام طور پر گیسو دراز کے لقب سے مشہور تھے [2]۔

خواجہ صاحب کی ولادت کے وقت حضرت خواجہ نظام الدین بقید حیات تھے۔ ۷۲۶ھ میں سلطان محمد تغلق بادشاہ دہلی نے دولت آباد (دیوگڑھ) کو اپنا پائے تخت منتخب کیا۔ اور دہلی کے باشندوں کو دولت آباد جانے کا حکم دیا تو سید یوسف حسینی المعروف بہ راجو قتال بھی اپنے اہل و عیال سمیت ۷۲۸ھ میں دہلی سے روانہ ہوئے۔ چار مہینہ کے سفر کے بعد ۷۲۹ھ کو دولت آباد پہونچے۔ ان کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاء کے اور کئی خلفاء جیسے حضرت برہان الدین غریب۔ خواجہ امیر حسن علا سنجری وغیرہ بھی تھے۔ خواجہ صاحب نے ابتدائی تعلیم والد اور نانا سے حاصل کی۔ یہ دونوں بزرگ نصیرالدین چراغ دہلوی کے تربیت یافتہ تھے۔ ان ہی کی زبانی نصیرالدین دہلی کے اوصاف سُن سُن کر انھیں آپ کی ذات سے عقیدت پیدا ہوئی۔ ان کی بہت خواہش ہوئی کہ دہلی جائیں لیکن کم عمری اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ آخر ان کی والدہ بی بی رانی کسی بات پر اپنے بھائی سید ابراہیم متوفی، صوبہ دار دولت آباد سے ناراض ہو گئیں اور اس قدر بردا شتہ خاطر ہوئیں کہ اپنے دونوں فرزندوں سید حسین عرف چندن حسینی اور سید محمد گیسو دراز کے ساتھ دہلی

---

[1] خواجہ صاحب کے سوانح حیات کے ماخذ "تذکرہ اولیائے دکن" ( ) و "خزینۃ الاصفیا"، (محمد سرور) "اخبار الاخیار" (عبدالحق حقی) و "تذکرہ محبوب الزمن" (عبدالجبار ملکاپوری)، "سیر محمدی" (محمد علی سامانی) اور "تاریخ حسینی" ( ) ہیں۔ [2]

روانہ ہوگئیں۔

۷۳۶ھ میں جس وقت یہ دہلی پہونچے۔ خواجہ صاحب کی عمر پندرہ سال کی تھی لیکن مرشد کی ملاقات کا اشتیاق غالب تھا۔ ایک دفعہ جمعہ کے دن حضرت چراغ دہلی جامع مسجد تشریف لائے خواجہ صاحب انھیں دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ اور ۱۶ رجب کو ۷۳۶ھ میں نصیرالدین چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ ارادت میں داخل ہوگیے۔ خواجہ صاحب ہمیشہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے ساتھ ریاضت و ذکر میں شریک ہوتے اور علوم ظاہری کے حاصل کرنے میں کوشش کرتے۔ ساتھ ہی سلسلۂ درس بھی جاری رکھا کیونکہ نصیرالدین چراغ دہلوی کی خواہش تھی کہ وہ سلسلۂ درس ترک نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے امام ہمام تاج الدین کے پاس "کافیہ" کا ایک حصہ ختم کیا۔ اس سے بھی سیری نہ ہوئی تو قاضی عبدالمقتدرؒ[1] سے "کافیہ" شرح کافیہ اور "کشاف" کی تعلیم ختم کی۔ ان کے علاوہ سید شرف الدین کھیتلی وغیرہ سے بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انیس[19] سال کی عمر میں علوم ضروریہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کرلی اور تمام تر وقت ریاضت اور مجاہدہ میں صرف کرنے لگے۔ اس زمانے میں روز نصیرالدین چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کرتے کہ اگر حکم ہو تو جس قدر علوم ظاہری حاصل کیے ہیں۔ اسی پر اکتفا کر کے علوم باطنی کی تحصیل میں مشغول ہو جاؤں۔ لیکن شیخ ممدوح نے اجازت نہیں دی۔ اسی زمانے سے خواجہ صاحب نے تصنیف و تالیف شروع کی۔ پہلے تو "کشاف" پر حواشی لکھے۔ پھر رسالہ قشیری کی فارسی میں شرح لکھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے رسالہ کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ اسی زمانے کا معرکتہ الآرا کارنامہ عبدالقاہر سہروردی کی شہرۂ آفاق کتاب "شرح آداب المریدین" کی شرح بھی ہے۔ اس کی ایک شرح آپ کے پیشرو بزرگ شرف الدین یحییٰ منیری نے بھی عربی میں لکھی تھی۔ خواجہ صاحب نے اس کی شرح فارسی میں لکھی۔ پھر "خاتمہ شریف" کے نام سے آداب المریدین کا تکملہ یا ضمیمہ لکھا۔ مستند سیرتوں میں ہے "فصوص الحکم" کی شرح بھی لکھی۔ نیز "تمہیدات" عین القضاۃ ہمدانی کی شرح بھی اسی زمانے میں لکھی۔ اور یہ تمام تصانیف مرشد کی خدمت میں پیش کیں۔

اسے دیکھ کر شیخ ممدوح بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد علوم باطنی کے حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔
۱۸۔ رمضان ۷۵۷ھ کو چراغ دہلی راہی عالم بقا ہوئے۔ خواجہ صاحب ہی نے ان کی نعش مبارک کو غسل دیا، کفن پہنایا اس کے بعد سجادہ ارشاد پر متمکن ہوئے اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ اور اس وقت تک بیاہ نہیں کیا تھا۔ آخر چالیس سال کی عمر میں والدہ کے اصرار سے سید احمد بن عارف باللہ جمال الدین کی صاحبزادی بی بی رضا خاتون سے نکاح کیا۔ ان کے خسر یعنے جمال الدین مغربی بھی بلند پایہ محدث اور فقیہہ تھے۔ جمال الدین کے خلیفہ کمال الدین مغربی میران جی شمس العشاق کے مرشد تھے۔

خواجہ صاحب دہلی میں سجادہ ارشاد پر متمکن رہ کر خلق خدا کی ہدایت میں ۸۰۰ھ تک مصروف رہے۔ اس سال امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا ۸۰۱ھ میں اٹک پہونچ کر دھلی کی جانب بڑھا۔ اس شہر کی تباہی اور بربادی کا منظر حضرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دہلی سے ہجرت ہی مناسب سمجھی۔ انھوں نے دہلی کے دیگر سادات اور عامۃ الناس کو آنے والی بلا سے خبردار کیا۔ اور دہلی سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ خواجہ صاحب ۷۔ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ اس کے بعد تیمور دہلی پہونچا۔ خاندان تغلق کے آخری بادشاہ سلطان ناصر الدین نے ۸۰۱ھ میں امیر تیمور سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔

خواجہ صاحب دہلی سے گوالیار گیے۔ جہاں ان کے مرید اور خلیفہ علاؤالدین مقیم تھے۔ علاؤالدین نے تمام علما اور عمایدین شہر کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور گوالیار لیجا کر اپنے مکان میں ٹھیرایا۔ یہاں کچھ دن ٹھیر کر آپ نے علاؤالدین کو خلافت دی۔ گوالیار سے چندیری اور کھنسایت ہوتے ہوئے دولت آباد روانہ ہوئے۔ اس وقت دکن میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کی حکومت تھی۔ اسے خواجہ صاحب کے دولت آباد تشریف لانے کی اطلاع ہوئی تو عضد الملک کو جو دولت آباد کا گورنر تھا بادشاہ نے خط لکھا کہ وہ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر گزرانے اور گلبرگہ آنے کی التجا کرے۔ چنانچہ وہ الند ہوتے ہوئے ۸۰۳ھ میں گلبرگہ پہونچے۔

جب گلبرگہ کے قریب پہونچے تو سلطان فیروز شاہ نے اپنے تمام اہل خاندان، امرا سادات علما، اور فوج کے ساتھ ان کی پیشوائی کی اور بہت ادب و احترام کے ساتھ گلبرگہ آیا۔ یہاں تشریف

خواجہ صاحب چند سال تک قلعہ کے قریب فروکش رہے اس کے بعد اس جگہ سکونت پذیر ہوئے جہاں اب آپ کا مزار ہے۔ اسی مقام پر بروز دوشنبہ ۱۶۔ ذی قعدہ ۸۲۵ھ میں خواجہ صاحب نے رحلت فرمائی۔

خواجہ صاحب کے کمال و عظمت کے معترف ان کے اکثر معاصرین اور متاخرین تھے۔ جب ایک بار آپ غلبہ حال سے مجبور ہو کر پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بقدر ضرورت میں نے پڑھ لیا۔ اب اگر حکم ہو تو سلسلہ درس چھوڑ دوں۔ ان کے مرشد نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور فرمایا سلسلہ کی تکمیل کرو، کیونکہ

"مارا باتو کارہا است"

خواجہ صاحب کی تصانیف اور حالات زندگی اور خاص طور پر ان مساعی سے جو انھوں نے دکن کے اُردو داں عوام کو علوم دین سے واقف کرانے کے لیے کیں چراغ دہلی کا مذکورہ بالا قول بہت پُرمعنی ہے۔ نہ صرف دکھن ہی کے عوام بلکہ اس زمانے کے اکابر اولیاء بھی ان کے فیض سے مستفیض ہوئے۔ اور ان کی عظمت و رفعت کی شہادت دی۔ چنانچہ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی دور دراز راہ طے کر کے ایک بلکہ دو بار گلبرگہ آئے اور ایک مدت تک خواجہ صاحب کی خدمت میں رہ کر ان کے فیضان ظاہری و باطنی سے مستفید ہوئے [1]۔

سید اشرف جہانگیر کے خلیفہ نظام حاجی غریب یمنی نے ان کے جو ملفوظات "لطائف اشرفی" کے نام سے جمع کیے ہیں ان میں خواجہ بندہ نواز کے متعلق اپنے پیر کی زبان سے سن کر لکھتے ہیں۔

"حضرت قدوۃ الکبریٰ یعنی (حضرت سید اشرف جہانگیر) می فرمودند کہ چوں بہ شرف ملازمت پیر سید محمد گیسو دراز مشرف شدم آن مقدار حقایق و معارف کہ از خدمت وے بہ حصول پیوست از ہیچ مشائخ دیگر نبود سبحان اللہ

---

[1] ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیا صفحہ ۳۷۶ و "لطایف اشرفی"

چہ جذبہ قوی داشتہ اند " لے

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

" مدت در ولایت دکن در قصبہ گلبرگہ اتفاق نزول افتاد و در مرتبہ در آن گذر رایات صلائی شد " ۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث " اخبار الاخیار " میں ان کے حالات میں لکھتے ہیں :

" سید محمد یوسف الحسینی دہلوی خلیفہ راتین شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی است جامع است میان سیادت و علم و ولایت شانے رفیع و رتبے منیع و عالی دارد او را درمیان مشایخ چشت طریقے مخصوص است " ۔

عبدالرحمن چشتی مراۃ الاسرار میں خواجہ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں :

" بزرگ ترین خلیفہ حضرت شیخ نصیر الدین اودھی بود "

مذکورہ بالا اقوال سے خواجہ صاحب کے فیضانِ باطنی کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے اپنے فیض کو عام کرنے کی خاطر ہی خواجہ صاحب نے عربی فارسی اور اُردو میں بہت ہی تصانیف کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

تصنیفات خواجہ صاحب کی تصانیف کی تعداد کے بارے میں اکثر علماء میں اختلاف ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے ان کی تعداد تیس بتائی ہے ۲ے ۔

غلام یزدانی سابق ناظم آثار قدیمہ اپنے ایک مضمون مطبوعہ " ہسٹری اینڈ لیجنڈ " ۳ے میں ان کی تعداد (۸۰) بتاتے ہیں۔ لیکن عطا حسین مرحوم، جنھوں نے خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات اور تصنیفات کے بارے میں جہاں بین کی تھی وہ اپنی سیرت بندہ نواز میں لکھتے ہیں :

" عام طور پر مشہور ہے کہ ان کی عمر ایک سو پانچ سال کی تھی اور ان کی تصانیف کی تعداد بھی ایک سو پانچ ہے " ۴ے ۔

لے " لطائف اشرفی " ۲ے ملاحظہ ہو اُردوئے قدیم طبع سوم مطبوعہ نول کشور صفحہ ۱۴ ؛ ۳ے مطبوعہ محکمہ اطلاعات حیدرآباد ؛ ۴ے سیرت بندہ نواز صفحہ (۱۰) مطبوعہ انتظام پریس چھتہ بازار حیدرآباد

یہ حقیقت ہے کہ آپ تصانیفِ کثیرہ کے مالک تھے۔ اپنی تصنیف و تالیف کے بارے میں اپنے ملفوظ "جوامع الکلم" میں لکھتے ہیں۔

"ہر کس در آں حضرت سلوک کرد یہ چیزے مخصوص شد ما بہ سخن مخصوص ایم خدائے مارا دولت بیان اسرار خویش داد ہر چند کہ می خواہم کہ نظر میں از سخن خویش ساقط شود نشد البتہ مرا نظر بہ سخن خود باشد و از سبب ایں معنے نیاب اندوہگین باشم چرا باشد کہ نظر از ایں ساقط نہ شود"۔ [1]

یوں تو چشتیہ طریقہ کے بزرگوں میں خواجہ حسن بصری سے حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی تک اس سلسلے کے سارے بزرگ صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔ لیکن تصانیف کی تعداد اور اہمیت ہر لحاظ سے خواجہ سیّد محمد گیسو دراز کے پایہ کو کوئی نہیں پہونچتا۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کی تصانیف عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ خواجہ صاحب کی سب سے بسیط سیرت مرتبہ حافظ عطا حسین صاحب ان کی عربی اور فارسی کی تصنیفات (۳۷) بتاتی ہے۔ ان میں سے دو عربی میں ہیں۔ باقی (۳۵) فارسی ہیں۔ یہ تصانیف جیسا کہ حافظ عطا حسین صاحب لکھتے ہیں۔ ۷۷۰ھ سے ۸۲۵ھ کے درمیان لکھی گئیں۔ اگر ان کے بیان کو صحیح مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے پچاس برس کی عمر کے بعد تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کی لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

کتب سیرت میں مذکور ہے۔ خواجہ صاحب انیس سال کی عمر تک علوم کی تکمیل کر لی تھی۔ اور کچھ رسالے لکھ کر آپ نے پیر کی خدمت میں پیش بھی کیے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ مرشد کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ نصیر الدین چراغ دہلی کا انتقال ۷۵۷ھ میں ہوا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی تصانیف کا سلسلہ اس سنہ سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

---

[1] مخطوطہ جوامع الکلم صفحہ (۸۴) کتب خانہ روضتین۔

خواجہ صاحب کی چند فارسی تصانیف کا تذکرہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ان کے علاوہ ان کی اور تصانیف جو سلوک و تصوف اور ادب کے موضوعات پر ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

سلوک و تصوف (۱) ترجمہ عوارف المعارف (۲) شرح تصوف (۳) مشارق الانوار (سیرت نبی صلعم) (۴) شرح رسالہ قشیریہ۔ (۵) حظائر القدس (۶) اسمار الاسرار یہ آپ کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس میں باطنی علوم بتائے گیے ہیں۔ (۷) حدائق الانس (۸) استقامت شریعت بہ طریق الحقیقت (۹) حواشی قوت القلوب (۱۰) مجموعہ یازدہ رسایل یعنی مصباح القلوب وغیرہ (۱۱) وجود العاشقین (۱۲) مکتوبات (۱۳) رسالہ در رویت باری تعالیٰ و در کرامات اولیا۔ (۱۴) رسالہ دربیان رایت ابی فی احسن صورت (۱۵) شرح الہامات غوث اعظم (۱۶) رسالہ در ذکر (۱۷) رسالہ در مراقبہ (۱۸) رسالہ دل آرام (۱۹) رسالہ ضرب الامثال (۲۰) رسالہ منظوم در افکار (۲۱) رسالہ توحید (۲۲) تلاوت الوجود (۲۳) عشق نامہ (۲۴) جواہر العشاق (۲۵) شجرہ نسب۔

ادب (۱) شرح بیت امیر خسرو[۱] (۲) انیس العشاق (دیوان شعر فارسی)

اُردو تصانیف خواجہ صاحب کی اُردو تصانیف کا سب سے پہلے تذکرہ مولوی عبدالحق صاحب کے دیباچہ "معراج العاشقین" میں ملتا ہے۔ اس کے بعد حکیم شمس اللہ قادری ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور جناب نصیر الدین ہاشمی نے بھی خواجہ صاحب کا ذکر اُردو کے مصنف کی حیثیت سے کیا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق "معراج العاشقین" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"آپ نے بعض رسالے ہندی یعنی دکھنی اُردو میں بھی تصنیف فرمائے ہیں"[۲]

حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں:

"خواجہ صاحب نماز ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو علم تصوف اور حدیث

---

[۱] خسرو کی حسب ذیل بیت کی شرح ہے ؎ ز دریائے شہادت چوں نہنگ لا برآرد ہو ٭ تیمم فرض گردد نوح را در عین طوفانش

[۲] ملاحظہ ہو دیباچہ "معراج العاشقین"

سلوک کا درس دیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ درس میں کلام اور فقہ کی کتابیں بھی
پڑھائی جاتی تھیں۔ جو لوگ عربی فارسی سے ناواقف تھے ان کے سمجھانے کیلیے
آپ دکھنی میں تقریر فرماتے اور ایسے مریدوں کی فرمایش پر آپ نے چھوٹے چھوٹے
متعدد رسالے دکھنی میں تصنیف فرمائے تھے۔ منجملہ ان کے معراج العاشقین اور
ہدایت نامہ زیادہ مشہور ہیں ،، ؎۲

مولانا احسن مارہروی نے معراج العاشقین کو اُردو نثر کی سب سے پہلی تصنیف شمار کیا ہے ؎۳
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے بھی اپنی مستند کتاب "اُردو شہ پارے" میں خواجہ صاحب
کو اُردو کے مصنفین میں شامل کیا ہے۔ ان کے علاوہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے بھی "دکن میں اردو"
ایڈیشن چہارم میں خواجہ صاحب کا شمار اُردو کے اولین مصنفین میں کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔:

" جدید تحقیقات کی رو سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد
حسینی المتوفی ۸۲۵ھ وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس کی ابتدا
کی اور معراج العاشقین اور ہدایت نامہ وغیرہ مرتب فرمائے "۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بات ثابت ہے کہ خواجہ صاحب نے اُردو میں بھی تصانیف
چھوڑے ہیں۔ خواجہ صاحب کے اُردو کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنانے کے کئی اہم اسباب تھے:

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے اسلاف دو صدی سے دہلی میں
رہ بس گئے تھے۔ ان کی یہاں کی مقامی زبان سے واقفیت لازمی تھی ؎۴۔ ان کے اکثر اہل
خاندان راجو قتال۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔ قطب عالم۔ شاہ عالم وغیرہ جیسا کہ
دیکھا جا چکا ہے۔ ہندوستانی عوام کی رشد و ہدایت کے لیے اُردو استعمال کرتے تھے۔
خواجہ صاحب کا فریضہ عوام کی رشد و ہدایت تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اس عوامی زبان

؎۱

؎۲ اُردوے قدیم، صفحہ ۴۱ ۔ ؎۳ ملاحظہ ہو تاریخ نثر اُردو صفحہ (۴۳) ؎۴ ابوالحسن الجندی شہاب الدین
غوری کے ہمراہ دہلی آئے تھے۔ یہیں شہید ہوگئے۔

سے ناواقف ہوں اس لیے یہ سمجھنا کہ انھوں نے اپنے اسلاف کی روایات کو برقرار رکھا تو کوئی خلاف قیاس بات نہ ہوگی۔ خاص طور پر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعد کے دور میں شاہ میراں اور ان کے سلسلے کے تمام بزرگوں نے اپنے مرشد اور جد اعلیٰ کی لفظاً و معناً پیروی کی۔

۲۔ خواجہ صاحب کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ ہم پیچھے دیکھ آئے ہیں کہ اس سے پہلے کی صدیوں میں اُردو نثر کا ارتقا مسلسل ہوتا رہا۔ خواجہ صاحب کے زمانے تک زبان ارتقا کے اتنے مرحلے طے کر چکی تھی کہ اس میں تحریر و تقریر کی جا سکے۔

۳۔ ایک آخری بات یہ ہے کہ اکثر رسالے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ ان کے سلسلے کے بزرگوں کے ملفوظات میں دستیاب ہوئے ہیں اور جس حالت اور جس طریقے پر وہ دستیاب ہوئے ہیں اسے دیکھتے ہوئے انھیں غلط طور پر خواجہ صاحب کے رسالوں سے منسوب کیے جانے یا کسی قسم کی تحریف کی ضرورت اور گنجائش معلوم ہوتی۔ اس لیے جب تک خواجہ صاحب کی تصنیف کی تردید میں کوئی معین شہادت دستیاب نہ ہو۔ یہ سمجھنا حق بجانب ہے کہ یہ خواجہ صاحب ہی کے مصنفہ ہیں۔

سب سے قدیم شہادت جو خواجہ صاحب کے اُردو ارشادات کی ملتی ہے وہ عبداللہ بن عبدالرحمن چشتی کا ملفوظ "عشق نامہ" ہے۔ اس میں خواجہ صاحب کا یہ مقولہ نقل کیا ہوا دستیاب ہوتا ہے:

"بھوکوں موئے سوں خدا کچھ انپڑتا ہے، خدا کوں انپڑنے کی استعداد ہوئے ہے۔"

ایک اور ناقابل تردید ثبوت آپ کی اُردو سے انس کا یہ ہے کہ آپ نے اپنے چھوٹے فرزند اصغر حسینی کو "میاں لُہرہ"[1] کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس طرح اپنے پوتے شاہ یداللہ کو "میاں قیولا" پکارتے تھے[2]۔ ایک اور واقعہ ہے جو "تذکرۃ الملوک"[3] میں

---

[1] لُہرہ کے معنی دکھنی میں چھوٹے کے ہیں۔ [2] سیر محمدی مصنفہ محمد علی سامانی۔ [3] تذکرۃ الملوک ملا رفیع الدین شیرازی کی تصنیف ہے جو سلاطین بہمنیہ اور عادل شاہ کی تاریخ ہے اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں لکھی گئی۔

درج ہے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کے گھر کی اونچی زبان بھی "اُردو" ہی تھی ۔
ملا رفیع الدین شیرازی لکھتے ہیں کہ ایک روز شاہ یداللہ کے فرزند ندیم اللہ حسینی، خواجہ بندہ نواز
کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک خربوزہ تھا خواجہ صاحب نے اسے لے لیا۔
تو ندیم اللہ حسینی کہنے لگے :

دادا امورے ہان ۔ مورے ماریا

خواجہ صاحب کی اُردو تصانیف کی مزید شہادت، آپ کی مستند سیرت "تاریخ
حبیبی و تذکرہ مرشدی" سے ملتی ہے جو سلطان علاؤالدین احمد شاہ ابن احمد شاہ ولی بہمنی کے
وزیر نظام الملک بہ المقلب بہ ملک راجہ کی فرمائش سے تالیف ہوئی تھی اس کا مصنف عبدالعزیز
بن شیر ملک بن محمد واعظی ہے۔ مصنف نے اس کے جمیع مطالب سید یداللہ حسینی کی سند سے
بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ کلکتہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں اور دوسرا حبیب گنج
علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے حکیم شمس اللہ قادری نے اس کا مطالعہ حبیب گنج علی گڑھ کی
مخطوطات کی فہرست کی ترتیب کے سلسلے میں کیا تھا۔ اس مخطوطے کو دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔
حکیم صاحب کا بیان ہے کہ اس کے باب ہفتم میں جس کا عنوان

" مباحث واردات درعلوم و نویسانیدن تصنیفات "

ہے۔ خواجہ صاحب کی تصنیفات کے سلسلے میں اُردو رسالوں، ہدایت نامہ، دارالاسرار کے
نام بھی دیکھے تھے۔

حال ہی میں رسالہ "اُردو" (کراچی) میں سخاوت مرزا صاحب کا ایک بسیط اور محققانہ
مضمون شائع ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اُردو میں شعر بھی کہے تھے۔ چنانچہ
ایک غزل بھی جو آپ کے نام سے منسوب ہے کہا اسی مضمون میں نقل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نصیرالدین
ہاشمی صاحب نے بھی "دکن میں اُردو" میں آپ کا کچھ کلام نقل کیا ہے۔
نصیرالدین صاحب ہاشمی نے خواجہ صاحب کے صرف تین رسالوں معراج العاشقین،
ہدایت نامہ۔ سہ بارہ کا ذکر کیا ہے۔ کچھ مزید تفصیلات کا علم "تذکرہ مخطوطات (ادارہ"

ادبیات اُردو حیدرآباد دکن) سے بھی ہوتا ہے جو ۱۹۲۵ء میں شایع ہوئی۔ لیکن مجھے اس مقالے کی تدوین کے لیے مواد کی تلاش کے سلسلے میں خواجہ صاحب کے کچھ مزید رسالے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض رسالوں کے بارے میں تو شبہ نہیں کہ وہ خواجہ صاحب ہی کی تصنیف ہیں لیکن کچھ رسالے ایسے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کے بارے میں صرف قیاس یہ ہے کہ وہ خواجہ صاحب کی تصنیف ہو سکتے ہیں۔ اصل میں جو لٹریچر خواجہ صاحب سے منسوب ہوتا ہے وہ نہایت احتیاط سے مطالعہ کیا جانے کے قابل ہے کیونکہ ان سارے رسالوں کے مطالعہ کے بعد مرتب مقالہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کچھ رسالے تو یقیناً آپ کے مصنفہ ہیں لیکن کچھ رسالے ایسے بھی ملے ہیں جن کے بارے میں قیاس ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کے ارشادات کو ان کے مریدین اور معتقدین نے نقل کر لیا تھا۔ کچھ رسالے تو غالباً آپ کے مواجہ میں نقل ہوئے تھے لیکن بعض شاید عرصہ تک ذہنوں میں محفوظ چلے آئے اور بعد کو ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔ تذکروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب اپنے ملفوظات کو معتقدین سے لکھواتے تھے۔ چنانچہ کچھ رسالوں میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جیسے ایک رسالے "شکارنامہ" میں ایک جگہ تحریر ہے۔ :

"حضرت محمد حسینی فرماتے ہیں ارشاد کی ترتیب سوں شکارنامہ نو باپ اور سات ماں کے ہم چہار فرزند تھے"۔

فارسی میں بھی ان کا یہی طریقہ تھا مسئلۂ رویت باری تعالیٰ کے اقتباس اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے :

"محمد یوسف حسینی می گوید بعلم اللہ آن طائفہ را دیدہ ام کہ ایشان یکے ساعتے از دیدار او محروم نہ ماندہ اند"۔

ان رسالوں میں جنھیں خواجہ صاحب کے فرمانے پر معتقدین نے نقل کیا ہے۔ اکثر ایسے الفاظ آتے ہیں "حضرت محمد حسینی فرماتے ہیں" وغیرہ۔

جو رسالے راست خواجہ صاحب سے منقول نہیں ہوئے بلکہ کچھ عرصہ تک سینہ بہ سینہ چلے آئے اور بعد میں کسی نے ان کو نقل کر لیا اس طرح کے بھی دو تین رسالے دستیاب ہوئے ہیں۔ پرانے زمانے

میں اکثر کتابیں اسی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ چنانچہ "پرتھوی راج راسو" بھی اسی طرح تقریباً سینہ بہ سینہ محفوظ چلی آئی اور تصنیف کے تقریباً دوسو سال بعد ضبط تحریر میں لائی گئی[1]۔

ان رسالوں میں جو اب تک شائع ہو چکے ہیں سب سے پہلا رسالہ "معراج العاشقین" ہے۔ جسے مولوی عبدالحق نے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب فرمایا تھا یہ رسالہ تاج پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا تھا اس لیے اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اس رسالے کی تصنیف کا سنہ متعین طور پر معلوم نہ ہو سکا لیکن مولوی عبدالحق صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ ۸۰۱ھ یا اس کے لگ بھگ کی تصنیف ہے۔ اسی سنہ کو احسن مارہروی نے بھی صحیح مان لیا ہے لیکن نصیرالدین صاحب ہاشمی نے معراج العاشقین، سہ بارہ اور ہدایت نامہ کا ۸۱۵ھ تا ۸۲۵ھ کا درمیانی زمانہ بتایا ہے لیکن میرے خیال میں یہ ۸۰۱ھ سے قبل کی یعنی آپ کے قیام دہلی کے زمانہ کی تصنیف ہے۔ اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

- سب سے پہلا ثبوت اس رسالے کی زبان ہے جیسا کہ ڈاکٹر زور بھی اپنی تصنیف "اردو شہ پارے" حصہ اول میں لکھتے ہیں۔

  "یہ قدیم دکھنی سے مختلف ہے اس کی صورت کھڑی بولی سے زیادہ متاثر معلوم ہوتی ہے"[2]۔

چنانچہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"وہ درحقیقت کسی شمالی ہند کے باشندے کی تحریر ہے اور بہت ممکن ہے کہ بندہ نواز ہی اس کے اصل مصنف ہوں"۔

اس کا موضوع خواجہ صاحب کے قیام دہلی کی تصانیف کی طرح کا "تصوف" ہے۔

معراج العاشقین | یہ تصوف کے نکات اور رموز پر مشتمل ہے۔ قرآن اور حدیث کی مدد سے اس رسالے کے ذریعہ متصوفانہ مسلک کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون پرتھی راج راسا، از پروفیسر محمود شیرانی، اورنٹیل کالج میگزین۔
[2] "اردو شہ پارے" صفحہ (۲۰)

پانچ تن۔ واجب الوجود۔ ممکن الوجود۔ ممتنع الوجود۔ عارف الوجود۔ اور ذکر جلی ذکر خفی ذکر سری کے ذریعہ انسانی زندگی کے معراج یعنے ذاتِ وحدت الوجود تک کس طرح رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کو سمجھایا ہے۔ عروج صوفیا کی اصطلاح میں مقام وحدت تک پہنچنے سے مراد ہے۔ یہاں سالک عالم "اجساد" کو مٹا کر عالم "مثال" جا پہنچتا ہے۔ پھر وہ عالم مثال سے بھی آگے عالم ارواح میں جاتا ہے اس کی آخری منزل عالم "اعیان" ہے جس کے بعد وہ "واحدیت" اور "وحدت" کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے۔ عروج کی آخری حد تک "نورِ محمد" ہے اور سالک کی رسائی وہیں تک ہے۔ البتہ پیغمبر علیہ السلام احدیت اور واحدیت کے درمیان "برزخ" کی مانند ہیں۔

"عشق[1]" بھی تصوف کی خاص اصطلاح ہے۔ چنانچہ "صوفیا" خدا کی ذات کو مجسّم عشق "سمجھتے ہیں۔ حضرت داؤد کے استفسار پر خدا نے فرمایا:

"کنت کنزاً مخفیا فحببت ان عرف فخلقت الخلق"

(میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا مجھے اپنے اظہار کی خواہش ہوئی تو میں نے اپنے سمجھنے کے لیے یہ دنیا پیدا کی)

"من لگن[1]" کے مصنف بحری لکھتے ہیں:

یہ نقش اگر نہ چلملاتا　　کیوں کھول کواڑ بہار آتا

رہتا نہاں اپنی بھاری مَیں　　آپس کی قدیم کوٹھری میں

چنانچہ پہلا باطنی اظہار "ذاتِ محمدی" میں ہوا۔ جو بعد میں خدا کا محبوب بنا اس طرح محمد کا نام "حبیب اللہ" (خدا کا محبوب) ہوا۔ "اعیان" اور "ارواح" بعد کے تنزلات کے مدارج میں۔ پہلا درجہ "محبت" یا "عشق" کو حاصل ہے۔

"عشق کی دو صورتیں ہیں جلال اور جمال ذاتِ محمدی کا ادنیٰ اظہار "جمال" ہے۔ یہاں وہ "ہادی" (رہنما مرشد) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ "مضل" (یعنی ضلالت میں پڑا ہوا گمراہ) یا ابلیس "جلال" کا مظہر ہے۔

---

[1] من لگن مطبوعہ مدراس۔

حقیقت محمدی کا ظہور جس کو "روح اعظم" بھی کہتے ہیں پہلے عالم مثال میں ہوا پھر عالم ارواح و اجساد میں۔

"معراج العاشقین" سے مراد عاشق کے (محمد کے ذریعے) خدا تک پہنچنے کے ہیں۔ محمد کے ذریعے یعنی شریعت کے ذریعے اس لیے خواجہ صاحب حقیقت کے ساتھ شریعت کے مسایل بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ اس واقعہ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

کنت کنزا مخفیا ماحبت ان عرف مخلقت الخلق "

اس کا معنا دریائے قدیم سے برابر اٹھا اسے محمد کا نور بولتے ہیں۔ اس میں اپس کون دیکھیا سو خالق ہوتے خلق کون اظہار کیا۔

قولہٗ تعالیٰ

" اول ماخلق اللہ نوری" اس کا معنے اے محمدؐ سب خلق کون تیرے نور سوں پیدا کیا ہوں اس روشنائی میں اپنی تصویر دیکھا سو دونوں عالم نورانی یعنی نورانی سو ابوالارواح ہوا روحانی سو ابوالاجساد "۔ لہ ۔

" توحید کے دریا میں ٹھیرنا ذکر خفی کے محل ہیں وحدہٗ لاشریک لہٗ کی نیند لینا، اس جا گا کا حال پیغمبر علیہ السّلام کے سو معلوم کرنا" ۲ہ

خواجہ صاحب کے نزدیک "طریقت" یہہ ہے۔

" ذکر قلبی کر شریعت کے کانسے میں پیلانا نرگن ہوا تو ممکن کا درد جائے گا جو پانی میں ماٹی پانی میں پانی آگ میں پانی پانی میں بارا پانی میں خالی پانچ عناصر الکا ممکن الوجود یو جا تو طریقت تمام ہوا "۔ ۳ہ

" ذکر قلبی" یعنی خدا کے نام کا ورد اس طرح کیا جائے کہ سالک اپنے آپ کو فانی محسوس کرے اور اس حد تک خدا کا تصور کرے کہ خدا اس کی ذات میں مستور معلوم ہو۔

لہ معراج العاشقین صفحہ ۱۴ مطبوعہ تاج پریس ۲ہ معراج العاشقین صفحہ ۱۳
۳ہ معراج العاشقین صفحہ ۱۲

پانچ عناصر ہوا۔ پانی۔ خاک۔ آگ کی تشریح یوں کی جاتی ہے۔:

ہوا۔ خدا کی سانس ہے۔ چنانچہ حدیث ہے لَا.....

"ہوا کو برا مت کہو کیونکہ ہوا خدا کی سانس ہے"

آگے چلکر لکھتے ہیں، خدا فرماتا ہے۔ ہم نے اس کو انسانی جسم کی خلا میں بھرا۔۔ پانی سے مراد "بحرا لمسجور" وہ دریا ہے جو عرش سے پرے ہے۔ "آگ" سے مراد وہ نور یا روشنی جو قلوب کو منور کرتی ہے یعنی مرید کو اس درجہ استغراق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے عناصر کو بھول کر ان عناصر میں مل جائے۔ (پوری کتاب اس قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہے)

خواجہ صاحب کا دوسرا رسالہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۲۔ سہ پارہ اور نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ یہ رسالہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ نواب عنایت جنگ (حیدرآباد دکن) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ رسالہ بھی ابتدائی دور کے اکثر مذہبی رسالوں کی طرح سوال وجواب کی شکل میں لکھا گیا ہے۔

سوال۔ ذاتی ایمان کونسا اور صفاتی ایمان کون

جواب۔ اکھنڈ احال ثابتی ہے سو ذاتی ایمان وہ ہے ثابتی آتی اور جاتی ہے سو صفاتی ایمان۔

سوال۔ ایمان کے جھاڑاں کیا اور ایمان کے ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا اور ایمان کا سر کیا اور ایمان کا جیو کیا۔

جواب۔ ایمان کا جیو قرآن ایمان کی جڑ توبہ ایمان کی ڈالیاں سو بندگی ایمان کی پات پرہیزگاری ایمان کا تخم سو علم ایمان کا پوست سو شرم ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے"۔ [۱]

اس رسالے کی زبان بھی معراج العاشقین کی زبان کی طرح فارسی عربی آمیز کھڑی بولی ہے۔

---

[۱] "اردو شہ پارے" صفحہ (۳۲۰)

(۳) "ہدایت نامہ" اس رسالے کو ڈاکٹر عبدالحق[1] صاحب اور حکیم شمس اللہ قادری[2] صاحب نے خواجہ صاحب کی تصنیفات میں شامل کیا ہے۔ اس رسالے کا صرف نام ہی ملتا ہے نہ تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور نہ حکیم شمس اللہ قادری کسی نے بھی اس کی تفصیل نہیں لکھی۔ ڈاکٹر زور اور نصیرالدین ہاشمی صاحب کی تصانیف میں اس رسالے کا تذکرہ بھی نہیں ملتا۔ مجھے بھی یہ رسالہ کسی کتب خانہ میں دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لیے اس کا اقتباس اور تفصیلی نہیں دی جا سکی۔

(۴) "ہشت مسائل" ایک اور رسالہ آپ کا مصنفہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس رسالے کا ذکر صرف ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے کام" میں کیا ہے[3] کسی اور نے اس کا حال نہیں لکھا۔ خود ڈاکٹر عبدالحق نے بھی اس کی کچھ تفصیل نہیں دی ہے۔

(۵) "ہفت اسرار" اس رسالے کا ذکر حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور نے خواجہ صاحب کی مصنفات میں کیا ہے۔ اس رسالے کا کچھ حال پچھلے باب میں گزر چکا ہے۔ یہ رسالہ بھی مجھ کو دستیاب نہ ہو سکا۔ حکیم شمس اللہ قادری کے خیال میں یہ رسالہ اب ناپید ہے۔

مذکورہ بالا رسالے وہ ہیں جن کا تذکرہ اور جن کی تفصیل پچھلے محققین کی تصانیف سے ملتی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور رسالے مجھے اس مقالے کی تدوین کے سلسلے میں مواد کی تلاش کے دوران میں ایسے دستیاب ہوئے ہیں جو خواجہ بندہ نواز کے نام سے منسوب ہیں:

۱۔ خلاصۃ التوحید ۲۔ شکار نامہ

۳۔ تمثیل نامہ ۴۔ دارالاسرار

۵۔ تلاوت المعراج ۶۔ وصیت الہادی

۷۔ رسالہ تصوف

لیکن ان رسالوں کی چھان بین کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ ان تمام رسالوں کو خواجہ صاحب کی اصل تصانیف نہیں مانا جا سکتا کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ

---

[1] دیباچہ معراج العاشقین صفحہ (۷)، [2] اردوئے قدیم صفحہ ۴۱
[3] اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ (۳۶)

ان کے ملفوظات ان کے مریدوں نے جمع کیے ہیں۔ خواجہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں لکھتے تھے، بلکہ کاتب (مستملی) سے لکھواتے تھے[1]۔ ایک آدھ رسالہ بھی ہے جو شاہ میران جی شمس العشاق اور شاہ برہان کے زمانے میں ان کے معتقدین نے بعد میں لوگوں کی زبانی سن کر قلمبند کیا۔ خواجہ صاحب کے رسالے کی چند عام خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ دکھنی کے اثر کے ساتھ کھڑی بولی کے بھی کافی اثرات ملتے ہیں۔ کیونکہ خواجہ صاحب کی عمر کا کافی حصّہ دہلی میں بسر ہوا۔

۲۔ ان رسالوں میں عربی فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں بے تکلفی سے استعمال کی جاتی رہی ہیں۔

۳۔ ان کے جملوں کی ساخت پر بعد کے چند رسالوں جیسے شاہ میران جی یا شاہ برہان الدین کے ابتدائی رسالوں کے مقابلے میں جن پر دکھنی کا اثر زیادہ ہے زیادہ صاف ہے۔

خلاصۃ التوحید خواجہ صاحب کے پچھلے تمام رسالوں میں "معراج العاشقین" کے بعد یہی وہ مستند رسالہ ہے جس کے متعلق خواجہ صاحب کی تصنیف ہونے کے بارے میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خواجہ صاحب کے سلسلے کے خاص بزرگوں یعنی میران جی شمس العشاق اور امین الدین اعلیٰ کے سلسلے کے بزرگ شاہ صدرالدین ذاکر کے رسائل کے ساتھ دستیاب ہوا ہے۔ شاہ صدرالدین، بندہ نواز کے تیسرے سلسلے کے خلیفہ اور شمس العشاق میراں جی کے معاصر تھے اور یہ رسالے خواجہ بندہ نواز سے لیکر شاہ صدرالدین ذاکر کے سلسلے کے مختلف بزرگوں کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالہ مرتب کو اس مقالے کے نگران جناب پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا۔ جو موصوف کو شاہ صدرالدین ذاکر کے سلسلے کے ایک بزرگ کے خاندانی کتب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔ جسے انھوں نے نقل کرلیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے شاہ صدرالدین کے ایک اور رسالے "مرآۃ الاسرار" کو اپنے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ طبع بھی فرمادیا ہے۔ نیز ان کی اور دو تصانیف "مصباح النور" اور "مفتاح النور" بھی موصوف کے

---

[1] خاتمہ۔ مرتبہ عطا حسین مقدمہ ص ۱۷

کتب خانہ میں محفوظ ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ اسی بیاض میں خواجہ بندہ نواز اور اگلے اور پچھلے اکثر ایسے بزرگوں کا ذکر ہے۔ جو اُردو کے شاعر یا مصنف گزرے ہیں جن میں سے بعض کے کارناموں پر اسی مقالے کے صفحات میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور ان کا شجرہ درج ہے۔ اس لیے یہ مناسب نظر آتا ہے کہ اس شجرہ کو یہاں نقل کیا جائے۔

شجرہ

۱۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید حمید اللہ شاہ حسینی چشتی فیاض العالمین قدس اللہ سرہٗ مدظلہ العالی
۲۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شاہ سعادت علی چشتی
۳۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شاہ حیدر چشتی
۴۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شاہ محمد بخش چشتی
۵۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ مرتضیٰ حسینی چشتی
۶۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ امین الدین علی شیرِ خدا چشتی
۷۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شمس المحققین شاہ برہان الدین چشتی
۸۔ الٰہی بحرمت حضرت خواجہ شاہ میران جی شمس العشاق
۹۔ الٰہی بحرمت حضرت شاہ کمال الدین سرمست بیابانی
۱۰۔ الٰہی بحرمت حضرت شاہ جمال الدین عبداللہ مغربی
۱۱۔ الٰہی بحرمت حضرت صدر الدین ابوالفتح ولی الاکبر الصادق سید محمد یوسف الحسینی الملقب گیسودراز بندہ نواز قدس سرہٗ۔
۱۲۔ الٰہی بحرمت حضرت ابراہیم الثانی حمید الملت والدین محمود اودھی چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
۱۳۔ الٰہی بحرمت حضرت سلطان العاشقین رحمۃ العالمین خواجہ نظام الدین بدٰانی۔
۱۴۔ الٰہی بحرمت حضرت فریدالدین گنجشکر۔ اجھودنی۔
۱۵۔ الٰہی بحرمت حضرت قطب الدین وکیل الباب الاوشے چشتی
۱۶۔ الٰہی بحرمت حضرت معین الدین حسن سنجری چشتی

۱۷۔الٰہی بحرمت حضرت ابوالانور عثمان ہارونی
۱۸۔الٰہی بحرمت حضرت حاجی شریف زندانی چشتی
۱۹۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی
۲۰۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ناصح الدین احمد چشتی
۲۱۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ناصر الدین ابویوسف چشتی
۲۲۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ قدوۃ الدین ابومحمد چشتی
۲۳۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابواسحاق چشتی
۲۴۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابوابراہیم ممشاد علو دینوری
۲۵۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ امین الدین ابوہبیرۃ البصری
۲۶۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید بدرالدین حذیفۃ المرعشیؒ
۲۷۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ امان العرض سلطان ابراہیم ادھم بلخی
۲۸۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابوالفضل فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ عنہ
۲۹۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابوالفضل عبدالواحد بن زید رحمتہ اللہ عنہ
۳۰۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابوالفضل ابوالنصر حسن بصری رضی اللہ عنہ
۳۱۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابوالفضل ابوالحسن علی ہاشمی علیہ الصلوٰۃ والسلام
۳۲۔الٰہی بحرمت حضرت خواجہ انبیا ابوالقاسم ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

صدرالدین نام کے دو بزرگ گزرے ہیں۔ ایک خواجہ صاحب کے معاصر جن کا مزار ایکت پوری (ضلع ناسک) ہیں۔ ان کا سنہ انتقال "برکات الاولیا" کے مصنف کی رو سے ۸۷۶ھ ہے۔ دوسرے بزرگ خواجہ صاحب کے خلیفہ تھے جن کا انتقال ۹۸۹ھ میں ہوا۔ ان کا مزار بڑودہ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے[۱]۔ دراصل ان کا نام محمد بن شمس الدین تھا۔ وہ گجرات کے

---

[۱]۔ ملاحظہ ہو برکات الاولیا صفحہ ۸۱ نیز تذکرہ اُردو مخطوطات جلد اول۔

کاملین میں سے تھے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے پچیس تیس برس کی عمر میں ترک دنیا کر کے تجرید و تفرید اختیار کی تھی۔ ۹۵۲ھ میں احمد آباد آ کر محمد غوث گوالیاری سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ان کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ کئی سال تک مرشد کی خدمت میں رہ کر بعد "جواہر خمسہ"[1] کے عامل ہوئے۔ شہر مندو میں عرصہ تک چلّہ کش رہے تھے۔ ان کے مریدوں میں شیخ جمال شاہ صادق حسینی، شیخ محمود وغیرہ باکمال بزرگ گزرے ہیں۔

خلاصۃ التوحید صدرالدین ہی کے قلمی رسائل کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ کل انیس[19] رسالے ہیں جن میں ایک کے سوا سب رسالے اُردو نظم و نثر میں ہیں۔ دو تین اس سلسلے کے بزرگوں کے شجرہ ہیں جن میں دو آنحضرت سے شروع ہو کر تینتیس واسطوں سے حمید اللہ حسینی تک پہنچتے ہیں۔ یہ شجرہ آگے نقل کیا گیا۔ اس میں وہ سارے بزرگ آ گیے ہیں جن کی اُردو تصانیف کا تذکرہ ان اوراق میں ملے گا۔ یہ بزرگ خواجہ بندہ نواز کے خلفا میں ہیں جن کا سلسلہ شاہ امین الدین اعلیٰ یا علی تک پہنچتا ہے۔ اس جلد میں ۱۹ رسالے ہیں۔ پہلے دو رسالے تصوف کے ہیں۔ لیکن مصنفین کے نام نہیں ہیں۔

تیسرا رسالہ مفتاح النور منظوم ہے اس کے مصنف صدرالدین ذاکر ہیں۔

پانچواں رسالہ بھی تصوف کا ہے جس کے مصنف کا نام نہیں ہے۔

چھٹا رسالہ خلاصۃ التوحید حضرت خواجہ بندہ نواز کا ہے۔

ساتواں رسالہ تصوف میں ہے اس کے مصنف کا بھی نام نہیں معلوم۔

آٹھواں شجرہ ہے۔

نواں رسالہ شاہ امین الدین اعلیٰ کا ہے۔

دسواں شاہ برہان الدین جانم کے ارشادات پر مشتمل ہے۔

گیارھواں کمال الدین شاہ کا ارشاد نامہ ہے۔

---

[1] چنانچہ رسالہ "مراۃ الاسرار" اسی کی (جواہر خمسہ کی) تشریح ہے۔

بارھواں رسالے کے مصنف کا نام نہیں۔

تیرھواں رسالہ مراۃ الاسرار شاہ محمد صدرالدین کا نثر میں ہے۔

چودھواں شجرہ ہے اور

پندرھواں مصباح النور شاہ محمد صدرالدین کی تصنیف ہے۔

سولہویں سے انیس ویں تک فارسی رسالے ہیں۔

گیارہواں رسالہ ارشادنامہ کمال الدین شاہ کے نام سے موسوم ہے۔ غالباً یہ وہی کمال الدین ہیں جو شاہ میراں جی شمس العشاق کے پیر تھے اور جمال الدین عبداللہ مغربی کے خلیفہ تھے۔ اور جمال الدین خواجہ بندہ نواز کے خلیفہ ہیں۔ رسالے کے سرنامہ پر صاف طور پر یہ عبارت لکھی ہے۔

"ایں رسالہ خلاصۃ التوحید تصنیف حضرت خواجہ بندہ نواز"

یہ رسالہ بھی خواجہ صاحب کے اور رسالوں کی طرح تصوف کے نکات پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوف کے بعض اسرار کی تشریح کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح "نو بطوں" سے کائنات کا ظہور ہوتا ہے۔ نیز "حقیقت محمدی" [۱] یا اسم اعظم کیا ہے۔ نو بطوں [۲] کی تفصیل صوفیا اس طرح کرتے ہیں۔ :

ہستی مطلق	ہستی مجمل	ہستی مفصل
۱۔ امین دیکھ	۱۔ روح مقیم	۱۔ روح جاری
۲۔ امین شاہد	۲۔ انا نور	۲۔ من نور
۳۔ امین نور	۳۔ ممکن الوجود	۳۔ واجب الوجود

اس کی تشریح خواجہ صاحب خلاصۃ التوحید میں یوں کرتے ہیں :

"امین دیکھ" بولتے ہیں جس وقت دکیھ تصرف نہیں آیا تھا۔" ادیکھ بھی بولتے

---

[۱] اس کی تشریح معراج العاشقین میں کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو مقالہ ہذا صفحہ (   )

[۲] "نو بطوں" نامی ایک رسالہ سید شاہ میراں جی چشتی سے بھی منسوب ہے اس رسالے میں نو بطوں کی تشریح اسی طرح کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے صفحہ (   ) مقالہ ہذا۔

ہیں۔ ہور اسیچ بولتے ہیں بیچ گنج مخفی کے دو صفتوں سون تھا۔" ایں دیکھ "
"ایں شاہد" دیکھ ذات شاہد صفات "ایں نور" مصدر دونوں کا اُس
مصدر کے تیئں حقیقت محمدی بولتے ہیں۔ ایں دیکھ ذات نے بیچ آئینہ ایں شاہد
صفات کی دیکھا یعنی دیکھتا پنا سوچ نور دستا پنا سوچہ شاہد دستے پنے میں
دسیا سوچہ روح مقیم ہے۔

"خلاصتہ التوحید" کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے :

"کنت کنزا" مخفی کے حال کون ذات صفات ذات لا بشرط لا بہ شرائط
ولاتعین غیب الغیب وجود البحت مجہول انصت مین اس کا نور.......

ذات بلا اعتبار ہور مرتبہ ہویت بولتے ہیں اور بھی ناما بھوت ہیں ہور
اس استطلاحات کون اولیائے کامل و محققان واہل بیچ اصطلاح وکن کے
اس حال کا ناون ایں دیکھ بولتے ہیں ہور اسیچ بھی بولتے ہین جس وقت
دیکھ تھرف مین نین آیا تھا۔ اوسے ادیکھ بھی بولتے ہیں۔ ہور اسیچ بھی بولتے
ہین بیچ کنج مخفی کے دو صفتوں سون ہتا۔ ایں دیکھ ایں شاہد دیکھ ذات
شاہد صفات ایں نور مصدر دونوں کا اوس مصدر کے تیئں حقیقت محمدی
بولتے ہیں ایں دیکھ ذات نے بیچ آئینہ ایں شاہد صفات کی دیکھا یعنے
دیکھتا پنا سوچ نور دستا پنا سوچ شاہد دستے پنے بن دسیا سوئچ
روح الروح مقیم یعنی بیچ آئینہ دستے پنے کے اپنا چہ عکس دسیا سوچہ روح
مقیم ہے۔ ایں دیکھ کی سب ہیں یونین شکل پیدا ہوئی یعنی نور شہود روح بعد
اس کی ایں شاہد نی بیچہ آئینہ ایں دیکھ کی دیکھیا سو ایں نور نظر آیا۔ یعنی
دستے پنے کون دیکھتے پنے مین معلوم کر کر انا نور کہا۔ یعنی دستا پنا بھی بھنچہ
ہور دیکھتا پنا بھی بھنچہ اس حال کون انا نور بولتے ہین بعد اس کی روح مقیم
نے انا نور کون دیکھیا سو روح جاری ہوا یعنی او عکس اصلی جو قایم تھا بیچہ دستے

پنے کے یعنی دسنے کی جس میں آیا سو شکل نی بیچ آئینہ دستے پنے کی معلوم نہیے ہین
آپ کون آپ دیکھیا ہوں کر دیکھ میں دیکھ پیدا کیا سو اوس دیکھ کا ناون بیچ
جاری ہے جیسا کہ خواب سون ہشیار کیا اما او ہشیار ے عروج کی نسبت مین خواب
ہے۔ یعنی مجمل کی حال سون مفصل کی حال میں پیدا کیا اوس مفصل کون مجمل کرنا
بھوت دشوار ہوا بعد اس کی انا نورنی روح جاری کو دیکھیا سو من نور کی شاہدی
پیدا ہوئی یعنی دیکھیا پنا بھی سینچہ دستا پناہی سینچہ دستے پنے میں دیسا سو بھی سینچہ
ہون کر کر شاہدی پیدا ہوئی سو حال کون من نور بولتے ہیں یعنی انا نور کی حال مین
سینچہ نور دستا پنا ہوان سینچہ دیکھتا سیا ہون۔

تمثیل نامہ یہ رسالہ چودہ صفحات پر مشتمل ہے اور مجھے بیجاپور میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے سلسلے کے بزرگ شاہ امین الدین اعلیٰ کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ اس کے ساتھ خواجہ صاحب کے دو اور فارسی رسالے مصابیح القلوب اور تلاوت الوجود بھی منسلک ہیں
تمثیل نامہ کا موضوع اخلاق و ہدایت ہے۔ زبان نسبتاً سہل اور طریقہ بیان بھی عام فہم ہے۔ اس کی وجہ ممکن یہ ہو کہ اس میں تصوف کے عوامی اور دقایق کی بحث نہیں ہے۔

اس رسالے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ مال جاہ و دولت ناپائیدار اشیاء میں قایم رہنے والی ذات صرف باری تعالیٰ کی ذات ہے۔

زبان کے اعتبار سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسالہ "معراج العاشقین" کے بعد لکھا گیا ہوگا کیونکہ اس میں عربی فارسی الفاظ کم اور دکھنی عنصر زیادہ ملتا ہے۔

تمثیل نامہ کا اقتباس حسب ذیل ہے:

" علم پر پایا ہون کر یون مستی بکریا ہے تو یو مستی فنا ہے نعم مستی پادشاہی کا بین
پادشاہ ہوں منجی کیا ہوا ہے۔ کر یو مستی بکریا ہے تو یو مستی فنا ہے سا تو مستیاں
فنا ہے اللہ کی ذات کی ستی بقا ہے۔ اول حب ذات کا ذات سوا اللہ کا بقا ہے
دوم "ہشت" جانیا نکا سو یو جانیا اپنی پر کی خدا کی خدائی ہے۔ جو لک تو الک بوجا

نیات بقا ہے سوم ہب خوبصورتی کا کہیں ین ہماری تن میں ایک عالی صورت ہیں نورانی تن کی ممکن الوجود سورت (صورت) بقا ہے۔ چہارم حب ہنر کا سو محمد کا کہ اپنی پچھانت کرنا ہور خدا کی پیچانت کرنا دوسرا تن ممکن الوجود)۔
اس میں تمثیل کے ذریعے خدا کی حقیقت سمجھائی گئی ہے۔ جو خواجہ صاحب کے بیان کی خاص خصوصیت ہے۔

" اندھاری رات میں جون گھران (گھراد) باراں میں دستی تیون کرنا سو بات حقیقت بھی اس اندھاری میں واجب ہور ممکن دستی تین "

تلاوت المعراج

یہ رسالہ سالار جنگ کے کتب خانے کے ایک مجموعہ میں منسلک ہے، جس کا نام "چہاردہ رسائل" [1] ہے۔ "چہاردہ رسائل" کے سرورق پر "رسالہ جات بندہ نواز" [2] لکھا ہوا ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ چودہ کے چودہ رسالے خواجہ صاحب کی تصنیف ہیں لیکن مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوائے چار رسالوں کے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ باقی رسالے دوسرے مصنفین کے ہیں ان میں شیخ ابوالحسن خرقانی کی فارسی تصنیف "چہار پیر و چہار خانوادہ" اور بوعلی قلندر پانی پتی کا ایک فارسی رسالہ تصوّف بھی شامل ہیں۔ ایک رسالے سے جس کا عنوان "شرح کلمۂ طیب دکھنی" ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خواجہ صاحب کے کسی مرید کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں مصنف نے جگہ جگہ گولکنڈہ کے والی قطب شاہ کا ذکر کیا ہے اور جگہ جگہ اپنے مرشد خواجہ بندہ نواز کے اقوال کا حوالہ دیا ہے۔ مجموعہ میں چند دکھنی نظمیں بھی شامل ہیں یہ رسالہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی مذکورہ بالا قلمی بیاض میں بھی منقول ہے اور کمال الدین شاہ کے نام سے منسوب ہے۔ ان پر آیندہ صفحات میں بحث کی گئی ہے۔

جو رسالے خواجہ صاحب سے منسوب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ تلاوت المعراج ۲۔ رسالہ تصوف ۳۔ شکار نامہ

---

[1] نمبر مخطوط صفحہ ۲۱۲ فہرست کتب خانہ سالار جنگ [2] فن تصوف صفحہ ۶۲۱ فہرست کتب خانہ سالار جنگ

"تلاوت المعراج" کا ایک اور نسخہ علحدہ رسالے کی شکل میں سالار جنگ کے کتب خانے میں ہی محفوظ ہے۔ دونوں نسخوں کی عبارت ایک ہے۔ دوسرے نسخے پر بھی "تلاوت المعراج" تصنیف بندہ نواز درج ہے "تلاوت المعراج" کا انداز بیان اور موضوع خواجہ صاحب کی دوسری تصانیف سے بہت مشابہت رکھتے ہیں خواجہ صاحب کے اکثر رسالوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مخاطب کو اکثر اے عزیز سے متوجہ کرتے ہیں اس رسالے میں بھی تصوف اور اخلاق کے مسائل آسان زبان میں سلجھائے گئے ہیں ایک شعر جو "معراج العاشقین" میں درج ہے اس رسالے میں بھی نقل کیا گیا ہے شعر یہ ہے۔ ع

طبیب عشق را دکان کدام است
علاج جان کند او را چہ نام است

اس رسالے کے خواجہ صاحب کی تصنیف ہونے کا ایک مزید ثبوت یہ بھی ہے کہ خواجہ صاحب نے عبدالقاہر سہروردی کی مشہور تصنیف "آداب المریدین" کی شرح کی تھی۔ اس کا ذکر خواجہ صاحب کی تصنیفات کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ "آداب المریدین" کے فقرہ (۹۷) میں بتایا گیا ہے کہ مرید پر لازم ہے کہ وہ نفس کے اخلاق و عادات بدلنے کی کوشش کرے اصل عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے

فرمایا' مرید پر لازم ہے کہ نفس کے اخلاق و عادات بدلنے کی کوشش کرے یعنے معتدل بنائے۔ اخلاق ذمیمہ جیسے غرور۔ مکر۔ کھوٹاپن۔ حرص۔ آرزو حسد خود نمائی۔ باہم جھگڑا کرنا۔ غیبت کرنا۔ ایک شخص کو دوسرے کے خلاف بھڑکانا۔ بدگمانی۔ بے حیائی وغیرہ ہیں۔ ان کو اخلاق حمیدہ کے ساتھ جو ان کی بالکل ضد ہو بدل دیا جائے۔ [۱]

اس کو وہ اُردو میں "تلاوت المعراج" میں یوں بیان کرتے ہیں :

: اے عزیز ؛ دارو دکھا کر حکیم منع کیا سو پرہیز کرنا اس کا پرہیز ہوے تو

---

[۱] انتخاب "آداب المریدین" مترجمہ حافظ عطا حسین صفحہ ۱۶

خوب سن دل کی کان سوں ہور یاد رکھ اول وسواس دوم کینہ سوم کبر چہارم
بغض پنجم غضب ششم حسد۔ ہفتم عذر۔ ہشتم حرص۔ نہم ہوس دہم طمع۔
یازدہم بخیلی۔ دوازدہم غصہ۔ سیزدہم مغروری۔ چہاردہم حرام۔ پانزادہم فسق۔
شانزدہم فاحشہ ہفدہم عنانیت (انانیت) ہیجدہم تکبری۔ نوازدہم غیبت۔
بیستم خلاف۔ بیست و یکم چغلی۔ بیست دوم۔ عداوت۔ بیست و سوم
شرک۔ یہ سب چیزاں کوں یہ بات بولتے ہیں۔ انکوں پرہیز کرنا مراقبے کے
کونے بندنا :۔

"تلاوت المعراج" کا کچھ اور اقتباس درج ذیل ہے :

:۔ دنیا کے دھوکے سو چھوٹکارا ہوویگا یوں پانچھ تن ہے پانچ نفس ہے
پانچ دل ہے پانچ روح پانچ منزل ہے پانچ فرشتے ہے ہر ایک تن پہ پانچ علت
ہے اوسے داروان (دوائیں) ہے اسے موشیب سوں بہتارا کامل حکیم ہوناہی
پانچ تن بوجیا فرض ہے۔ پہلا تن واجب الوجود ہے اس کا مقام شیطانی
باٹ شریعت ذکر جلی نفس امارہ اس کا دسنک عقل و قیاس فرشتہ موکل میکائیل
شہادت مبدا منزل ناسوت روح حیوانی یعنی سفلی انا یعنی واجب کے انکھاں
یوں غیر دیکھا اور حرص کے کاماسوں فاغفر لنا سو جسد ناکسوں بدبوئی لیناسوں
بعض زبان سوں بدبولنا سو کینا شہوت کوں غیر جاگا خرچنا سو گیبر ایسے طبیب
کامل ہونا بغض (غالباً مرض) پہچاننا تب دارو دینا

" طبیب عشق را دکان کدام است
علاج جان کند او راچہ نام است "

ای عزیز ہر ایک درد کوں دارو جدا جدا دیتا اس کی دھات پوچ کر علاج کرنا سب آزار کوں
ایکچہ دارو دینا سو اوسی طبیب کم عقل نادان ہے۔
ای عزیز دارو دکھا کر حکیم منع کیا سو پرہیز کرنا اس کا پرہیز ہوی تو خوب سن دل کی کان

سون ہور یاد رکھ اول وسواس دوم کینہ..........
مراقبہ کے کونے بند نا شاہدے سے میکائیل کے ورد کے پانے سون اور جلیکار اگر کو بلانا سکے گا۔ کارگر دینا نرگس ہور تو شفا پاوے گا طبیب فرمائی پر ہیز کیے تو اپے طبیب ہوئے گا راست یوں مائی میں مائی پلے۔
تلاوت المعراج میں کب تک باتاں بندہ نواز ظاہر باطن فرمائی ہیں جو کوئی مالک جو کوئی سالک اس رسالہ کے خبر رکھ کر چلے گا تو او بھی سالک ہووے گا۔

رسالہ تصوف یہ رسالہ بھی سالار جنگ کے کتب خانہ میں چہاردہ رسایل میں بندھا ہوا ہے۔ اس میں مذہب اسلام اور ایمان کے مسائل کی وضاحت کی گئی۔ اس میں بھی خواجہ صاحب اکثر سامعین کو ای عزیز سے مخاطب کرتے ہیں۔،
اقتباس نیچے درج کیا جاتا ہے :

" قولہ تعالیٰ لقد منا اللہ علی المومنین انفسھم المومناۃ بعث فیھم رسول من انفسھم "
اوس کا معنا خدا خدا کہا مسلمان کو تمہاری وجود میں محمد کا نور رکھا ہوں سو تن میں اور جانو ہر ایک پر پچھانت کرنا واجب ہے نعمت خدا کیا ہے سو کرنا فرض ہے نہیں تو برا عذاب ہے نبی علیہ السلام کہے ہیں الاسلام علی خمسہ اس کا معنا یو ہی پیغمبر علیہ السلام کہے ہیں انسان کی بوجن کون کلمہ پانچہ طرہ (طرح) سو ہے۔
اول لا دویم الا سویم الا اللہ چہارم اللہ پنجم ہو۔
(یہ عبارت نسخہ معراج العاشقین، مخزونہ 'انجمن ترقی اُردو۔ علی گڑھ کے بھی آغاز کی ہے۔)
ای عزیز لا واجب پر ثابت کرنا اللہ ممکن پر ثابت کرنا لا اللہ ممتنع پر ثابت کرنا عارف پر ثابت کرنا ہور واحدین پر ثابت کرنا۔
ای عزیز محمد کو معراج کی قبر (خبر) دینے کی واسطے اپے جبرئیل ہو کر خفی میں اسو جل میں بندسو ہوشیار کر کے عرض کیے حضرت براق پر سوار الھئی "

پچھلے رسالوں کی طرح سویا "واجب الوجود" "عارف الوجود" اور "ممتنع الوجود" کی تشریح دوسرے انداز سے کی گئی ہے "معراج العاشقین" میں بھی اس کی تشریح ہے۔

شکارنامہ "شکارنامہ" نام کے دو مخطوطے دستیاب ہوئے دونوں کے مطالب ملتے جلتے ہیں۔ صرف عبارتوں میں اختلاف ہے ایک رسالہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں محفوظ[1] ہے۔ دوسرا رسالہ "یازدہ رسائل"[2] میں منسلک ہے جو کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں ہے۔

شکارنامہ میں ایک تمثیل کے پیرائے میں "معرفت" کی تعلیم دی گئی ہے۔ تمثیل یہ ہے۔
چار گھر ہوتے ہیں جن میں سے ایک گھر ٹوٹا یعنی ویران رہتا ہے۔ پہلا گھر شریعت دوسرا طریقت تیسرا حقیقت چوتھا معرفت کا ہوتا ہے۔ معرفت کا دروازہ بند رہتا ہے۔ البتہ اس گھر میں ایک محراب ہے جسے قبولیت کا محراب کہا جاتا ہے اس محراب میں ایک ہانڈی رکھی ہوئی ہے جسے عبودیت کی ہانڈی کہا جاتا ہے۔
جب اس ہانڈی کے کاڑنے (نکالنے) کے واسطے ہات انپڑ دیا (بڑھایا) جاتا ہے تو وہ ہاتھ میں آتی سو ایک پتھر ار کھا جاتا ہے جسے بینکا پتھر بولتے ہیں لیکن پانچ گز زمین نیچے کھودی جاتی ہے۔ جس میں پہلا گز ذکر جلی دوسرا گز قلبی تیسرا گز روحی اور چوتھا گز سری اور پانچواں گز خفی کا ہوتا ہے تب وہ ہانڈی ہاتھ آتی ہے۔

> " جلی۔ قلبی۔ روحی۔ سری۔ خفی تصوف کی اصطلاحیں ہیں مطلب یہ ہے کہ ان اذکار کے بعد معرفت نصیب ہوتی ہے یعنی ہانڈی ہاتھ آتی ہے "

جب ہانڈی کاڑی (نکالی) جاتی ہے تو اس میں سے عشق کی آگ میں پکا ہوا ایک ہرن نکلتا ہے جو کوئی اسے کھاتا لذت لیتا ہے۔ آخر ایک نے کہا "میرا حصہ دو" یہ میرا حصہ جو کوئی بولیا (بولا) اسے نفس شیطانی بولتے ہیں۔ بالآخر اس مانگنے والے

---

[1] نمبر سلسلہ کتب ۳۴۴۸۔ [2] کتب خانہ روضتین گلبرگہ نشان (۱۴۳) اس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ (   ) مقالہ ہذا۔

کو ایک ہڈی دی جاتی ہے وہ ہڈی بھی نیچے گر جاتی ہے جس سے خربوزے کا بیج نکلتا
ہے اس گوزر دآلو کی بیل لگتی ہے اس بیل کو بُجالی (بوجھی) الگ جاتی ہے۔ (یعنی کیڑا
اور دیمک) سواس کو عورت فرزند ہوتے ہیں اور دینوی بکھیڑا ان میں پھنس جاتا ہے"
مطالب گو ملتے جلتے ہیں لیکن ان دونوں شکارناموں کی عبارت الگ الگ ہے۔ چنانچہ کتب خانہ
روضتین کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

حضرت محمد حسینی فرماتے ہیں :

﴿ ارشاد کی ترتیب سون شکارنامہ نو باپ اور سات ماں کے ہم چہار فرزند تھے
تفسیر اس نو باپ کی یہ ہے یعنی اول باپ نور ذاتی دوم باپ نور محمدی سوم باپ
سر چہارم باپ روح پنجم باپ ضمیر ششم باپ فواد ہفتم باپ قلب ہشتم باپ
مضغہ نہم باپ تن یہ باپ ہیں۔ اور سات مایوہین یعنی اول نور دوسرا صفا
سیوم ماہوا چہارم ما بار پنجم ما نار ششم ما پانی ہفتم ما ماٹی اسے سات ما کہتے ہیں۔
اگر کوئی غلط کہیں تو دیکھو حضرت شاہ برہان صاحب اپنے کلمۃ الحقایق کیوں فرمائے
اور چہار فرزند یوہین یعنی اول فرزند عقل قیاس دوم فرزند عقل وہم سوم فرزند عقل گمان
چہارم فرزند عقل آگاہ، ان میں سکی اور ایک کو جامہ تین یعنی عقل قیاس ہی نیکی ہے۔
یعنی لکھتے ہیں کہ خدا کیسے چیز سر یکا ہے۔ یا مہتاب سر یکا ہے یا آسمان سر یکا ہے ﴾

مخطوطہ سالار جنگ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

شکارنامہ

﴿ نو با پانچ ہور سات مانوان کی ہمین چار فرزندان تین ننگی کپڑے
پھاٹے یکسکون کپڑے نین جسے کیری نین اس کے آستین میں پیسی تھی چارو
ملکو بازار کون گیئے او بازار چوبیس جنیان کا تھا اس میں چہار کمانان تھیان
تین توتیان یکسکون چلہ و گوشہ نہ تھا۔ سو کمانان کے وہان چہار تیر تھے تین توٹی تی
یکسکون میانہ و سوفار نہ تھا جسے میانہ و سوفار نہ تھا سو او تیر لیکر چلے جاتی
تھی وہاں چہار ہرن تھی تین موی یکسکون جیئو نہ تھا۔ جیسے جیو نہیں اس ہرن کو

میانہ چور سو فارنہ تھا سو تیر چلہ و گوشہ نہیں سو کمان کون جوڑ کر مار کر پاڑی بعد ازاں اوسے باندنے کے واسطے لیسری ڈھونڈی وہان چار لیسریاں تھیان تین تو ئیان یکسکون اپنے میانہ نہ تھا۔ سو اوس لیسری باندکر اوسے پکانے کے واسطے لے کر چلے وہاں چار کھونٹی تھی تین کھوٹی ایک محتاج نہیں اس گھر میں گیئے

روضتین کے کتب خانہ کے خاتمے کی عبارت درج ذیل ہے :

٭ چار ہرن ہین تین موئے اور ایک کو جی نہیں یعنی اول ہرن نفس امّارہ دوم ہرن لوامہ سویم نفس مطمئنہ یعنی یہ تین موئے اللہ کے یاد میں فعل بطرف غیر سون یہ تینوں سے گزرے یعنی موئے اور چوتھا نفس ملہمہ اوسے جی نین اوس طرفسون وہ خبر پہنچا نہارا ہے سو اوس خبر پہونچانے ہارے کو جی نین یعنی خودی نین۔ سو کیا سبب .....

ہور چار گز یعنی یوں ہیں اول گز شہادت مبدا دوم گز (گز) شہادت وجدا سوم گز شہادت حمدا چہارم گز شہادت شہدا یعنی دو تین گز یوں جان بوج کر اس تین سے ابھی گز کی ان کے ہونا چوتھا گز شہادت شہدا یعنی عاشق و معشوق مل ذوق لینے ایک کا تو جب اس چوتھی گز کو پہنچ کر اوس میں پینے کی ہانڈی کو جان لینے کے ہات سے نکالی اوس ہانڈی میں وحدانیت کے اکسون پکائی یعنی پختہ کیئے اور ایک مل کیے اور اوسے نور کے تیان میں نکالے اور چارون مل کر کھاتے تھے۔ یعنی اس نور میں خدا کی ذات کا ذوق لیتے تھے۔ یعنی لذت لیتے تھے یعنی جیون پھول میں باس یا جیون باس میں پھول یا جیون کانڈی میں یوں بولا اوسے روح القدس کہتے ہیں۔ یعنی وہ بندہ بولا کہ نفس دل روح سر انور ذات کہتے ہیں۔ سو وہ کنت پورا نہیں ہوتا یعنی بندہ کہتے ہیں تو کنت پورا نہیں ہوتا ہے۔ یعنی جہاں صاحب ہے۔ وہاں بندہ بھی اور جہاں ذات ہے وہاں صفات بھی تو صاحب کون کہنا اور بندہ کون جب اس واسطے بندہ کہا کہ مرا

بھی تقسیم دیو یعنی میری سمجھ کا ذوق ہے سولیون یعنی مجھے بھی ذوق دیو سواوسے ایک ٹی
دیئے یعنی الشریعت والجد الطریقت والجسم والحقیقت والقصام والمعرفت
کالمغز یعنی ہڈ حقیقت مغز معرفت ہے یعنی اوسے تحقیقی کا ہڈا دیئے یعنی اس
سون نہایت ہوا قول حضرت علی کرم اللہ وجہ من عرفہ نفسہ فقد عرف ربہ
اس کے ہاتھ سے ہڈ گرا یعنی تحقیقی کا ہڈ پایا سو خربوزے کا بیج ہوا یعنی ایمان کا بیج ہوا
بضوع وبسعون سبقۃ افضلہا قولہ لَا اِلٰہَ اِلّا اللہ وادناھا
اَمانت اِلّا ذا الحب ای سبقۃ سواوسے زرد آلو کی بیل ہوئی۔ اوس سے کلمہ
بیل ہوئی۔ سو اس بیل کو بجالی (بوجھی) لگی "سو نماز روزہ زکات حج احکام ارکان
یہ پھل لگے سو اونوں کو سب عالم نے کھائے یعنی علما فضلا شیخ مشائخ قاضی
قضات ان سب عالم نے کھائے یعنی عبادت کا یعنی نماز، روزہ، زکواۃ، حج کا
ذوق لیے اور عوام بھی اپنی قدر زوافق بندے کے کرتے ہیں۔ یعنی ہر ایک ناوان کا ذوق
لیتے ہیں یعنی کھاتے ہیں۔ سواونوں کا پیٹ پھوٹ گیا یعنی وہ لوگ ظاہر بندہ
گے کرتے ہیں سو یعنی محنت میں پڑتے ہیں اور معرفت کو نین پہنچے سو ان کا پیٹ
پھوٹ گیا ہے ؎

سالار جنگ کے کتب خانہ کے مخطوطے کے خاتمہ کی عبارت حسب ذیل ہے :

؎ وہاں چار گھر تھے تین تو ٹی ایک بتا نین سو چہار گھر اول گھر شریعت
دوم گھر طریقت سوم گھر حقیقت چہارم گھر معرفت سو بو معرفت کھولتا نین
ولی بتا ہے یون گھر حقیقت کا ہے اس معرفت کے گھر میں کہ گیے وہاں دیکھتے
ہیں تو ایک محراب تھا اُسے قبولیت کا محراب بولتے ہیں اس میں ایک ہانڈی تھی
اوسے عبودیت کی ہانڈی بولتے ہیں اس ہانڈی کاڑنے واسطے ہات انپڑای
تو ہات انپڑیا نین سو ایک پتھر ارکھے اس میں پینکا پتھر بولتے ہیں۔ اس پتھر کے
اوپر سوار ہوئی تو ہات نیئن انپڑیا، بعد ازاں پانچ گز (گز) زمین کھودی اول گز

جلی دوم گز قلبی سوم گز روحی چہارم گز سری پنجم گز خفی۔ پانچویں گز کواوتر کر عبودیت کی
ہانڈی کون کاری اس میں عشق کی آگ تھے پکائی سوملتا ہوں لطیف سون ملی احد
ذات کواوسے کھائی سولذتان لیتے تھے یکس نے بولیا میرا تقسیم دیو جو کوئی بولیا
اوسے نفسِ شیطانی بولتے ہیں اوسے دی ایک ہڈ اوس کے ہات میں سون اوہڈ
پڑیا سو خربوزے کا بیج ہوا سو طمع بولتے ہیں اوسے زرد آلو کی بیل ہوی سو پکا ملیا
اس بیں کون بجالی لگی سوا سے عورت فرزندان ہوی سوا دنیا کی گرفتاری میں پڑیا
سو پیٹ ہوگیا۔ حضرت بندگی مخدوم اپین انو تھے خیر یز ہوں ؏

روضتین کے مخطوطے میں ایک جگہ حضرت شاہ برہان کے کلمۃ الحقائق کی طرف بھی اشارہ کیا گیا
ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روضتین کا مخطوطہ حضرت شاہ برہان کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔
لیکن دونوں میں نہ صرف لوح پر بلکہ آغاز اور اختتام دونوں مقامات پر اس رسالے کے خواجہ بندہ نواز
کے ملفوظ ہونے کی طرف صریحاً اشارہ ملتا ہے۔

میں نے خواجہ صاحب کے تین طرح کے رسالوں کا اوپر تذکرہ کیا تھا۔ یہ رسالہ بھی عرصہ تک
سینہ بہ سینہ محفوظ چلا آیا بلکہ ان دونوں مخطوطات سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ یہ
کہ ان ملفوظات کے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کے دوران میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے اپنی طرف
سے بھی بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ اور بہ ضرورت دوسرے بزرگوں کے بھی متعلقہ اقوال بھی نقل کر دیئے
ہیں چنانچہ روضتین کے مخطوطے میں شاہ برہان کے اقوال کی طرف اشارے کا اس سے سوا اور کیا
مطلب ہو سکتا ہے۔

دارالاسرار ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانے میں اس نام کے دو مخطوطے محفوظ ہیں۔ ایک خواجہ
بندہ نواز سے منسوب ہے۔ دوسرے رسالے کے مصنف کے نام کا پتہ مرتب فہرست
کو نہ چل سکا۔ غالباً ترقیمہ اور آخری حصہ کی کسی عبارت کی بناء پر اوسے "مرید سلطان" کے نام سے منسوب
کر دیا گیا۔ سلطان نامی ایک شاعر گذرا ہے جو کرنول کا رہنے والا تھا۔ لیکن ان دونوں رسالوں کی عبارتوں
کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جزوی اختلافات کے سواء وہ بعینہ ایک ہی ہیں۔ مرتب فہرست

نے جو اقتباسات ان دونوں رسالوں سے نقل کیے ہیں وہ لفظ بہ لفظ وہی ہیں۔ ملاحظہ ہو دارالاسرار مخطوطہ نمبر (۱۷۰)[1] نیز دارالاسرار نمبر (۲۱۸)[2]۔

مجھے اس کا ایک اور مخطوطہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ جو کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں محفوظ ہے اس رسالہ کی عبارت مذکورہ بالا رسائل سے مختلف ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو کے مخطوطہ دارالاسرار میں سارے مسائل نو ابواب یا "نودر" پر منقسم کئے گئے ہیں لیکن روضتین کے کتب خانہ میں یہ تقسیم نہیں ہے۔ اور مقابلے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ ادارہ ادبیات اُردو کے دارالاسرار سے بالکل مختلف ہے۔ ادارہ کے مخطوطے میں ایک کے ترقیمہ سے خواجہ بندہ نواز کا ہونا ظاہر ہوتا ہے دوسرے نمبر (۲۱۸) میں ابہام ہے۔ روضتین کے مخطوطہ میں یازدہ رسائل ہیں۔ خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسالوں میں منسلک ہے۔

روضتین کے مخطوطے کے آغاز کی عبارت حسب ذیل ہے۔ :

؎ حضرت محمد حسینی فرماتے ہیں پیر کو اور پیغمبر کو اور خدا کو ایک ہیچ کر دیکھنی چاہیے، حضرت علی کہی عرفت ربی بربی و آیت ربی حضرت علی کہے ہیں پچھانا خدا کو خلایق ہیں دیکھا خدا کو یعنی مسلمان کی اڑ سے مسلمان ہے خدا کو پوچھتے یو بھائی بناد دیا ہے۔ ایک نے ایک پوچھیا افسوس تو کیا سنا المومن المھیمن یو ناون خدا کا ہے مومن سوالی پوچھیا مو ہیں یو دوسرے کو پوچھاتا تو خدا کہا میں پوچھتا ہوں کہ سر کو ہی پوچھاتا ہوں یو ناون خدا کا ہے خدای تعالیٰ اپی مومن ہے یعنی خدا کو پوچھتا ہے سو پیغمبر ہی پوچھے ہیں تو سالک ہی پوچھتا ہے۔ ؎

ادارہ ادبیات اُردو کے اس دارالاسرار کے آغاز کی عبارت جو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا گیا ہے حسب ذیل ہے :

؎ پہلا در کنت کنزاً مخفی فاحبت ان عرف فخلقت الخلق یعنے

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۲۰۱

[2] 〃 〃 〃 〃 ۲۶۱

آن سلطان اپنی دولت کی دریا میں چار راس گنج رکھا تھا بقا کے موتیوں سون بھر کر
اور اس حال میں یکایک اس گنج کی طرف نظر کیا اس موتیوں کا اجالا دکھ کر عاشق ہوا۔
مصلحت تجویز میں وہ جو لاج کے موتیاں چھپا کر رکھنا خوب نہیں بلکہ عاشقاں کے
بازار میں ظاہر کرنا بھلا ہے۔ واجب الوجود کی بات شریعت کا مقام نفس امارہ ہے
ذکر جلی زبان سے بولن اللہ تعالیٰ منع کیا سوئین کرنا اور پیر منع کیا سوئین کرنا سب سے
بہتر ذکر قلبی ہے اور اللہ محبت زیادہ رکھنا

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے "مرید سلطان" سے منسوب دارالاسرار کی عبارت بھی بعینہٖ وہی ہے جو
اس نام کے ایک سے زیادہ مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ فارسی اور زیادہ تر اُردو میں لکھے
ہوئے ہیں اس طرح کے صرف تین رسالوں کا اب تک علم ہوا ہے۔ یہ بھی غالباً اس طرح کے اختلافات ہیں
جو زبانوں کے سینہ بسینہ منتقل ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جس کی کچھ تفصیل شکار نامہ کے سلسلے
میں دی گئی ہے۔ مرتب کے خیال میں روضتین کا مخطوطہ زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک تو خواجہ
صاحب کے ذاتی کتب خانہ کی کتابوں کے ساتھ محفوظ اور آپ سے منسوب رسائل میں منسلک ہے دوسری
بات یہ ہے کہ اس میں واضح طور پر ان ارشادات کو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا گیا ہے۔

لیکن یہ ان رسالوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جو خود خواجہ صاحب نے تحریر فرمائے تھے بلکہ اس کا
شمار ان رسالوں میں ہوگا جو آپ کے معتقدین نے آپ کی زبان سے سنکر نقل کر لیے تھے۔

دارالاسرار کے نام سے خواجہ صاحب کا ایک فارسی رسالہ بھی موجود ہے۔ مجھ کو تلاش کے باوجود
فارسی رسالہ دستیاب نہ ہو سکا ورنہ دونوں کے موازنے سے بہت سے امور کی وضاحت ہو سکتی تھی۔

بندہ نواز کا اسلوب اور زبان

خواجہ بندہ نواز کی تصانیف گو مذہبی نوعیت کی ہیں اور اکثر
اخلاق تصوف اور معرفت کے مسائل ان کے موضوع ہیں۔
ان کا اسلوب بیان بھی عالمانہ ہے۔ تاہم ان کا ان ادق مضامین کو پیش کرنے کا طریقہ دل نشین ہے۔
اپنے مطالب کو قابل قبول بنانے کے لیے مولانا رومی کی طرح قصوں اور کہانیوں کا بھی سہارا لیتے ہیں۔
قطع نظر قدیم زبان متروک الفاظ اور محاوروں کے ان کا یہ خاص طریقہ بہت ہی جاذب نظر ہے۔

شکار نامہ میں قبولیت عبودیت وغیرہ کو تمثیل کے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں :

٭ گھر میں گیے وہاں دیکھتے ہیں تو ایک محراب تھا جسے قبولیت کا محراب بولتے ہیں اس میں ایک ہانڈی تھی جسے عبودیت کی ہانڈی بولتے ہیں ہانڈی کا نے پات انپڑائے تو ہات انپڑیا نہیں ٭۔

خواجہ صاحب بھی اگلے دور کے اکثر بزرگوں کی طرح عبارت کو دلچسپ اور موثر بنانے کے لیے موقع بہ موقع اشعار درج کرتے ہیں۔ اس کا ایک فایدہ یہ بھی مقصود ہے کہ مطالب شعر کی مدد سے حافظہ میں زیادہ بہتر طریقے پر محفوظ رہ سکتے ہیں۔ "معراج العاشقین" اور "تلاوت المعراج" میں عموماً انھوں نے بھی طریقہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً پیر کو وہ مجازاً طبیب کامل سے تعبیر کرتے اور لکھتے ہیں :

٭ (۱) پیر طبیب کامل ہونا نبض کو پہچان کو دوا دینا ٭

طبیب عشق را دکان کدام است

علاج جان کند او را چہ نام است[۱]

(۲) "اس کا معنا جب کوئی ساقی ہات سوں دیدار کا شراب پیوے گا یعنی پیر کے ہات سوں مست ہووے گا"۔

لباس زہد و تقویٰ تا نہ پوشی

شراب معرفت را کے بہ نوشی[۲]

(۳) "خدا کے عشق میں ہو اس کا معنا اس کا اطاعت اس کی خوشی اس کا کہنا"،

"من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی

تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری"[۳]

"ذکر الخفی اس کا معنا عروج نے نزول کوں انپڑنا"

۱؎ "معراج العاشقین" صفحہ ۱۱

۲؎ " " " صفحہ ۱۸

۳؎ " " " صفحہ ۲۴

مردانِ خدا خدا نہ باشند
لیکن ز خدا جُدا نہ باشند[1]

تصوف اور عرفان خواجہ صاحب کے اُردو رسالوں کی خصوصیات ہیں گو کبھی کبھی اخلاق انسانی کی تہذیب بھی ان کے مدنظر رہتی ہے۔ مذہب کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں پر انھوں نے زور دیا ہے۔ مثلاً معراج العاشقین اور شکار نامہ نیز خلاصۃ التوحید میں تصوف کے اسرار و غوامض بیان کیے گیے ہیں تو تمثیل نامہ اور تلاوت المعراج میں اخلاقی مسائل قلمبند کیے ہیں۔ رسالہ وجودیہ میں ایمان اور عقاید سے بحث کی گئی ہے۔

خواجہ صاحب کے اکثر رسالوں اور خاص طور پر ان کی بعض نظموں جیسے چکی نامہ وغیرہ کی مخاطب عموماً خواتین ہیں جس میں عورتوں کی سمجھ کے مطابق عام فہم اور آسان زبان اور عورتوں کی دلچسپی کی اصطلاحوں میں مذہب کے احکام سکھانے کی کوشش کی گئی اس قسم کی کتب کا سلسلہ سب سے پہلے ان کے والد راجو قتال حسینی نے شروع کیا تھا۔ چنانچہ ان کی تصنیف سہاگن نامہ کا تذکرہ پچھلے صفحوں میں گزر چکا ہے۔

خواجہ صاحب کی زبان کے بارے میں بھی چند باتیں کہنی ضروری معلوم ہوتی ہیں جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کی ابتدائی زندگی کے کچھ سال دکھن میں گزرے۔ اس کے بعد دہلی گیے۔ دہلی میں ان کا قیام ساٹھ برس رہا۔ یہ فطری بات ہے کہ بچپن میں اطراف کی بول چال کا اثر ان پر کافی پڑا تھا۔ چنانچہ جب وہ ۸۰۱ھ میں دکن لوٹ آئے اور جیسا کہ مولوی عبدالحق کا خیال ہے۔ دکن میں ارشاد و ہدایت کے لیے اُردو میں رسالے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔[2]

انھوں نے زیادہ تر دکن کی بول چال کی زبان کو اپنے رسالوں میں استعمال کیا ہے تاہم شمالی ہند کی بول چال کی زبان کا اثر بھی ان پر کافی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم کو خواجہ صاحب کے رسالوں کا مقابلہ بعد کے رسالوں جیسے شاہ میران جی کے رسالوں کے کرنے سے ہوتا ہے۔

---

[1] "معراج العاشقین" صفحہ ۲۴ [2] اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۲۳

میراں جی کے رسالوں کی زبان پر دکھنی کا اثر اور بھی زیادہ گہرا دکھائی دیتا ہے۔

خواجہ صاحب کی زبان میں بھی جملوں کی ساخت کے لحاظ سے وہ خصوصیت موجود ہے جو دکن میں اُردو کے ابتدائی نشو نما کے دور کا وصف ہے۔ چنانچہ وہ جملوں کو راست (Direct) ساخت کے ساتھ استعمال کرتے رہے جس کی وجہ سے جملے میں فعل متعدی کی ان خاص صورتوں کے موقع پر جب کہ موجودہ ادبی اُردو میں جملے کے فاعل کے ساتھ علامت فاعل "نے" لائی جاتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر جملے کی ساخت مجہول (Passive) ہو جاتی ہے۔ اور فعل کی مطابقت فاعل کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ مفعول کے ساتھ ہوتی ہے دکھنی میں جملے کی ساخت راست ہوتی ہے اور فعل متعدی افعال کی ان خاص صورتوں میں بھی فعل فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ "معراج العاشقین" کے یہ چند جملے اس کی تائید میں پیش کیے جاتے ہیں : [1]

۱۔ اس کا معنا خدا کہیا

خواجہ صاحب قدیم دور کے اکثر مصنفین کی طرح عموماً حرف ربط کو حذف کر دیتے ہیں :

؎ جیکوئی ساقی ہات سوں ؎ (ساقی کے ہاتھ سے)

میرؔ اور سوداؔ بلکہ غالبؔ کے دور تک بھی حرف ربط کے حذف کی مثالیں ہم کو دستیاب ہوتی ہیں مثلاً :

؎ جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ؎ غالبؔ

حرف تخصیص / قید کی صورت میں دکھنی کے دوسرے مصنفین کی طرح "ج" لاحقے کے طور پر خواجہ صاحب کے یہاں بھی آتا ہے جس کی مثالیں یہ ہیں :

(۱) سب آزار دکون ایکچہ دارو دیناسو اوسی طبیب کم عقل نادان ہے۔

---

[1] اس بحث کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "دکھنی کے چند لسانی پہلو"، رسالہ سب رس حیدرآباد دکن جلد ۱۸ شمارہ (۶)

(۲) یعنی دیکھنا پنا سوچ "نور" دتاپنا سوچہ "شاہد"
(۳) دستے پنے میں دسیا سوچ روح الروح مقیم
(۴) اپنا چہ عاکس دسیا سوچہ روح مقیم
شمایر کی قدیم شکلیں بھی وہی ہیں جو دکھنی کے اکثر مصنفین کے ہاں ملتی ہیں مثلاً :-

شخصی

فاعلی	غیر فاعلی
میں	منج (مجھ)
ہمنا۔ہمن۔ہمین (ہم)	ہمنا۔ہمن۔ہمیں
تون (تو)	تج (تجھ)
او وو (وہ)	ان
انون (انھوں)	انون

اعداد سب وہی ہیں جو معیاری اُردو میں استعمال ہوتے ہیں لیکن اعداد ترتیبی خاص طور پر دوسرا تیسرا کی جگہ دسرا اور تسرا استعمال ہوتا ہے۔

کچھ لفظ ایسے ہیں جو اب اُردو میں متروک ہو گئے ہیں جیسے اچھنا (رہنا) دسنا (دکھائی دینا) انپڑنا وغیرہ۔

ماضی مطلق کی صورت میں "ا" سے قبل ایک مختفی "ی" بھی آتی ہے۔ جیسے "چلیا (چلا) "بولیا" (بولا) کہیا (کہا) وغیرہ۔

یعنی الفاظ کا املا عوامی بول چال کے مطابق لکھا گیا ہے، جیسے:

نفا۔ نفع ۔ طرہ ۔طرح ۔ فام ۔ فہم

اس طرح کی املا کی عوامی شکلیں میر تقی میر اور سودا کے عہد تک بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ میر کے ایک شعر میں مسجد کے بجائے "مسبت" باندھ گئے ہیں:

"ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسبت"

بندہ نواز کا اثر متاخرین پر

بندہ نواز کے رسالوں نے حقیقت میں اُردو نثر کے لیے نمونے (Model) چھوڑے جس کو ان کے بعد کے لکھنے والوں نے اپنا مطمع نظر بنایا، اور کم از کم مذہب اخلاق اور تصوف پر لکھنے والوں پر خواجہ صاحب کے اسلوب بیان اور زبان کا مرصہ تک گہرا اثر رہا۔

خواجہ صاحب نے جن موضوعات پر لکھا متاخرین میں سے بہتوں نے اس پر طبع آزمائی کی مثلاً ایک موضوع "معراج" ہی پر خواجہ صاحب کے بعد مندرجہ ذیل کئی معراج نامے نظم و نثر میں لکھے گیے۔ مشہور "معراج نامے" جن کا ابھی تک پتہ چل سکا یہ ہیں۔ [۱]

(۱) معراج نامہ بلاقی (منظوم)

(۲) معراج نامہ مختار (منظوم)

(۳) معراج نامہ ابوالحسن قربی (منظوم)

(۴) معراج نامہ ضمیر

(۵) واقعات معراج از رافت

اس طرح تعلیم نسواں کی مبادیات بھی خواجہ صاحب ہی کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ "چکی نامے" اور "پند نامے" کے نام سے انھوں نے عورتوں کو آسان زبان میں دینی مسایل بتائے ہیں۔ ان کے بعد شمس العشاق میراں جی [۲] میراں جی خدانما [۳] نے اس طرف توجہ کی چنانچہ کئی "چکی نامے" ان کے تتبع میں لکھے گیے جن میں دو چکی ناموں کے مخطوطے ادارۂ ادبیات اُردو میں بھی محفوظ ہیں۔ مجھے بیجاپور کے سرکاری میوزیم میں بھی ایک "چکی نامہ" اور ایک "پند نامہ" دستیاب ہوا ہے۔ اس کی بھی مخاطب خواتین ہیں۔

بندہ نواز کے معاصرین اور مقلدین

بندہ نواز نے چھوٹے چھوٹے رسالوں کے ذریعے عوام کے لیے ارشاد و ہدایت کا جو سلسلہ شروع کیا

---

[۱] ان معراج ناموں کے مخطوطے کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہیں۔ [۲] فہرست اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۶۸

[۳] فہرست اُردو مخطوطات صفحہ ۶۲

تھا اس کو اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں اور خاص طور پر ان کے بیٹے اور پوتے اکبر حسینی اور عبداللہ حسینی نے جاری رکھا۔

اکبر حسینی سنہ ۷۷۳ھ سنہ ۸۲۳ھ

خواجہ بندہ نواز کے فرزند اکبر بڑے عالم و فاضل تھے۔ ان کے کمالات ظاہری و باطنی کے تعلق خود ان کے والد بزرگوار نے اپنی تصنیف "حظائر القدس" میں اشارہ کیا ہے[1]۔

سنہ ۸۱۱ھ میں بندہ نواز نے انھیں اپنا خلیفہ بنایا لیکن اس کے سات ماہ بعد ہی وہ رحلت کر گیے۔ باپ نے اپنے ہاتھ سے بیٹے کو غسل دیا۔ انھوں نے فارسی عربی اور اُردو میں کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) شرح تبصرۃ الاصطلاحات الصوفیہ اس کو خواجہ صاحب کی اجازت سے لکھنا شروع کیا۔ اسے انھوں نے اپنے والد کی کتاب "اسمار الاسرار" کی شرح کے طور پر لکھا تھا لیکن ترجمہ نہ ہو سکی۔ صرف چند اسمار کی شرح کی ہے۔ ساتھ ہی کتاب کے متفرق اور مشکل مضامین کی تشریح کی ہے۔

(۲) کتاب القصاید خواجہ صاحب عقاید اہل سنت میں خود ایک رسالہ تصنیف کرنا چاہتے تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ اکبر حسینی نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے تو ارادہ ترک فرما دیا اور ارشاد فرمایا "محمد اکبر حسینی کی کتاب کافی ہوگی"[2]۔

اُردو میں بھی ایک کتاب کا تذکرہ مولوی عمر یافعی[3]۔ نصیر الدین ہاشمی[4] نے کیا ہے۔ عمر یافعی صاحب نے "مجلہ مکتبہ" میں اسے اپنے تعارف کے ساتھ شایع کیا ہے جس کا نمونہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب دکن میں اُردو (طبع چہارم) میں نقل کیا ہے۔

حضرت سید اکبر حسینی کی یہ کتاب بھی اپنے والد کی تصانیف کی طرح متصوفانہ مضامین پر

۱۔ "سیرت بندہ نواز" مصنفہ عطا حسین صفحہ (۱۰)
۲۔ "سیرت بندہ نواز" مصنفہ عطا حسین صفحہ (۲۹)
۳۔ مجلہ مکتبہ نمبر ۱ جلد ۱ اپریل ۱۹۲۸ء
۴۔ دکن میں اُردو طبع چہارم صفحہ (۳۱)

حاوی ہے۔ اس کا نمونہ حسب ذیل ہے:

سنو اے مسلمانوں طالب خدا کے بوجھو زندگی سہل ہے جیون کا بھروسہ نہیں۔ موجب حکم حضرت علی کے عمل کرو قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم عجلو باالصلواۃ قبل الفوت عجلو باالتوبہ قبل الموت۔
یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سوں آگے ہو شتابی کرو توبہ مرنے سوں آگے یعنی مرید ہو کر توبہ کرنا ہور کفر و ضلالت سوں آپس کوں پاک کرنا ایک کے تابع ہو کر خدا طلبی میں عاقبت کی راہ سنوارنا

عبداللہ حسینی ۸۳۰ھ ۔ ۸۵۲ھ

مولوی سید محمد اپنی کتاب "ارباب نثر اُردو" میں عبداللہ حسینی کو خواجہ صاحب کا نواسہ اور حکیم شمس اللہ قادری نے "اُردو قدیم" میں اور ڈاکٹر زورؔ "اُردو کے اسالیب بیان" نیز "اُردو شہ پارے"[1] میں انھیں خواجہ صاحب کا پوتا بتایا ہے لیکن "سیر محمدی" میں حضرت گیسو دراز کا جو شجرہ دیا گیا ہے اس میں عبداللہ حسینی کا نام خواجہ صاحب کی نواسی کے شوہر کی حیثیت سے بتایا گیا ہے۔ اور عبداللہ حسینی سید ابوالمعالی کے فرزند بتلائے گئے ہیں [2]۔
عبداللہ حسینی اپنے معتقدین کی ہدایت کے لیے حضرت عبدالقادر جیلانی کی تصنیف "نشاط العشق" کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔ اس کا ایک مخطوطہ ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اس کا ذکر اسٹوارٹ اپنے کیٹلاگ میں کرتا ہے لیکن علماء کا خیال یہ ہے کہ یہ ترجمہ ناپید ہے۔ اس لیے اس کا نمونہ پیش نہیں کیا گیا۔
مذکورہ بالا دو بزرگوں کے علاوہ مجھے اس مقالے کی تدوین کے سلسلے میں مواد کی چھان بین کرتے ہوئے مزید تین حسب ذیل کارناموں کا پتہ چلا ہے۔ جو اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) "کشف الوجود" مصنفہ شاہ داول
(۲) "رسالہ شاہ قلندر" مصنفہ شاہ قلندر

---

[1] "اُردو شہ پارے" صفحہ (۲۰) نیز دیکھو دکن میں اُردو صفحہ (۳۹)
[2] "سیر محمدی (اُردو ترجمہ) صفحہ (   )

(۳۳) "ارشادنامہ کمال الدین شاہ" از خواجہ کمال الدین

شاہ داول شاہ داول کا رسالہ "کشف الوجود" کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں محفوظ ہے۔ یہ چودہ ورق کا ایک رسالہ ہے جس کا موضوع تصوّف ہے۔ اور لوح پر "رسالہ شاہ داول" مرقوم ہے۔

حالات زندگی ان کا نام داور الملک اور عرف "شاہ داول" ہے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے بڑے خدا رسیدہ بزرگوں میں ہوتا تھا۔ صاحب "برکات الاولیا" نے ان کے حالات لکھے ہیں۔ اور انھیں مخدوم شاہ عالم کا مرید اور خلیفہ بتایا ہے۔ شاہ داور الملک گجرات کے حکمراں سلطان محمود کے امراء میں تھے۔ مخدوم شاہ عالم سے ان کو بڑی عقیدت تھی اور ہر روز ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ بڑے صاحب کرامت تھے "خزینۃ الاصفیا" اور "برکات الاولیا" میں ایک قصہ مذکور ہے کہ ایک روز مخدوم شاہ عالم وضو کر رہے تھے اور داور الملک اپنے ہاتھ سے پانی ڈال رہے تھے اسی وقت "شاہزادہ ملک دکن" جو برص کے مرض میں مبتلا تھا، شاہ عالم کے پاس آیا۔ اور شفا کے لیے درخواست کی۔ وضو سے فراغت کے بعد شاہ عالم نے پانی کے چند قطرے شاہزادے پر چھڑکے، کہتے ہیں اس سے شاہزادے کا مرض جاتا رہا۔ پھر داور الملک سے فرمایا یہ غیبی علم حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو ملا تھا اس کے بعد مخدوم سالار کے ذمہ ہوا اور اب مجھے عطا کیا گیا ہے "

دوسرے بزرگ جنکا نام شاہ داول تھا محمود غزنوی کی فوج میں تھے جس وقت سلطان محمود نے تھانہ (بمبئی) پر لشکر کشی کی یہ بھی اسی کے ہمراہ تھے اور آخر اسی جنگ میں مارے گیے۔ ان کا مزار گجرات میں ہے سنہ وفات ۴۰۹ھ ہے۔ لیکن یہ تصنیف اول الذکر بزرگ کی معلوم ہوتی ہے۔

"کشف الوجود" کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔:

" تمام حمد سزاوار ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ کون ہور صفت اس کا لانہایت ہے ہور صفت محمد کا لا شمار ہے۔ کہاں لگ بولیگا ہور کہاں تلک سکے گا ایتال مذکور سن یو جو دل پر ہور نفس مرید کا سوال ہور جواب ہور لکھیا ہے۔ جو خدا کے دوست دیکھ کر خو ہوویں ہور سالک دیکھ کر راہ راست آویں ہور نیکی سوں یاد کریں

سوال : طالب مرید ہوتا سو کون ہور مرید ہوتا سو کون ہور مرید کسے کہنا ہور پیر کسے کہنا۔
جواب : مرشد ہوتا سو طلب ہور مرید کرتا سو مطلوب ہور معرفت ربانی لانال بخشنا سو پیر
ہور معرفت ربانی لامثال پایا سو مرید مرشد کامل اسے کہے جو سہی بتاوے طالب
صادق سو سہی۔
چھاری قرآن کے لباس سوں موجود ہے ہور اکہ گرم و خشک ہے ہور باد اگرم تر
ہے۔ ہور پانی سرد و تر ہے ہور ماٹی سرد و خنک ہے یو سب صفتاں ہو اکھاں ہین۔
ہور ماٹی میں پانچ صفت ہے۔ لمس میں آنا ہور رنگ ہور لذت ہور بوی ہور خالی ہو
پانی میں

شاہ داول ہی کے ساتھ اسی دور کے دو اور بزرگوں سید محمد جونپوری اور شیخ بہاؤالدین باجن
کے بھی نام ملتے ہیں جنھوں نے اُردو کو تقریر و تحریر کے لیے استعمال کیا۔

سید محمد جونپوری ۸۴۷ھ ۔ ۹۱۰ھ یہ بہت بڑے بزرگ اور صاحب تصرف تھے انھوں نے فرقہ مہدویہ کی بنیاد ڈالی۔ لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے بہت سا
زمانہ وطن سے دور سیاحت میں گزارا ان کے بعض اقوال اُردو میں ملتے ہیں مولوی عبدالحق نے تاریخ سلیمانی
کے حوالے سے ان کا مندرجہ ذیل جملہ درج کیا ہے جو انھوں نے مشہور بزرگ شیخ احمد کھٹو کی نسبت فرمایا تھا۔
لکھتے ہیں :

"رو پیٹنے خدا کوں پونچے" [1]

خُراسان کے سفر میں سلطان حسین کی فوج نے ان کے ساتھیوں کو بہت تکلیف دی جب سلطان کو
اس کی خبر پہنچی تو معذرت کی اس وقت انھوں نے سلطان کے سفیر کے سامنے یہ جملہ کہا :
"شہ کی چوٹ شکر کی پوٹ"
ان جملوں کے علاوہ "شواہد الولایت" میں ان کے چند اور بھی دوہرے ملے ہیں۔

---

[1] اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ (۳۱)

بہاؤالدین باجن ۹۰۷ھ تا ۹۰۲ھ

شاہ باجن معزالدین کے فرزند تھے جو گجرات کے بڑے عابد زاہد[1] بزرگ تھے معزالدین نے سات مرتبہ حج کیا تھا معزالدین کے دوسرے فرزند یعنی باجن کے بھائی شاہ مینان بھی بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ باجن پہلے عزیز اللہ متوکل کے مرید ہوئے۔ عرب و ایران کی سیاحت کے بعد ہندوستان واپس آئے تو عزیز اللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے ان کے بیٹے رحمت اللہ متوکل کے ہاتھ پر بیعت کی۔ باجن نے ایک کتاب "خزانہ رحمت" کے نام سے لکھی جس میں اپنے مرشد کے ملفوظات اور ارشادات جمع کیے ہیں خزانہ رحمت کے ایک بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باجن نے شمال میں خراسان اور جنوب میں سیلون تک سفر کیا تھا۔

شاہ کمال الدین

پروفیسر عبدالقادر سروری کے کتب خانہ کی بیاض میں جس کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے خواجہ صاحب کے رسالے "خلاصۃ التوحید" اور شاہ میران جی "شرح العشاق" کے رسالہ تصوف کی کچھ عبارت کے ساتھ خواجہ کمال الدین کا ایک رسالہ "ارشاد نامہ"، خواجہ کمال الدین بھی منقول ہے۔ سر نامہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔ :

"ارشاد نامہ کمال الدین شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز"

اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

" کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ
لَآ اِلٰہَ نہیں کوئی اللہ بندگی لینے کی اور خدائی کی لایق "

اختتام مندرجہ ذیل فارسی عبارت پر ہوتا ہے :

ش آنگاہ مقراض راند بر موی پیشانی سہ موی ببرد و بجائے آن
تخم سعادت بہ نشاند ش

ان چند جملوں سے پڑھ کر اس رسالے کی کچھ عبارت منقول نہیں ہے۔

---

[1] سنہ وفات میں اختلاف ہے پروفیسر ابراہیم ڈار اپنے مقالہ گوجری اور اردو میں اہل گجرات کے قصہ میں ۹۰۲ھ لکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے صوفیائے کرام میں ۹۱۲ھ درج کیا ہے۔

خواجہ کمال الدین شاہ میراں جی کے پیر تھے جن کو خرقۂ خلافت خواجہ بندہ نواز کے خلیفہ جلال الدین مغربی سے عطا ہوا تھا[1]۔ یہ بڑے باخدا بزرگ تھے۔ شاہ میراں جی نے ان کی مدح میں جو اشعار لکھے ہیں ان سے ان کی روحانی عظمت اور علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اشعار ان کی مثنوی "شہادت التحقیق" میں لکھے گیے ہیں جو حسب ذیل ہیں :

اس کمالیت کا سنگ　　اس خاندان کا رنگ

ان گمائے اپنا حال　　تو ہوئے پیر کمال

کچھ تھے نصیب میرے　　پگ دیئے تھے تو ان کیرے

رسالہ شاہ قلندر

سالار جنگ کے کتب خانہ میں "چہاردہ رسائل" کا مجموعہ موجود ہے اس میں ایک رسالہ "رسالہ شاہ قلندر"[2] بھی ہے۔ اس رسالے کے ترقیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ قلندر خواجہ بندہ نواز کے نبیرہ شاہ یداللہ حسینی کے مرید تھے۔ ترقیمہ کی عبارت یہ ہے :

نظر میں پایا موتی۔ شاہ یداللہ دستا جوتی۔ دیکھا جوت دستا موں میں کیا تھا دستا کوں۔ تب قلندر دل کے اندر ظاہر ہے۔ شاہ یداللہ ہمامی ہے بخت او نچے نامی ہے

اس رسالے کی عبارت وجہی کی "سب رس" کی طرح مسجع و مقفی ہے لیکن وجہی کا اسلوب زیادہ فنکارانہ اور ترقی یافتہ ہے۔ یہ مسجع اور مقفی عبارت کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے۔ اس میں کہیں کہیں ابہام بھی ہے۔ اکثر محققین کو "سب رس" کے اسلوب بیان کی رنگینی کے مدنظر یہ خیال تھا کہ ایسا ادبی شاہکار یکایک پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے پہلے بھی یہ طرز نگارش رائج رہ چکا ہوگا۔ شاہ قلندر کے اس رسالے کی دریافت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محققین کا اندازہ غلط نہیں تھا اور یہ رسالہ اور "تاج الحقایق" اسی گمشدہ سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ شاہ یداللہ۔ بندہ نواز کے چھوٹے بیٹے اصغر حسینی عرف میاں لہرہ کے فرزند اکبر تھے۔

---

[1] ان کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ بیجا پور میں شاہ میراں جی کے پائیں ان کا مزار ہے۔ خدا لم کو خواجہ بندہ نواز کا خلیفہ اور خسر بتلاتے ہیں۔ ان کی صاحبزادی بی بی رضا خاتون سے بندہ نواز نے عقد کیا تھا۔

[2] ملاحظہ ہو مقالہ ہذا صفحہ (　　)

تذکرہ نگاروں نے ان کے علم و فضل اور معجزہ و کمال کے متعلق بہت سی روایات بیان کی جاتی ہیں [1]۔
ان کے ملفوظات "محبت نامہ" کے نام سے مدون کیے گیے ہیں اور کتب خانہ روضتین میں مخطوطے کی شکل میں
ہیں۔ خواجہ صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت میں خاص دلچسپی لی تھی۔ لکھا ہے کہ اس زمانے کے مشہور علما قاضی
بہاؤالدین۔ قاضی سراج الدین وغیرہ سے علوم متداولہ کی تکمیل کرائی۔ تذکروں میں یہ بھی منقول ہے کہ
خواجہ صاحب نے ان کو اپنی زندگی میں ہی اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔

شاہ ید اللہ حسینی نے بھی اپنے دادا کی طرح دعوت حق اور ارشاد و ہدایت کا کام جاری رکھا۔
ان کا مزار خواجہ صاحب کی گنبد سے چند گز کے فاصلے پر واقع اور "چھوٹے روضہ" کے نام سے مشہور
ہے۔ ان کی تاریخ وفات ۸۶۳ھ "شہنشاہ یقینی" سے برآمد ہوتی ہے۔

شاہ قلندر جن کا رسالہ مجھ کو ملا ہے ان ہی ید اللہ کے مرید تھے۔ اس رسالہ کا اقتباس
حسب ذیل ہے :

عشق بلند ہے۔ واز عشق معشوق عاشق را زعشق قدیم آرائش عشق
دکھاوے۔ بدانش عشق ہے دستیا۔ لذت ہے محبوب عشق دیکھا عشق سب
کا لذت لیا۔

عشق حالت سب مغلوب۔ طلب طالب وہیں مطلوب عشق نور ہوز ظہور عشق۔
نظر میں پایا موتی شاہ ید اللہ دستا جوتی دیکھا جوت دستا مون میں
کیا تھا۔ دستا کون تب قلندر دل کے اندر ظاہر ہے۔ شاہ حامی ہے بخت اونچے
نامی ہے۔

عرض میرا ہوا تمام۔ فرض تھا ابرار کام۔ یقین رہبر یقین جان۔ یقین ثابت
وہی ایمان ہے۔ عاشق درود بولیا یک ایمان پر رسول خدا

---

[1] تاریخ خورشید جاہی، ومراۃ الاسرار، عبدالرحمن چشتی قلمی مخطوطہ روضتین گلبرگہ۔

لغات

"آدات الفضلا" اور "شرف نامہ" جن کا سرسری ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے یہ بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لغتوں میں بھی اُردو کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لغات اور ان میں مندرج الفاظ نثر کے دائرے میں نہیں آتے تاہم ان سے زبان کے اس زمانے تک نشو نما اور اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"آدات الفضلا" کا نمونہ پروفیسر محمود شیرانی نے دیا ہے۔ اس کو بدرالدین محمد دہلوی نے ۸۲۲ھ میں لکھا تھا۔ اس میں چھت۔ مور۔ السی۔ گرگٹ۔ ہاندی۔ تنبول۔ مامہ۔ ملکنی۔ گھنٹی۔ اور بہت سے اُردو کے لفظ ملتے ہیں۔ مثلاً :

اصل لغت	ہندی مرادف
اسکوب	چھت
درائے	گھنٹی
آفتاب پرست	گرگٹ

شرف نامہ

اس لغت کا تذکرہ محمود شیرانی اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ اس کے مصنف ابراہیم قوام فاروقی بنگالے کے رہنے اور شرف یحییٰ منیری کے مرید تھے۔ انھوں نے رکن الدین باربک شاہ کی فرمائش پر یہ لغت لکھی تھی۔ اس کی تدوین میں انھوں نے اس سے پہلے کی ساری لغات سے مدد لی تھی۔ اس میں بھی بہت سے فارسی الفاظ کے مترادفات اُردو میں دیئے گئے ہیں جن میں سے چند "پنجاب میں اُردو" سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں : [1]

اصل لغت	ہندی مرادف
پاتلہ	کراہی (کڑھائی)
خاکستر	راکھ

---

[1] اس کے علاوہ پروفیسر محمود شیرانی نے فارسی "گذر" کا مرادف اُردو لفظ گاجر بھی لکھا ہے، لیکن حقیقت میں "گذر" گاجر کا مفرس روپ ہے۔

اصل لغت	ہندی مرادف
شب تاب	جگنی
طلق	ابرک
خردل	رائی
خرفہ	لونگٹ

۵

شاہ میران جی کی نثری تصانیف

میران جی کا عہد
سلاطین بیجاپور کی علم دوستی
میران جی کی عظمت
حالات زندگی
سنہ وفات و پیدائش اور جائے پیدائش
کے بارے میں اختلافات
تصانیف :۔ نظم - گنج عرفان -
"شہادت التحقیق"
"خوش نامہ" - خوش نغز

نثر :۔
"گلباس"
"جل ترنگ"
شرح مرغوب القلوب
"سب رس" کا اصل نام "تاج الحقائق"
تاج الحقائق کے مصنف وجیہہ الدین علوی
وجیہہ الدین کے حالات زندگی
تصانیف : دیگر معاصرین
میران جی کے فن کی خصوصیات

شاہ میراں جی کے نثری کارنامے

تاریخی پس منظر

اُردو نثر کی تاریخ میں آٹھویں صدی ہجری کا ربع اول سید شاہ راجو اور ان کے خاندان کی خدمات کا عہد تھا۔ سید شاہ راجو نے نثر کی بنیاد رکھی اس پر ان کے فرزند سید محمد حسینی گیسو دراز نے عمارت اٹھانی شروع کی گیسو دراز کے پوتے عبداللہ حسینی اور ان کے دوسرے معاصرین نے اس عمارت کو اور اونچا اٹھایا۔ نویں صدی کا نصف آخر شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کی خدمت کا عہد کہلا سکتا ہے۔

شاہ میراں جی بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں کے ابتدائی دور میں بیجاپور تشریف لائے۔ انھوں نے اور ان کے فرزند اور پوتے نے عادل شاہی حکومت کے تقریباً سارے دور میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ عادل شاہی حکومت بہمنی حکومت کے انقراض کے بعد قایم ہوئی تھی۔ اس کا بانی یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ تا ۹۱۶ھ) سلاطین عثمانیہ کے خاندان سے تھا[۱]۔ جو محمود گاواں کے عہد میں دکن آیا۔ محمود گاواں نے اس کی قابلیت اور ذہانت دیکھ کر اسے بادشاہ کے "امیران صدہ" میں شامل کروا دیا۔ محمد شاہ بہمنی (۸۸۷ھ تا ۹۲۴ھ) کے زمانے میں سلطنت بہمنی کا خاتمہ ہوا تو بیجاپور آکر اس نے اپنی سلطنت قایم کرلی۔ اور "سلطان" کا لقب بھی اختیار کرلیا اس کی اولاد میں حسب ذیل نو حکمراں گزرے ہیں۔ اس خاندان میں دو سو برس کے لگ بھگ حکومت رہی۔:

(۱) یوسف عادل شاہ — ۸۹۵ھ تا ۹۱۶ھ

---

[۱]۔ "بساتین السلاطین" (دبستان اول) صفحہ ۵

(۲) اسمٰعیل عادل شاہ — ۹۱۶ھ تا ۹۴۱ھ

(۳) ملو عادل شاہ — ۹۴۱ھ

(۴) ابراہیم عادل شاہ — ۹۴۱ھ تا ۹۶۵ھ

(۵) علی عادل شاہ اول — ۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ

(۶) ابراہیم عادل شاہ ثانی — ۹۸۸ھ تا ۱۰۳۳ھ

(۷) محمد عادل شاہ — ۱۰۳۳ھ تا ۱۰۶۷ھ

(۸) علی عادل شاہ ثانی — ۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

(۹) سکندر عادل شاہ — ۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷ھ

دو سو سال کے اس عرصہ میں بیجاپور میں اُردو کے کئی مشہور شاعر اور مصنف گزرے جن میں قابل ذکر یہ ہیں:

شمس العشاق میراں جی۔ برہان الدین جانم۔ شاہ امین الدین اعلیٰ۔ عبدل۔ آتشی۔ مقیمی۔ امین۔ شوقی۔ صنعتی۔ علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی۔ ملک خوشنود۔ اشمی۔ دولت۔ نصرتی۔ شاہ ملک۔ ایاغی۔ معظم۔ قادر۔ مومن۔ قدرتی۔ سیوا۔ ہاشمی۔ قادر[1]۔

دوسری طرف گولکنڈہ کے قطب شاہی حکمراں بھی جو ان ہی کے معاصر تھے علم و ادب کی ترقی میں کوشاں تھے۔ دونوں حکومتوں نے اُردو شعر و ادب کی سرپرستی کے سلسلے میں ہمیشہ اُن روایات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جو ان کے پیش رو بہمنی حکمرانوں نے قایم کیے تھے۔ عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں میں معاصر ہونے کے باعث ثقافت و تہذیب اور شعر و ادب کی روایات کے تبادلے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کبھی وہ آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے تو کبھی شادی بیاہ کے بندھنوں سے رشتہ محبت استوار کیا۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں درباروں اور ان کے متوسل شاعروں اور ادیبوں میں بھی مسابقت کی یہ روح کارفرما ہی جس نے فنون لطیفہ مثلاً شاعری۔ موسیقی۔ مصوری اور تعمیر وغیرہ کو کافی مالامال کیا۔

---

[1] "اُردوئے قدیم" صفحہ ۸۱ تا ۹۲ (طبع سوم) نیز "اُردو شہ پارے" صفحہ ۲۳ تا ۶۷ اور "دکن میں اُردو" صفحہ ۱۳۲ تا ۲۱۷ طبع چہارم۔

ادیب اور شاعروں نے جس طرح ایک دوسرے کو متاثر کیا اس کا ثبوت ان کے کلام میں بعض اشاروں سے ملتا ہے۔ چنانچہ "چندر بدن ماہ یار" کا مصنف مقیمی بیجاپوری صاف طور پر اعتراف کرتا ہے کہ اس نے مثنوی کے فن کو غواصی کے نمونوں سے سیکھا تو دوسری طرف نصرتی اسی غواصی پر لطیف پیرایہ میں تعریض کرتا ہے۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ عادل شاہی حکمرانوں نے اُردو ادیبوں کی دل کھول کر سرپرستی کی ان میں سے بعض کو خود بھی تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کی جو "جگت گرو" کے نام سے موسوم تھا۔ ہندوستانی موسیقی کے موضوع پر ایک کتاب "نورس" مشہور ہے جس کا دیباچہ فارسی کے مشہور شاعر ملّا ظہوری نے لکھا تھا۔ علی عادل شاہ ثانی بھی اچھا شاعر تھا اور شاہی تخلص کرتا تھا۔ اس کا دیوان اس کی یادگار ہے۔ اس خاندان کے نہ صرف حکمرانوں ہی کو ادب کا ذوق تھا بلکہ خواتین نے بھی اُردو شعرا اور مصنفین کی سرپرستی کی۔ اسی سازگار ماحول میں شاہ میراں جی نے اُردو تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا ان کو اپنے اسلاف سے نثر کے جو نمونے بہم پہنچے تھے۔ ان کو انھوں نے اپنا رہنما بنایا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ نثر کو زیادہ عوامی بنانے کی بھی کوشش کی۔ تاکہ ان پڑھ اور جاہل لوگ بھی ان کے دینی ملفوظات اور متصوفانہ ارشادات کو سمجھ سکیں۔ اور ان سے فایدہ اٹھا سکیں خواجہ بندہ نواز کے مخاطب پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے جس کے سبب وہ باریک متصوفانہ، اخلاقی اور عرفانی مسایل کو زیادہ عالمانہ انداز میں پیش کر سکتے تھے۔ اس کے برخلاف شاہ میراں جی کے رسالوں میں عوام اور ان پڑھ لوگوں اور خاص کر خواتین کی سمجھ بوجھ کی رعایت زیادہ نظر آتی ہے۔ اسی لیے خواجہ بندہ نواز کے رسالوں کے اسلوب کے مقابلے میں شاہ میراں جی ان کے فرزند اور خلیفہ شاہ برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ کی عبارتیں بول چال کی زبان سے زیادہ قریب اور نویں صدی ہجری کی گفتگو کی زبان کے نمونے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ارتقا کے فطری اصول کی کارفرمائی کی بدولت شاہ میراں جی کے رسالوں کے مقابلے میں شاہ برہان الدین اور ان کے فرزند امین الدین اعلیٰ کے اسلوب تحریر میں رفعت زیادہ جھلکتی ہے۔ تاہم عوام کے قلوب کی گہرائیوں تک پہنچنے کی سعی ان کی تحریروں سے بھی ظاہر ہے۔

شاہ میراں جی کی ہستی حقیقت میں اپنے عہد کی بڑی برگزیدہ ہستی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب

کا خیال تو یہ ہے کہ دکن میں اُردو کا نشو نما انھیں کے روحانی فیض کی بدولت تھا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

"میراں جی بڑے بابرکت بزرگ تھے۔ انھوں نے بیجاپور میں ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشین یکے بعد دیگرے کئی پشت تک بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق ہوئے۔ اور انھوں نے اسی کو اپنی زبان سمجھا۔ اور اسی زبان میں سلوک و معرفت پر متعدد رسالے اور نظمیں لکھیں۔ اس خاندان کے مریدوں اور معتقدوں نے بھی اپنے مرشدوں کی پیروی میں اسی زبان کو اپنی تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا۔ یہ اسی مبارک خاندان کا اثر تھا کہ بیجاپور میں زبان کو اس قدر فروغ حاصل ہوا۔ اور وہاں ایسے خوش بیان اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظیر اردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے" [1]

اس ہیرے کی تابش پر جو گھورے پر پڑا تھا۔ پہلے سید شاہ راجو کی پھر گیسو دراز اور پھر میراں جی کی نظریں پڑیں اور انھوں نے اسے بادشاہوں اور امیروں کے تاج کی زینت بنا دیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں کہ اہل علم کی نظروں میں اس زبان کی وقعت نہیں تھی۔ لیکن اس کی مثال ایسی ہے جیسے "گھورے پر کا ہیرا"، اور ظاہر ہے کہ کوئی پرکھنے والا آدمی ہیرے کو پتھر سمجھ کر پھینک نہیں سکتا تھا۔

"شہادت التحقیق" ان کی ایک طویل نظم ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"یو دیکھت ہندی بول | پن معنے ہے نپ تول
کڑوے پن سو رس | پھل پاکے جوں پھنس
جیسے معنتر میٹھا لاگے | تو کیوں من اس تھے بھاگے
ہے کڑوا ان کیرا ہیرا | گھوڑا اوپر پڑیا ہے ہیرا" [2]

اس ہیرے کی ضیا کو انھوں نے عوام کے گھروں تک پہونچانے کی کوشش کی اور اپنی تصانیف کے ذریعہ ان کی ذہنی تاریکیوں کو دور کرنے کی جہد بلیغ کی۔

---

[1] "اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۵۰ (طبع اول)
[2] " " " " " " صفحہ ۵۸ (طبع اول)

حالات زندگی شاہ میراں جی جو "شمس العشاق" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ارشاد و ہدایت کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ "خزینۃ الاصفیا" کے مصنف نے ان کا نام "میاں جی" بتایا ہے [۱]۔ لیکن "تذکرہ اولیائے دکن" و "برکات الاولیا" میں ان کا نام میراں جی اور لقب "شمس العشاق" [۲] بتایا گیا ہے۔ سخاوت مرزا صاحب اپنے ایک مضمون "قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض" [۳] میں ان کا نام امیرالدین میراں جی بتاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے

ڈاکٹر عبدالحق اپنی تصنیف "اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں لکھتے ہیں :

"آپ مکہ میں پیدا ہوئے اور کچھ دنوں بعد ہندوستان آئے" [۴]

مصنف "برکات الاولیا" [۵] مصنف "تذکرہ اولیائے دکن" [۶] اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "ارشاد نامہ" کے دیباچے میں ان کا مولد بیجاپور بتاتے ہیں [۷]۔

مصنف اولیائے دکن لکھتے ہیں :

÷ اوائل میں جب محبت الٰہی غالب ہوئی دنیوی تعلقات سے دستبردار ہو کر حرمین شریفین کی زیارت کو روانہ ہوئے ÷

"برکات الاولیا" میں لکھا ہے :

÷ آپ مشاہیر مشائخین کرام بیجاپور سے ہیں ÷

حکیم شمس اللہ قادری بھی اپنی کتاب "اُردوئے قدیم" میں اس کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن مصنف "خزینۃ الاصفیا" آپ کی جائے پیدائش مانڈو (مندو یعنے شادی آباد مالوہ) بتاتے ہیں۔

---

[۱] "خزینۃ الاصفیا" جلد اول صفحہ (۴۰۱)

[۲] "تذکرہ اولیائے دکن" صفحہ ۸۳۴ و برکات الاولیا صفحہ ۱۱۵

[۳] "رسالہ اُردو" اکتوبر ۱۹۵۱ء جلد ۲۹ نمبر ۴ صفحہ ۲۹

[۴] "اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۴۹ (طبع اول)

[۵] "برکات الاولیا" صفحہ (۱۱۵)

[۶] "تذکرہ اولیائے دکن" صفحہ (۸۳۴)

[۷] دیباچہ "ارشاد نامہ" سلسلہ مجلس دکنی مخطوطات

"خزینۃ الاصفیا" کی عبارت حسب ذیل ہے :

؎ شاہ میاں جی بیک واسطہ مرید محمد گیسو دراز است و درویش کامل و اکمل بود درزمان وے در ولایت متدو کسے از وے بزرگ تر نہ بودے ؎ [1]

اسی طرح سنہ ولادت اور وفات دونوں کے بارے میں بھی علما میں اختلافات ہیں اور "برکات الاولیا" میں سنہ وفات ۱۰۰۸ھ ہجری درج ہے۔ "خزینۃ الاصفیا" میں ۸۵۹ھ لکھا ہے۔ اس کے مولف نے ان کی تاریخ وفات ذیل کے اشعار سے نکالی ہے :

میاں جی شاہ شاہنشاہ عالی | چو رفت از دار دنیا سوئے جنت
رقم کن کاشف ممتاز سالش | دگر فرمان دہی بدر کرامت [2]

"روضۃ الاولیائے بیجاپور" اور "تاریخ خورشید جاہی" میں سنہ وفات ۹۰۲ھ بتایا گیا ہے لیکن ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے بھی اس کو مستند مانا ہے۔ تاریخ وفات ۲۵۔ شوال اور ۹۰۲ھ بتایا ہے۔ ڈاکٹر زور اس تاریخ کو مستند نہیں مانتے۔ ڈاکٹر زور صاحب کا خیال ہے کہ ۹۰۲ھ شاہ میراں جی کا سنہ پیدائش ہے اور ۹۷۰ھ سنہ وفات، اس خیال کی تائید میں انھوں نے حسب ذیل وجوہات پیش کی ہیں [3]۔

۱۔ تمام تذکرے اس امر کے اظہار میں متفق ہیں کہ شاہ میراں جی بیجاپور کو علی عادل شاہ کے عہد میں تشریف لائے۔ علی عادل شاہ ۹۶۵ھ میں تخت نشین ہوا اور ۹۸۸ھ میں فوت ہوا۔ اس طرح شاہ میراں جی کا ورود بیجاپور میں ۹۶۵ھ کے بعد ہوا۔ اور انھوں نے چند ہی سال قیام کیا تھا کہ وفات پائی تذکروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقیم ہونے کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا ؎

۲۔ تمام تذکرے اس امر میں بھی متفق ہیں کہ شاہ صاحب نے عربستان سے واپسی پر

---

[1] "خزینۃ الاصفیا" جلد اول صفحہ ۴۰۱
[2] " " " " ۴۰۶
[3] دیباچہ "ارشاد نامہ" مطبوعہ انجمن دکھنی مخطوطات حیدرآباد صفحہ ۶

قلعہ بیجاپور کے حصار کے باہر قیام کیا اور یہ قلعہ ۹۱۸ھ میں تعمیر پایا۔ عبدالحق صاحب نے شاہ صاحب کی تاریخ پیدائش کو تاریخ وفات فرض کر کے قدیم تذکروں کے اس بیان کو کہ علی عادل شاہ کے عہد میں شاہ میراں جی بیجاپور آئے غلط بتا کر یہ قرار دیا کہ شاہ صاحب یوسف عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور آئے ہوں گے۔ حالانکہ یوسف عادل شاہ ۹۱۵ھ میں انتقال کر چکا تھا۔ اور حصار ۹۱۸ھ میں تعمیر ہوا۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب جب حصار کے بننے کے بعد بیجاپور آئے تو ۹۰۲ھ ان کا سنہ وفات کس طرح قرار پا سکتا ہے ؟

۳- ایک اہم اور قابل غور دلیل ۹۰۲ھ شمس العشاق کے سنہ وفات کے بجائے سنہ پیدائش ہونے کی یہ بھی ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے اس سنہ کو صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاہ میراں جی کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی وفات سو سال سے زیادہ عمر میں ہوئی خود مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ "اردو" میں اپریل ۱۰۶۸ھ تحریر فرمایا :

شاہ برہان کا ایک رسالہ ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے اور چونکہ یہ سنہ خود انھوں نے اپنی نظم میں لکھ دیا ہے۔ اس لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ہمارے خیال میں یہ ان کی آخری تصنیف تھی۔ اس کے علاوہ ان کی ایک نظم "نکتہ واحد" کے نیچے ان کی زبانی دو فرمان لکھے ہیں جن میں سے ایک کی تاریخ ۲ صفر ۹۶۷ھ ہے اور دوسرے کی ۹۷۷ھ درج ہے اس سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان سنین میں زندہ تھے ۔

غرض ۹۹۰ھ میں اگر شاہ برہان نے وفات پائی تو گویا اپنے والد کی وفات کے ۸۸ سال بعد فوت ہوئے اور والد کی وفات کے وقت ان کی عمر ۲۰ سال سے کم نہ ہوگی کیونکہ تمام تذکروں میں یہ درج ہے کہ وہ اپنے والد کے نہ صرف مرید بلکہ خلیفہ بھی تھے ۔

اس لحاظ سے اکثر تذکروں میں آپ کی جو عمر بتائی گئی ہے اس میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔ "برکات الاولیا" کے مصنف کے خیال کے مطابق انھوں نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی لیکن عبد الجبار خان ملکاپوری مصنف "تذکرہ اولیائے دکن" کی تواریخ کے اعتبار سے جس کو ڈاکٹر زور نے بھی مستند مانا ہے۔ شاہ میراں جی کی عمر وفات کے وقت ۶۸ برس کی ہونی چاہیے۔

مصنف "تذکرہ اولیائے دکن" کے خیال کے مطابق ان کا قیام مدینہ منورہ میں بارہ سال تک رہا اور ہر سال وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوتے رہے۔ آپکے زہد و اتقا کے بارے میں بہت سے تذکرہ نگار متفق ہیں۔ عبد الجبار خان ملکاپوری لکھتے ہیں کہ جب تک وہ مکہ معظمہ میں رہے، ساری مدت حرم نبوی کے سامنے ایک ہی پہلو پر سویا کرتے تھے۔ تاکہ حرم نبوی کی طرف پیٹھ نہ ہوسکے یہیں ان کو دکن جانے کی ہدایت ملی۔ شاہ میراں جی کو یہ خیال ہوا کہ میں دکن کی زبان سے ناواقف ہوں وہاں کس طرح خدمت انجام دے سکوں گا۔ اس پر شریف مکہ کے توسط سے یہ بشارت دی گئی کہ انھیں وہ زبان آجائے گی۔

مصنف "اولیائے دکن" لکھتے ہیں کہ شریف مکہ کو عالم رویا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے میراں جی کو اپنے سلاح خانہ سے ایک علم بھی دینے کی ہدایت کی تھی نیز یہ بھی ارشاد ہوا تھا وہ علم لیکر دکن جائیں کیونکہ ہم نے ان کا حصہ وہیں محفوظ رکھا ہے " اور جس مقام پر یہ علم قایم ہوگا۔ وہی ان کا مدفن بنے گا۔ چنانچہ وہ علی الصباح علم لیکر روانہ ہوئے۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد وہ دکن تشریف لائے اور بیجاپور میں قیام کیا۔ ان کی آمد کا زمانہ ڈاکٹر زور صاحب نے عہد علی عادل شاہ (۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ) بتایا ہے۔ دکن میں شاہ میراں جی کا قیام تھوڑے ہی دن رہا۔ یہاں انھوں نے خواجہ کمال الدین بیابانی سے بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ خواجہ کمال الدین، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے خرقہ خلافت خواجہ جمال الدین سے حاصل کیا تھا۔

شاہ میراں جی بڑے زاہد مرتاض بزرگ تھے۔ مولانا عبد الحق محدث دہلوی اپنی تصنیف "اخبار الاخیار" میں لکھتے ہیں، وہ رجب سے یوم عاشورہ تک مسلسل معتکف رہتے تھے۔ "خزینۃ الاصفیا" میں ایک اور واقعہ مذکور ہے کہ[1] وہ چھ ماہ تک بغیر آب و دانہ کمرے میں بند رہتے تھے۔

[1]۔ خزینۃ الاصفیا صفحہ نمبر (۴۰۱)

جب باہر نکلتے تو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی متنفس موجود نہ ہو اگر اتفاق سے اس وقت کوئی ہوتا تو شیخ کی نظروں کی تاب نہ لا کر وہ دو دن تک بے ہوش رہتا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اس شہر کا قاضی ان کا منکر تھا۔ چنانچہ وہ عمداً ایک دن شیخ کے حجرے سے برآمد ہونے تک ٹھہرا رہا۔ شیخ کی نظر پڑتے ہی بیہوش ہوگیا۔

اسی کتاب میں ایک دوسرا واقعہ یہ بھی درج ہے کہ مذکورہ بالا قاضی ایک مرتبہ احتساب کی نیت سے "درہ" لیکر شیخ کے ہاں گیا۔ شیخ کو خبر ہوئی اور انھوں نے بام سے قاضی کے چوڈول (پالکی) پر نظر ڈالی۔ اسی وقت کہاروں کے پیر زمین میں گڑھ گیے۔ اس پر بھی قاضی اپنے ارادے سے باز نہ آیا اور درہ لیکر شیخ کی طرف بڑھا۔ شیخ نیچے آئے اور قاضی کو ساتھ لیکر بام پر گئے۔ وہاں اس نے ایک شراب سے بھری ہوئی صراحی رکھی تھی۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ شیخ نے جواب دیا۔ شراب ہے آپ بھی نوش فرمائیے قاضی آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرسکا، ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن ہاتھ نہ اُٹھ سکے۔ آخر پھر بغیر کچھ کہے وہ واپس آگیا۔

عبدالجبار خان ملکاپوری نے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ جس سے میراں جی کے عرفان کی صحت بخش نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خدا کو مسجد یا مندر میں نہیں انسان میں مستور دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک طالب علم ان کے پاس آیا اور ان سے سوال کیا کہ خدا کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا "تمہارے پاس" اور اس سے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ طالب علم کشیدہ خاطر ہو کر جانے لگا تھا کہ آپ کے صاحبزادے شاہ برہان الدین نے اُسے گھر لاکر مہمان رکھا اور عرفان الٰہی سے آگاہ کیا۔[1]

بیجاپور کے قیام کے دوران میں لاکھوں آدمی ان کے ارشاد و ہدایت سے مستفید ہوئے ان کے مریدوں میں مرزا فصیح الدین خاکسار عرف بابا سجنجل بہت مشہور ہیں جو بقول حکیم شمس اللہ قادری "تصوف اور شعر و سخن میں سرآمد روزگار اور دکن کے امیر خسرو تھے"۔[2]

---

[1] "تذکرۂ اولیائے دکن" صفحہ ۸۳۵
[2] "اُردوئے قدیم" صفحہ ۸۱ (طبع ثانی)

شاہ میرآن جی جتنا عرصہ بیجاپور میں رہے ارشاد و ہدایت کا فرض انجام دیتے رہے۔ اس کیلیے انھوں نے تحریر و تقریر دونوں سے کام لیا ہے۔ اور کئی رسالے بھی اسی مقصد سے تحریر فرمائے۔

تصانیف

تاریخوں اور تذکروں میں شاہ میرآن جی کی کئی تصانیف کا ذکر ملتا ہے اور یہ تصانیف نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں ان کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں :

(۱) "شہادت الحقیقت" (۲) "خوش نامہ" (۳) "خوش نغز" (۴) "گنج عرفان"

وہ لکھتے ہیں :

" "گنج عرفان" چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں نو باب ہیں اور ان میں عرفان کے اہم مسایل مثلاً روح کی حقیقت مراقبہ عقل و عشق کا مناظرہ موحد و ملحد کا فرق اور اسی نوعیت کے دیگر مضامین ہیں " [۱]

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ یہ مثنوی شاہ نور متی رام (مدراس) کے مطبع سے بھی طبع ہو چکی ہے [۲] مجھے اس کا نسخہ اور کہیں نہیں ملا۔

" گنج عرفان " نام کی ایک مثنوی کا مخطوطہ جو ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن میں ہے۔ امام الدین حسینی عارف سے منسوب ہے [۳]۔

شہادت الحقیق

یہ شاہ میرآن جی کی ایک طویل نظم ہے اس کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور دونوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاصی طویل نظم ہے اور شاہ میرآن کی دوسری نظموں کے مقابلے میں زیادہ سلیس بھی ہے [۴]۔ اس میں انھوں نے اپنے مرشد کمال الدین بیابانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ سب سے بڑی خوبی اس نظم کی یہ ہے کہ وہ نظم کو اُردو زبان میں لکھنے کی معذرت کرتے اور لکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو عربی جانتے ہیں نہ فارسی ان

---

[۱] "اُردوئے قدیم" صفحہ ۲۸۶ (جلد اول)

[۲] "تذکرہ اُردو مخطوطات" صفحہ ۲۸۶ (جلد اول)

[۳] " " ۲۸۶ (")

[۴] "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۵۱

کے لیے ہندی میں یہ باتیں لکھی گئی ہیں :

اشعار یہ ہیں :

" یو دیکھت ہندی بول — پن معنے ہے نپ تول
کڑوے پن سو رس — پھل یا کے جو پھنس
جیسے مغز میٹھا لاگے — تو کیوں من اس تھے بھاگے
ہے کڑواں کیسا اہیرا — گھوڑا اوپر پڑیا ہیرا "

خوش نغز یا خوش نامہ — اس نظم کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کیا ہے اور وہ اس نظم کو دورِ قدیم کی دلکش ترین نظموں میں شمار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یہ ہیں :

" یہ نظم بہ اعتبار زبان جذبات اور بیان دورِ قدیم کی چند دلکش ترین نظموں میں سے ہے " [1]

اس نظم میں معرفت الٰہی کے مطالب کو ایک مثالیہ (Allegory) کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثالیہ قصہ ایک لڑکی "خوشی" کے اطراف گھومتا ہے۔ "خوشی" گو ایک لڑکی ہے لیکن مثالیہ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سالک کو معرفت الٰہی کے حصول سے جو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اسے استعارتاً "خوشی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قدیم ادب میں نظم کے ساتھ قصے کو جوڑنے کی شاید پہلی مثال ہے اور مثالیہ کے اعتبار سے یہ سیدھی سادی نظم ابتدائی خاکہ ہے۔ "خوشی" کا کردار مصنف نے اشاروں میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ ایک بھولی بھالی لڑکی ہے اور اسے خدا کی لگن لگی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ میراں جی سے عرض کرتی ہے کہ میرے حال پر رحم کیجیے۔ مجھے دنیا اور اس کی ندرتوں سے کچھ غرض نہیں۔ میں تمہاری محبت کی بھوکی ہوں۔ تب وہ اسے دین اور معرفت کی باتیں بتلاتے ہیں بالآخر اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ہاتف خوش خبری دیتا

---

[1] " اردوئے قدیم " صفحہ ۸۱

ہے۔ فرشتے ادب سے حاضر ہوتے ہیں اور آسمان سے نور کے طبق آتے ہیں۔ یہ خوشنودی کا آخر وقت ہے۔ وہ اس دنیا سے چلی جاتی ہے۔ اس منظر کو میرآن جی نے بڑے موثر طریقے سے بیان کیا ہے۔ یہ منظر بڑا دلکش اور دل گداز ہے۔

خوش نغز

یہ طویل مثنوی تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ایک مثالیے کے پیرائے میں معرفت کے نکات بیان کیے گیے ہیں۔ یہاں بھی "شہادت التحقیق" کی طرح ایک لڑکی "خوش نغز" ہے وہ اپنے پیر میرآن جی سے معرفت کے بارے میں سوالات کرتی ہے اور پیر اسے وضاحت سے سمجھاتے ہیں۔ یہ اہم دینی یا علمی باتوں کو عوام کے لیے قابل فہم بنانے کا ایک پرانا طریقہ تھا چنانچہ سنسکرت میں کئی کتابیں اسی طرح سوال وجواب کی صورت میں لکھی گئی ہیں اور اُردو میں بھی عرصہ تک یہ طریقہ جاری رہا۔ یہ مباحث معرفت، روح، مراقبہ، عقل، عشق۔ توحید اور الحاد جیسے اہم مسائل پر حاوی ہیں۔

شاہ میرآن جی کی نثری تصانیف کئی بیان کی جاتی ہیں ان میں سے حسب ذیل مشہور ہیں:

(۱) گلباس (۲) جل ترنگ (۳) سب رس (۴) شرح مرغوب القلوب " رسالۂ تصوف"

"گلباس" اور "جل ترنگ"

ان رسایل کا تذکرہ ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زور کی تصانیف میں نہیں ملتا۔ صرف حکیم شمس اللہ قادری نے ان کا حال لکھا ہے حکیم صاحب لکھتے ہیں:

> حضرت میران جی شمس العشاق نے نثر اُردو میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ منجملہ ان کے دو رسالے ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ ایک کا نام "جل ترنگ" اور دوسرے کا "گلباس" ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں اور شاہ صاحب نے ان میں تصوف کے اسرار و نکات تمثیل کے پیرائے میں بیان کیے ہیں [۱]

مجھے اس کا کوئی نسخہ نہیں مل سکا۔ پتہ نہیں کہ حکیم صاحب کو یہ رسالے کہاں دیکھنے کو ملے تھے

---

[۱] ملاحظہ ہو "اُردوئے قدیم" صفحہ ۱۱۶

انھوں نے اس کا کچھ پتہ نہیں بتایا۔

شرح مرغوب القلوب میرآن جی کی نثری تصانیف میں "شرح مرغوب القلوب" خاصی اہم ہے اس کا تذکرہ کئی علما نے کیا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے کتب خانے میں اس کے دو نسخے تھے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں :

" یہ چھوٹا سا رسالہ نثر میں ہے اس کے بھی میرے پاس دو نسخے ہیں اور دونوں میں یہ حضرت میرآن جی کی تصنیف بتایا گیا ہے "

مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے مطالب کی تفصیل بھی لکھ دی ہے :

" شروع میں حمد و نعت اور متفرق حدیث و آیات کے ترجمے اور مختصر سی تفسیر کے بعد اسے دس باب میں تقسیم کیا ہے جس کے عنوان یہ ہیں :

پہلے باب میں توبہ۔ دوسرا باب طریقت کا۔ پچھانت کرنا نفس۔ دل۔ روح۔ سرِ ذات۔ شریعت۔ حقیقت، معرفت، دسواں باب سفر کا۔

ان بابوں میں یہ التزام رکھا ہے کہ پہلے وہ قرآن کی آیتیں مگر زیادہ تر حدیث نبوی لکھتے ہیں اس کے بعد ترجمہ اور مختصر تشریح کرتے ہیں مضمون کے لحاظ سے یہ کتاب بہت معمولی ہے۔ اور کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ البتہ زبان کی تاریخ کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔[1]

ڈاکٹر زور نے مولوی عبدالحق صاحب کے برخلاف اس کے نو باب بتائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

" یہ کتاب نثر میں ہے۔ ایک قدیم ترین دکھنی نثر ہونے کے باعث اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لمبی چوڑی تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو نو ابواب پر منقسم ہے اس میں صوفیوں کے مختلف مذہبی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے "۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ "اردو" ۱۹۲۶ء اپریل۔ "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۶۱

[2] "اردو شہ پارے" صفحہ ۲۶

لیکن حکیم شمس اللہ قادری کو اس بارے میں ان دونوں محققین سے اختلاف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تصنیف میراں جی شمس العشاق کی نہیں بلکہ میراں جی خدا نما کی ہے۔ یہ نتیجہ انھوں نے حکیم محمد قاسم ماہر سمیات کے کتب خانہ والے مخطوطے سے نکالا۔ جیسا کہ ان کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے:

"ہمارے مخدوم مولانا عبدالحق صاحب نے اسے حضرت میراں جی شمس العشاق کی تصنیف بتایا ہے" جن کا ۹۰۲ھ میں انتقال ہوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ ہم نے ڈاکٹر محمد قاسم ماہر سمیات کے کتب خانہ میں دیکھا ہے۔ اس کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت میراں جی خدا نما کی تصنیف ہے۔ یہ بزرگ عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ۱۰۷۰ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ انھوں نے تمہیدات "عین القضاۃ ہمدانی" کی شرح بھی لکھی ہے" [۱]

حکیم صاحب نے اس کتاب سے تھوڑا سا اقتباس بھی دیا ہے۔ اور بظاہر وہ ڈاکٹر عبدالحق کی کتاب ہی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں دستیاب ہوا ہے۔ [۲]

کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطے میں اس کتاب کا نام ترجمہ مرغوب القلوب درج ہے اس کے صفحات کی تعداد (۱۴) ہے۔ اس کے مطالعے سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کے دس باب ہیں۔ ابواب کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا باب + توبہ کا بیان ہے بقول مصنف:

توبہ یوں کرے رو رو کر خدا کے فراق میں تو یوں رو ہور انکھیاں کی پانی سوں ندیاں بہا ہور توبہ کر ہور خدا کا ہو۔ اس کے معنی ہیں کہ جیکوئی روتا ہے خدا کی دل اور رونا ریاست ہے بندگی تھے۔ خدا کے نزدیک ....

خدا کہیا ایک روتا ہے دوسرا ہنستا ہے بہوت ہنسی سے دل مرتا ہے ہر دم مین

---

[۱] "اردوئے قدیم" طبع سوم صفحہ ۶۹

[۲] ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر ۶۱۲ فن تصوف

توبہ کر بعدازان بندگی کر ؎

دوسرا باب ؎ پہچانت کرنا نفس - دل - روح - سر - نور - ذات - شریعت - طریقت حقیقت - معرفت اپر بولیا کیا ہے سوای معنی ہر ایک آدمی کے وجود میں ای چھ چیز ہے - یون خدائے تعالیٰ ہر یکس کون یو نچھ پیدا کیا - یک دل - یک روح - یک سر - یک نور - یک ذات - ای سب ایک اچھکر ولی اپنی صفت پر جدا جدا نادن ہوتے ہیں - سو پیر تھی سمجھنا ہے -

خدا کہیا تحقیق آدمی کے تن میں دل ہے - ہور دل میں عارف الوجود ہے - ہور عارف الوجود میں روح ہے ہور روح میں سر ہے - ہور سر میں نور ہے - ہور نور میں خدا مین ہون کہیا ہے - یون خدائے تعالیٰ ہر یکس کو یو نچھ پیدا کیا ہے - ایک نفس ایک دل - ایک روح یک سر - یک نور ؎

تیسرا باب ؎ وضو کا ای تشریف پیغمبر تھی ہے وضو کرنے مین نماز حاصل ہوتا ہے - ؎

چوتھا باب ؎ دنیا کون ترک کر دینا سو کہی دنیا کون چھوڑ دیں گے بدل خدا تی خدا کی مدت سون ؎

پانچواں باب ؎ تجرید ہور تفرید ہونی کا بولی ہین - خدا کون پانی کون سالک اس بات مین تجرید ہور تفرید ہو وی خدا کون پاوی

چھٹا باب ؎ اپنی پچھانت سو نور محمدؐ کا اس پچھانت مین بیناجون غواصی دریا مین بیکر موتی لیاتا ہے - یون اپنی پچھانت مین بیکر اس میں کی موتی لیاوی پرہیزگاریکا ہور توکل کا کسوت کری باج تون خدا کی پچھانت کا شربت کیون پی سکیے گا -

ساتواں باب ؎ عشق کا جان کہ عشق قدیم ہے - دل میں جو کلیجا سب لہو سون بھریا ہے یون جان ہور عشق مین ہین - عشق صغیر - ہور عشق کبیر - ہور عشق اوسط - عشق حقیر سو بندیا نکا خدا سون محبت رکھنی کا ہور عشق کبیر

سو خدا کا بندیاں میں محبت رکھیا ہور منگیا عشق او سطامیانہ دو کی میانیکا راز ہو
دومیکا لطافت اس کا انت نین اس کا بیان نہ کہیا جاسی۔ ؎

آٹھواں باب ؛ معشوق کا یاد کرنا سو بولی میں عاشق معشوق کی یاد میں یوں اچھے
دوسرا کوئی اسے یاد نا آوی ؎

نواں باب ؛ فنا ہور بقا ہوئے کا کہے ہین ؎

دسواں باب ؛ سفر کا تمام کتاب سفر دایم چلتا اچھ اس بات میں ادنچا نیچا خوب
برادیک ای بات بھوت دور ہے کہیں اپنے کون تو جا کاچ یقین
تون تصدیق کا توشہ کر خدا کی مدت سواں ؎

میرا خیال یہ ہے کہ یہ کتاب وہی ہے جس کا ذکر مولوی عبدالحق اور حکیم شمس اللہ قادری نے شرح مرغوب القلوب کے نام سے کیا ہے۔ کیونکہ جو اقتباس ڈاکٹر عبدالحق نے دیا ہے وہ کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطے "ترجمہ مرغوب القلوب" میں موجود ہے۔

"شرح مرغوب القلوب" کا ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں بھی موجود ہے۔[1] لیکن اس کو پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے شاہ امین الدین اعلیٰ کے رسائل میں شمار کیا ہے۔ اور اس غلط فہمی کا سبب غالباً یہ تھا کہ یہ رسالہ شاہ امین الدین اعلیٰ کے رسایل میں لکھا ہوا ہے جس کا مجموعہ کتب خانہ میں موجود ہے[2]۔ اس رسالے کے بارے میں پروفیسر صاحب نے لکھا ہے۔

؎ یہ رسالہ حضرت خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" سے ملتا جلتا ہے
بعض ابتدائی اور درمیانی حصے بالکل مطابق ہیں اکثر مقامات مختلف بھی ہیں بہت
ممکن ہے اس رسالے اور "معراج العاشقین" کا ایک ہی فارسی ماخذ ہو ؎

واقعہ یہ ہے کہ یہ رسالہ نہ تو خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" سے ملتا جلتا ہے اور نہ اس

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۳۰ - ۳۱

[2] ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۲۶

رسالے اور "معراج العاشقین" کا ایک ہی ماخذ ہے۔ بلکہ یہ رسالہ "شرح مرغوب القلوب" ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے جو اقتباسات نقل کیے ہیں وہ سب "شرح مرغوب القلوب" کے ہیں۔ ابواب کی تفصیل بھی نہیں ہے۔

سب رس

میراں جی کی اس تصنیف کا ذکر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی تصنیف کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اسے میراں جی کی نثری تصانیف میں شامل کیا ہے اور لکھتے ہیں :

"یہ کتاب دکھنی نثر میں ہے اور شاہ وجیہ الدین کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اس کا ایک مخطوطہ ۱۱۸۱ھ آغا حیدر صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے کل ۱۸۸ ورق ہیں ہر ورق میں ۲۶ سطر۔ زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے چونکہ اُردو کی ابتدائی نثری کتابوں میں ہے اس لیے یہ مخطوطہ خاص طور پر قابل قدر ہے" [۱]

حامد حسن قادری نے بھی غالباً "داستان تاریخ اُردو" میں مصنف "اُردو شہ پارے" ہی سے اس کتاب کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے ان ہی تفصیلات کو درج کیا ہے۔ جو "اُردو شہ پارے" میں موجود ہیں وہ لکھتے ہیں :

"سب رس" نام کا ایک رسالہ شاہ میراں جی نے ملا وجہی کی "سب رس" سے پہلے لکھا ہے [۲]"

حامد حسن قادری کے "اُردو شہ پارے" سے مواد اخذ کرنے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے وہی اقتباس دیا ہے جو "اُردو شہ پارے" میں موجود ہے۔

مجھے "سب رس" کا جو نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوا ہے وہ خاصہ ضخیم ہے یہ مخطوطہ (۳۱۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں ایک ترقیمہ بھی ہے جس سے اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں روشنی پڑتی ہے۔ ترقیمہ حسب ذیل ہے :

---

[۱] "اُردو شہ پارے" صفحہ ۲۶
[۲] "داستان تاریخ اُردو" صفحہ ۳۶

❊ المسمی بہ "سب رس" تصنیف شاہ میراں جی شمس العشاق فرمودہ
عصمت بلقیس زماں مریم زمانی خدیجہ سلطانہ ❊

نسخے کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے :

❊ کلام میراں جی شمس العشاق کہ کلام شاہ وجیہہ الدین بزبان دکھنی۔ ترجمہ
نمودہ اند و "سب رس" نام کردہ اند ❊

متن کے آغاز پر یہ لکھا ہوا ہے :

❊ کلام میران جی شمس العشاق ❊

آغاز اس طرح ہوتا ہے :

❊ اَللّٰھُمَّ وَصَلِّ علیٰ مُحَمَّد ۔ جنوکی بات خداکی بات ہیں سند کتاب تاج الحقایق ،
رواج الحقایق، سراج الحقایق، معراج الحقایق بجن کتاب کون مطالعہ کرنی خدا بیک
پایا جایئے۔ عشق سردا ہے عشق خلاصہ موجودات ہے۔ عشق صاحب کائنات ہے
جان بی عشق ہے وہ عشق کے باٹ ہے .... راگ عشق کا راز۔ ریجہ عشق کا
راحت کیسا عشق کی جھکور خوشبوئی عشق کے باس حسن عشق کا اس سات گنج تے جو
کوئی مرکراو عشق نیئں بلکہ آدم نیئں وہ بلا تو بہ استغفراللہ جکوئی اس دنیامیں یو
سات .... خوش نیئں کنا اس جھوناسیں ہے۔ تالایق مرے تو خوب ہے۔
جو کوئی عاشق کون اس سات چیز تے منع کرے خدائے تعالیٰ اس
دنیا میں اسے فنا کرے خوبصورت دیکہ۔ راگ سین ریجہ خوش بوی خوش کر
کیف کہا بی پرواچہ اور شعر پر خدا کون بھوت یاد کر۔ محبت دن پدھارا اپنی کام
میں مشغول رہ۔ کس سون نکو چیکر یہاں ارام یان کام یان مال یان وصال یا یو گھر میں
باقی جو کچھ تو دیکھیے گا سنیئے گا سو درد سر ہے۔
مشاہدے مراقبے میں پرکتیا سیر طیبر میں تون ہی رہے گا۔ اس زمانے
میں کشف و کرامات کسی ہوا جو تجھے ہو دئے گا۔ یو جون کیمیا کرے گا دھندا نیئں ہوتا

اور ہو آئینچہ کا کردل بر آتا ہے۔ سیدھی بات پکڑ گھر کو آتون کون زبان میں کا ہی لحون جاتا۔

ارے طالب طالب کامل او تجہ میجہ کیا تج تے جدا ہے۔ خدائے تعالیٰ کتا ہے یومنوں بالغیب یعنی مومن وہی کہ غیب پر ایمان لیاوے اس غیب میں مون اس حد لگ جا کہ تجھے خدائے تعالیٰ حاضر دس آوئے عالم غیب میں تمن سیر کر............

ارے طالب تجہ میں یو تمام عالم ہے یو تمام عالم تج مین دس آتا اور اگر تج میں یو تمام عالم نا اچھی تو اتیا عالم یو تجہ مین کان دیکھیا جاتا ہے۔ جو کچھ ہے سو تو نجہ ہے۔ جیکچہ ہے سو جیکچہ تون منگنا سو تج میجہ دیکھے تون تجے نئین پایا ہے۔ اور بھی نئین پایا ہے کہ تجہ مین بھی ایک ہے۔ ایکون پانا او رآپس مین ہے۔ اوسی بھی پانان اس دو نون کون پانا بہو تہ مشکل کام ہے۔ جہ عارف عاشق اس دونون کون پایا ڈھدندتے ڈھدندتے اس حدلگوں آیا وہ تمام ہے اس عالم میں تی لجاکر کیون پیدا کریگا۔ سو وہیچ جانی اس کی خوشی وہ صاحب اختیار ہے۔ دی یو انسان بھلا برا سمجھتا اسی کو خدا کا یاد اور فعل نیک درکار ہے ؎

رسالے کی وجہ تصنیف پر ذیل کی عبارت سے روشنی پڑتی ہے :

؎ اس رسالے مین ہمین کئین عشق کے عالم کی بات کتی ہیں کئین عقل کے عالم عالم کی بات کتی ہیں جن عالم کی بات کتی ہیں اس عالم سون اس بات کون پانا اگر سمجھے تو خوب و اگر نین سمجی تو ٹک اندیشا ٹک فکر کرنا یعضے جا کا وقت درکار ولی کچہ خاطر میں نا لینا اس کلام کون پرتی اس کلام کی مقصود کو اپنٹرنے ہر بی فہم کون کان فہم ہے۔ جکوئی جانب اللہ ہے وو سمجھے گا تحقیق جانے گا کہ یو جانب اللہ کا کلام ہے۔

اس رسالے میں فصاحت بلاغت باٹ (بات) کا مانا ناز نیاز اسرار

سب بھرپور ہے اگر ہمارے کلام کون کوی نا بجی تو ہمارا تقصیر نیئں اس کی سمجھ
مین قصور ہے پاؤ آدمی کو سمجھتا ہے ادھا یون کون سمجھتا ہے۔ پونا پوری کون
سمجھتا ہے۔ پورا برا بلنی کون سمجھتا ہے یان سمجھنا کام ہے۔ ہر کسی کی سمجھ اپنی مقدار
ہے بات بولتا ہے۔

ہر ٹھار ایک مراتب ایکہ مقام ہے نادان کی بات دانایان کے آگی
اعتبار نیئں دھرتی ولی...... بچارے بہتی تو ہونا سب پھل چہ تو کانتی
کون بیچنا... ؎

اختتام کی عبارت یہ ہے:

اگر تمنا خدا فرصت دے تو ہر مہینی کون چودوین رات کی چندنی مین
ہمارے دوستی سب دوستان مل کر ایک مجلس کرو چاند کی رات سو چودوین
رات ہے کہ اس رات چاند کمالیت کون اپر آتا ہے۔ چاند کی مبارک باری
اس رات کون کرنان کہ بھوتیچہ روشن ہوکر چودہ کلا پر چڑتا ہے۔ آنند کی رات
ہے چودویں رات بہت بڑی رات ہے۔ بھوتہ فیض کی رات ہے۔ اس رات
جاگنا ایک کام ہے اس رات البتہ خدا کی یاد سون گذارنا خوشی سون گذارنا جلو
اس بات کون نہ انپڑے اس کا سہل نام ہے عام لوکان کون بھلی چاند کی رات
ہے ہور عاشق لوکاں کون چودوین چاند، چاند کی رات ہے چاند وہیچ کہ جس رات
سب راتاں تھی چندنا زیاد پرے چندنا نین لوکان کی چاندرات یو کیا بات۔

چاند آیا موں دکھلایا ولی چاند کی رات نیئں آئی چاند کی رات ہوا عالم
میں اندھارا یو کیسی چاندرات رہی بھائی جو کیف خوش سو کیف کھاؤ پھول پہنو
خوشبوی لگاؤ راگ سنو خرچ کون خدا دینے ہارا ہے۔ اعتقاد درست رکھو نکو اور

؎ ملاحظہ ہو مطبوعہ "تاج الحقایق" صفحہ (۳۴) - اس میں بھی یہی عبارت درج ہے۔

اگر ہر مہینے مین کون میسر نہ ہوئے تو سال کون ربیع الاول کے مہینے میں اکبار تو جیون
میں فرمای تیون سب مل کر خوشحال کرو کتیا جفا ہور محنت سون عمر گذارنے کی بری
تو بھی غم کون ہیں سے خالی کرو ایک ساعت بفراغ دل خدا کون یاد کرنا تمام عمر کا
دل کو ہلاک نکو کرو برے مردہ دل ہوی گے۔

جکچہ ہے سو یو ہے جس وقت اس خوش حالی مین بیٹھیگی تو ہمنان سنگین
کے آتنان غم کون دل پر نکو آنی دیو۔ خدا کی محبّت سون مشغول اچھیو عیش عشرت
کے چھپر لاو غم کا کالا مون کرو۔ جانی دیو خوش حالی کرنا پھر یون کرنا جو غم کا دیان
گذرنا نہ تھا بلکہ احسان جو کر اچھنا ہور آتنان مخطوط ہونا جو اپنے آپس کون صبر
ہووی خوشی سی کتی سو خوش حالی اسے نن تو باقی خوش حالی گھر میں گھر۔

جکوئی خدا کا یار ہے اسی خدا کی یاری واجب ہے۔ باری مہینی میں
ایک بار تو بھی عاشقان کو شب بیداری واجب ہے۔ اے دیوانے ہوز بھی
تمین ...... (کرم خوردہ)

کان ہور خدا کا یاد کان جو لک فرصت ہے تو لک غنیمت جانو دیکھو
تمنان جیسے لوکان تمھاری حضور کیوں جاتی ہیں۔ دسریان کی حال تھی اس کا حال
پچھانو جیون دنیا کی لوک جھو کہ جیو کہ مرتے ہیں ؎

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے "ڈاکٹر زور صاحب نے" سب رس "سے ذیل کا اقتباس بھی دیا ہے :

؎ جکوئی عاشق کون اس سات چیز تے منع کرے خدائے تعالیٰ اسے دنیا سون
فنا کرے خوبصورت دیکہ لاک سن یہ جہ خوش ہوئی خوش کہ کیف کیا بے پروا اچھ
شعر بر خدا کون بہوت یاد کر محبت سون بدھا اپنے کام میں مشغول رہ کس سون نکو
چیکریان آرام یان کام یان حال یان وصال بان یو کھرے بالے جو کچہ تون دیکھیے
گا سو تو بنگا سو سب درد سر ہے۔ مشاہدے مراقبی ہیں پر کھتیا سیر طیرین تو ن رھیگا [1]

---

[1] "اردو شہ پارے" صفحہ ۳۲۱

"سب رس" یا "تاج الحقایق"؟ پروفیسر عبدالقادر سرفراز نے بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات مرتب کی تھی۔ اس میں وجہی (مصنف "سب رس") سے ایک اور تصنیف "تاج الحقایق" منسوب کی ہے[1] اور اس کا اقتباس بھی دیا ہے۔ اور یہ میرے اقتباس "سب رس" ہی کا ایک حصہ ہے[2]۔

فہرست میں حسب ذیل اقتباس منقول ہے :

" کلام مولانا وجیہہ الدین اللہم صلی علی محمد۔ "تاج الحقایق" "معراج الحقایق" "رواج الحقایق" "سراج الحقایق" "جن کتاب کو مطالعہ کرنی تھی "

اس کے علاوہ "تاج الحقایق" کی جو خصوصیات فہرست میں بیان کی گئی ہیں وہ سب اس "سب رس" میں موجود ہیں۔ سرفراز صاحب لکھتے ہیں :

" یہ دکھنی زبان میں ایک نثری تصنیف ہے جو انسان کے اخلاقی اور روحانی مسائل سے بحث کرتی ہے اس کے مصنف وجیہہ الدین سب رس کے مشہور مصنف ہیں " خصوصیت جو انھوں نے بتائی ہے یہ ہے کہ اس کے ابواب " اے طالب " سے شروع ہوتے ہیں جو "سب رس" کی بھی خصوصیت ہے۔ "

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتاب "تاج الحقایق" کے نام سے کیسے موسوم ہوئی۔ اور وجہی کے نام سے کیسے منسوب ہوئی۔ ایک بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ "سب رس" کے نام کی وجہ سے یہ کسی مرحلے میں وجہی کے نام سے منسوب کردی گئی۔ کیونکہ وجہی کی ایک کتاب "سب رس" نامی موجود ہے۔

---

[1] ڈاکٹر عبدالحق نے بھی دیباچہ "قطب مشتری" اور دیباچہ "سب رس" میں وجہی کی تیسری تصنیف تاج الحقایق کا ذکر کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو مقالہ ھٰذا صفحہ (   )

اس طرح اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کافی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اس میں مزید اضافہ اس طرح بھی ہو گیا ہے کہ اسی "سب رس" کو "تاج الحقایق" کے نام سے مجلس دکھنی مخطوطات حیدرآباد دکن کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اور غالباً اسے ڈاکٹر زور صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کے (۴۸) مطبوعہ صفحات، مجھے بڑی کوشش کے بعد دستیاب ہوئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہی "سب رس" ہے۔ آغاز سے لیکر ۴۸ صفحے تک عبارت لفظ بہ لفظ ایک ہی ہے۔ اس لیے اس کے نام اور مصنف دونوں کے بارے میں کافی شبہات کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے مثلاً یہ کہ :

۱۔ آیا اس کتاب کا نام "سب رس" ہے یا "تاج الحقایق" ؟

۲۔ اس کتاب کے مصنف "شاہ میران جی شمس العشاق" ہیں یا "وجہی" یا کوئی اور ــ ؟

۱۔ ڈاکٹر زور کے "اُردو شہ پارے" کے بیان کے مطابق یہ "سب رس" ہے اور شاہ میران جی کی تصنیف[1] ہے جس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ وجیہہ الدین کی کس تصنیف کا ترجمہ ہے مجلس دکھنی مخطوطات کی زیر طبع کتاب میں اس کا مطبوعہ نام تو ظاہر نہ ہو سکا۔ لیکن مطبوعہ صفحات کے سرنامے پر سرخی سے "تاج الحقایق" لکھا ہوا ہے۔

۲۔ پروفیسر عبدالقادر سرفراز کا خیال ہے کہ یہ "تاج الحقایق" ہے اور وجہی (مصنف سب رس) کی تصنیف ہے۔

اس طرح اس ایک ہی کتاب کے بارے میں اتنی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ یہ "سب رس" بھی ہے اور "تاج الحقایق" بھی، نیز یہ میران جی کی تصنیف بھی ہے اور وجہی مصنف "سب رس" کی بھی۔

ظاہر ہے کہ ایک ہی کتاب کے دو نام نہیں ہو سکتے اور ایک ہی کتاب کے دو مصنف ہیں جن کے زمانے میں تقریباً ایک سو سال کا فرق ہے۔

---

[1] اُردو شہ پارے صفحہ ۲۶

واقعہ یہ ہے کہ یہ نہ تو " سب رس " ہے اور نہ وجہی کی تصنیف اس طرح اسے شاہ میراں جی سے بھی کوئی تعلق نہیں بلکہ میرا قیاس یہ ہے کہ یہ " تاج الحقایق " ہے اور شاہ وجیہہ الدین (۹۱۰ھ۔ ۹۹۸ھ) اس کے مصنف ہیں۔ اس قیاس کے اسباب حسب ذیل ہیں :

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ میراں جی کی " سب رس " کا کسی نے سوائے ڈاکٹر زور کے تذکرہ نہیں کیا اور ابھی مجلس دکھنی مخطوطات کی زیر طبع " تاج الحقایق " کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں ڈاکٹر زور صاحب کا خیال کتاب کے نام کے بارے میں بدل گیا اور " تاج الحقایق " کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حالانکہ " اردو شہ پارے " میں اسی کتاب کا اقتباس وہ " سب رس کے اقتباس " کے نام سے دے چکے تھے۔

(۲) اس غلط فہمی میں قطع نظر اس کے کہ " سب رس " کے نام کی وجہ سے وجہی کا نام بھی آگیا ہو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کتب خانہ سالار جنگ کے نسخے کے سرنامہ کی یا اسی طرح کی کسی اور " عبارت " سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہو چنانچہ کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطہ کے سرنامے کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے وہ کافی مبہم ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ " سب رس " میراں جی کا کلام ہے جس کا وجیہہ الدین کے کلام سے دکھنی میں ترجمہ کیا گیا۔ اور " سب رس " نام رکھا گیا۔ یہ عبارت نہ تو خود جزو کتاب ہے نہ اس کی اہمیت ترقیمہ کی سی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے شاہ وجیہہ الدین کے کلام کو وجیہہ کے جز کی مناسبت کی وجہ سے وجہی سمجھ لیا اور چونکہ وجہی کی تصنیف " سب رس " ہے۔ اس لیے اس کا نام " سب رس " رکھ دیا۔ حالانکہ " سب رس " نام کا پتہ سوائے اس الحاقی عبارت کے متن کتاب سے کہیں نہیں چلتا۔ حالانکہ وجہی مصنف " سب رس " نے " سب رس " کے نام کا تذکرہ سبب تالیف کے سلسلے میں واضح طور پر کر دیا ہے۔

اقتباس کا ایک اور سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وجیہہ الدین کا لقب بھی " میاں جی " تھا۔ میاں جی اور میراں جی میں التباس کی جو گنجایش ہے وہ واضح ہے۔ شمس العشاق لقب کا الحاق لکھنے والے کی طرف سے میاں جی کو میراں جی پڑھ کر ہوا ہے اسی مناسبت سے " ایجاد بندہ " کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۱) کتاب کے سرنامے پر جو عبارت درج ہے اس میں وجیہہ الدین کا کلام ہونے کی صراحت ہے۔
جس کے بارے میں التباس کی گنجایش نہیں۔

(۲) ہم کو یہ معلوم ہے کہ وجیہہ الدین کا لقب بھی میاں جی تھا جسے بعض وقت میراں جی
بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے شمس العشاق اور وجیہہ الدین میراں جی میں
فرق نہ کر سکنے کی وجہ سے میراں جی کے ساتھ جو لقب شمس العشاق مشہور تھا۔ اختراعاً بڑھا دیا۔

وجیہہ الدین نامی دو بزرگ گزرے ہیں۔

(۱) وجیہہ الدین یوسف

(۱) ایک وجیہہ الدین یوسف، شیخ نظام الدین بدایونی کے معاصر تھے لیکن کسی
بھی تذکرے سے ان کا صاحب تصنیف ہونا نہیں پایا جاتا۔

(۲) وجیہہ الدین علوی گجراتی

(۲) دوسرے وجیہہ الدین علوی گجراتی میراں جی کے معاصر تھے۔ اس لیے یہ قیاس بھی ٹھیک
نہیں ہوتا کہ میراں جی نے وجیہہ الدین کی کسی تصنیف کا اُردو ترجمہ کیا ہوگا۔ اس کے برخلاف اس
عہد کی تائید میں بہت سے دلایل ملتے ہیں کہ وجیہہ الدین، اس کتاب کے مصنف ہیں حکیم شمس اللہ
قادری۔ ڈاکٹر عبدالحق[۲]۔ پروفیسر حسن عسکری[۳] سب نے وجیہہ الدین کے اُردو میں صاحب تصنیف
ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں:

"آپ کے مریدوں نے "بحر الحقایق" کے نام سے آپ کے ہندی ملفوظات
جمع کیے ہیں"۔[۱]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"آپ کے مریدوں نے آپ کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے ہیں۔

---

[۱] "اُردوئے قدیم" طبع ثانی صفحہ ۲۴

[۲] "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۳۰

[۳] "مطبوعہ روئیداد ہسٹری کانگریس" منعقدہ ناگپور سنہ ۱۹۵۰ء

جس کا نام "بحر الحقایق" ہے۔ اس میں جگہ جگہ ان کے ہندی اقوال درج ہیں شیخ کے مریدوں سے سوال کرتے ہیں اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ سوال تو فارسی میں کہے ہیں لیکن جواب خود شیخ ہی کے الفاظ میں ہندی میں تحریر کیے ہیں "[۱]

پروفیسر حسن عسکری نے اپنے ایک مضمون "پندرھویں صدی کے شمالی بہار کے ایک شطاری صوفی (امام الدین راجگیری)"[۲] میں ان کے اردو میں تصنیف و تالیف کرنے کا ذکر کیا ہے۔ "وہ گلزار ابرار"[۳] کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ :

"انھوں نے بہت سی مشہور کتابوں پر حواشی لکھے بہت سی اعلیٰ پایہ کتابیں بھی لکھیں جو ابتدائی اردو کے اچھے نمونے ہیں "

کتاب (س۔ب۔س) کے آغاز کی عبارت سے کتاب کے نام "تاج الحقایق" کا پتہ چلتا ہے میرانجی شمس العشاق کی تصانیف "خوش نامہ" "خوش نغز" یا اسی دور کے بعض دوسرے مصنفین کی کتابوں کے ناموں میں مشابہت کے التزام کے نمونے پر وجیہہ الدین کی تصانیف کے ناموں "بحر الحقایق" اور "تاج الحقایق" کی مناسبت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ترقیمہ میں لفظ "فرمودہ" بہت بامعنی لفظ ہے۔ کیونکہ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف خدیجہ سلطانہ کی فرمایش پر ہوئی تھی۔ خدیجہ سلطانہ نام کی دو خواتین بیجاپور میں گزری ہیں۔

(۱) خدیجہ سلطانہ حیات بخشی بیگم[۴] اور محمد قطب شاہ کی بیٹی عبداللہ قطب شاہ کی بہن اور محمد عادل شاہ (۱۰۲۳ھ۔ ۱۰۶۷ھ) کی بیوی تھی۔ اور بیجاپور میں حاجی بڑے صاحب کے نام سے موسوم تھی۔

---

۱ ؎

۲ ؎ مطبوعہ روئیداد ہسٹری کانگریس منعقدہ ناگپور ۱۹۵۰ء

۳ ؎ مخطوطہ حبیب گنج

۴ ؎ یہ ملکہ گولکنڈہ کی تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ یہ اردو کے پہلے شاعر محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی تھی۔

(۲) خدیجہ سلطانہ ابراہیم عادل شاہ (۹۴۱ھ - ۹۶۵ھ) کی بہن اور میراں حسین نظام شاہ (۹۹۶ھ) کی بیوی تھی۔ قیاس یہ ہے کہ ان دوسری خدیجہ سلطانہ کی فرمایش پر "تاج الحقایق" لکھی گئی تھی۔

خدیجہ سلطانہ کی زندگی کا بیشتر حصہ احمد آباد میں گزرا اور وجیہہ الدین کا وطن بھی احمد آباد ہی تھا۔ خدیجہ سلطانہ کو علم و ادب سے دلچسپی عادل شاہی خاندان سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس لیے غالباً شاہ وجیہہ الدین نے شاہ میراں جی شمس العشاق کی بعض کتابوں کی طرح جو خاص طور پر خواتین کو احکام سکھانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ اس خاتون کے لیے یہ کتاب لکھی ہوگی۔ اگر خود تصنیف نہ بھی کی ہو تو یہ تو یقینی ہے کہ اس کے استفادہ کے لیے یہ کتاب لکھوائی گئی۔

بہر حال ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ علما نے "سب رس" اور "تاج الحقایق" کو جو دو علحدہ علحدہ کتابیں بتایا ہے وہ صحیح نہیں بلکہ اس کا نام "تاج الحقایق" اور یہ شاہ وجیہہ الدین گجراتی کی تصنیف ہے۔

وجیہہ الدین علوی گجراتی ۔ حالاتِ زندگی

وجیہہ الدین کا نام سید احمد تھا اور میاں جی کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے والد سید نصر اللہ گجرات کے بڑے عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ وجیہہ الدین اور برہان الدین۔ برہان الدین کے بیٹے شاہ ہاشم حسینی العلوی[1] بھی اردو کے بڑے شاعر اور مصنف ہوئے ہیں۔

وجیہہ الدین ۹۱۰ھ[2] میں چنپانیر (محمد آباد) میں پیدا ہوئے اور ملا عماد الدین سے درس تدریس کی تکمیل کی محمد غوث گوالیاری کے خلیفہ تھے۔ ۱۹ صفر ۹۹۸ھ[3] میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، منطق، فلسفہ بیان و معنی وغیرہ میں جس قدر مشہور و متداول کتابیں تھیں ان سب پر حاشی لکھے تھے۔

ان کی تصنیفات کی تفصیل مولانا آزاد بلگرامی نے "سبحۃ المرجان"[4] میں لکھی ہے مولانا حبیب اللہ

---

[1] ملاحظہ کیجیے صفحہ مقالہ ہذا (　　)
[2] ڈاکٹر عبد الحق نے سنہ ولادت ۹۱۰ھ لکھا ہے۔
[3] "برکات الاولیا" میں ۹۹۸ھ لیکن "اخبار الاخبار" میں ۹۹۰ھ درج ہے۔
[4] "سبحۃ المرجان" صفحہ (۴۵۰)۔

اپنے ملفوظ میں لکھتے ہیں کہ ان کے چودہ سو خلفا تھے۔ ان کا مزار احمد آباد (گجرات) محلہ خان پورہ میں ہے اور کافی مشہور ہے [۱]۔

ان کے فرزند مولانا عبداللہ بھی صاحب تصنیف و تالیف ہوئے ہیں۔ (ان کی تصنیفات پر آیندہ صفحات میں بحث کی جائے گی)۔

مولانا محمد حسین آزاد مصنف "آب حیات" اور قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ مشہور شاعر ولی اورنگ آبادی ان ہی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی تصدیق مولوی عبدالحی رعنا مصنف "تذکرہ گل رعنا" نے بھی کی ہے۔ شاہ ہاشم علوی ان کے بھتیجے تھے۔ جو قدیم اردو کے اچھے شاعر گزرے ہیں۔

تصانیف: ان کی ایک تصنیف "تاج الحقایق" کا تذکرہ پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے دوسری تصنیف "بحر الحقایق" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ کتاب سوال و جواب کی شکل میں مرتب کی گئی ہے۔ مرید فارسی میں سوال کرتے ہیں اور شاہ صاحب (وجیہہ الدین) ان کے جواب اردو میں دیتے ہیں۔ کچھ اقتباسات نیچے درج کیے جاتے ہیں مجھے اس کتاب کے دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

لیکن حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر عبدالحق نے اس کے الگ الگ اقتباسات اپنی تصانیف "اردوئے قدیم" و "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے کام" میں درج کیے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو بزرگوں نے اس تصنیف کو دیکھا تھا۔

لفظ فرمودند کہ جس چیز میں ذوق و شوق پاوے اسے ترک نہ دیوے۔ [۲]

یعنی در آن چیز یکہ صوفی ذوق و شوق یا بد آن را ترک نہ دہد شخص گفت

اگر آن چیز متفق الحرمت باشد چہ کند انہ دا عراض نمود و فرمودند

۱: "برکات الاولیا" میں سے بھی حالات زندگی اخذ کیے گیے ہیں

۲: "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۲۶)

۔ بھونڈا ہووے سونا کرے ۔

لفظ عزیزے عرض کرد بخانہ دنیاداران نروم فرمودند

:کاہے دنیادار بھی اپیچ :یعنی اہل دنیا نیز از ما اند

لفظ می فرمودند طالب کشف نہ باید شد

اپنوں کون کا کشف ہووے یا نہ ہووے کام اس کا ہے

در حکایت فرمودند :

کیا ہوا جو بھوکوں موا بھوکوں موئے نین کیا خدا کون انپڑیا خدا کو انپڑنے کی استعداد ہور لفظ کسے [۱]

میں کہاں یا کدھاں ریاضت کیتی

لفظ فرمودند: جیسی تجلی پکڑے تیسا ارادہ دیوے اگر عبد کی تجلی پکڑے عبدیت ارادہ دیوے :

اور

(۱) کسے گفت کہ میاں جی شیخ فضل اللہ ترک درس کردند [۲]۔

فرمودند :- جب ترقی پکڑیں گے تب آپیں درس کہیں گے ۔

(۲) عزیزے التماس کرد اگر اجازت شود اربعین نشینم

فرمودند :- اس سین ہور کیا خوب ہے اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہووے

(۳) شخصے عرض کرد کہ عارف کرا گویند

فرمودند :- عارف اسے کہویں جو خدا سوں بھریا ہووے

(۴) آپ کا ایک مقولہ ہے۔ ؛

---

[۱] یہی جملہ حکیم شمس اللہ قادری نے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ اردوئے قدیم صفحہ ۲۳۔ یہ اقتباس اردوئے قدیم میں درج ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵

[۲] یہ اقتباس "اردوئے قدیم" میں درج ہے ملاحظہ کیجیے صفحہ ۲۵ ۔

اگر کسی کون تھوڑی بھی صفا ہووے جو حرام لقمہ کھاوے یا حرام فعل کرے تو
پتیج پاوے دوجے بار بھی پاوئے تیجے بار بھی پاوئے
دوسرے تیسرے

اس سے ظاہر ہو گیا کہ "سب رس" جسے ابھی تک شاہ میران جی سے منسوب کیا جاتا تھا۔ درحقیقت شاہ میران جی کی تصنیف نہیں، چونکہ نثر کے تعلق اس کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔ اس لیے اس تصنیف کا ذکر یہاں کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس عہد کی تصنیف ہے۔

شاہ میران جی اور وجیہہ الدین علوی گجراتی کے علاوہ شاہ علی محمد جیو گام دھنی۔ شیخ خوب محمد چشتی اور شیخ بہاؤالدین برناوی خاتم التارکین بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ گو فی الحال ان بزرگوں کا کوئی نثری کارنامہ ہماری دسترس میں نہیں لیکن ان کا منظوم کلام دستیاب ہوتا ہے۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی وفات ۹۷۳ھ سید احمد کبیر کی اولاد میں سے تھے۔ شاہ علی جیو نے اردو میں بہت سے دوہرے لکھے۔ پروفیسر محمود شیرانی ان کے متعلق لکھتے ہیں :

"جب مخدوم بہاؤ الدین برناوی خاتم التارکین بسبیل سیاحت گجرات تشریف لے گئے۔ شاہ علی جیو کے مہمان رہے۔ اس قیام کے زمانے میں میزبان نے اپنا ہندی کلام جو عجیب و غریب اور لذت بحور میں لکھا تھا سنایا اور اپنا ایک رسالہ جو نکات و دقایق موحدانہ پر مشتمل تھا ہدیہ دیا"[1]

شاہ علی جیو کا کلام ان کے مرید شیخ حبیب اللہ نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ مدون کر کے اس کا نام "جواہر اسرار اللہ" رکھا ہے۔

ان کا اسلوب بیان "میراں جی" سے ملتا جلتا ہے۔ مثلاً

نکتہ نہم: کھیں چڈھیا بھرو پا کھیلے ÷ ہنس تل بھی کھیں نہ میلے
آپین ناچے آپین گاوے ÷ آپین آپس بہار دکھاوے[2]

اور

نکتہ دہم: ایک سمندر وہ سات کھاوے ÷ دھنوس یا دل مینہ ہو آوے
وہی سمندر کر بوند کھاوے ÷ ندیاں نلے ہو کر چاوے[3]

شیخ خوب محمد چشتی گجرات کے رہنے والے اور شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ انھوں نے تصوف میں ایک مثنوی "خوب ترنگ" لکھی۔ پھر اس کی شرح فارسی زبان میں کی۔ فارسی شرح کا نام "امواج خوبی" رکھا۔

مخدوم بہاؤ الدین برناوی خاتم التارکین نویں صدی کی یہ بھی بڑی عظیم الشان شخصیت ہیں۔ ان کو فن موسیقی سے بیحد دلچسپی تھی۔

پروفیسر محمود شیرانی ان کے متعلق لکھتے ہیں :

---

[1] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۲۲۷ ۔ [2] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۲۲۰ ۔ [3] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۲۲۰

+ صرف دو شخص فن موسیقی میں یگانہ روزگار مانے گیے ہیں۔ امیر خسرو
اور مخدوم بہاؤالدین + لہ۔

کلبری۔ خیال۔ چٹکلہ۔ قوالی۔ ترانہ۔ دھرپد وغیرہ میں اشعار کہے۔ زبان کا نمونہ درج ذیل ہے:
: ان نینن کا یہی بیسکھ + ہوں تج دیکھوں تون نج دیکھ :

میراں جی کا فن یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ میراں جی کا طرز بیان اپنے مذکورہ بالا معاصرین سے زیادہ سلیس ہے۔ میراں جی کے معاصرین نے ٹھیٹ گجراتی لفظ استعمال کیے ہیں۔
مثلاً

ہوں (میں) اونڈا (کھر) (پپوٹے) فوفوٹے، وغیرہ۔

میراں جی ان کے بیٹے اور پوتے شاہ برہان اور شاہ امین الدین اعلےٰ کے ہاں گجراتی کا اثر اتنا گہرا نہیں گو انھوں نے بار بار اپنی زبان کو گجراتی کہا ہے۔
میراں جی کی تصانیف کے مطالعے سے ان کی حسب ذیل خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میراں جی نے نہ صرف ہندوستانی زبان اختیار کی ہے بلکہ ان کے فن کی خصوصیات بھی ہندوستانی ہیں۔ تصوف کی باتیں بیان کرتے ہوئے وہ ہندی شاعری کی تکنیک سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً عورتوں کی اصطلاحات میں سارے نکات بیان کرتے ہیں جیسے یہ کہ دنیا سسرال ہے آخرت میکہ ہے وغیرہ، اپنی نظموں، "خوش نغز" اور "خوش نامہ" میں بھی انھوں نے یہی نہج اختیار کیا۔
میراں جی سے پہلے عموماً فلسفیانہ مباحث صرف مذہب کے اطراف گھومتے تھے۔ لیکن میراں جی نے دوسرے موضوعات جیسے عشق، عقل کے بنیادی مسایل پر بھی اچھی بحثیں لکھیں، شرح

لہ: پنجاب میں اردو: صفحہ ۱۳۵

مرغوب القلوب " میں " عشق " کا بیان اس طرح کرتے ہیں :

" جان کہ عشق قدیم ہے عشق حقیر عشق کبیر ہور عشق اوسط عشق حقیر سو بندیا کا
خدا سوں محبت رکھنے کا ہور عشق کبیر سو خدا کا بندیاں میں محبت رکھیا ہور منکیا
عشق اوسط دوئی میٹا نیکا راز ہے "

اس طرح کے مباحث سے انھوں نے زبان میں وسعت اور زور پیدا کیا انھوں نے ہندوستانی اشیا اور ماحول کی تصویریں بڑی خوبی سے کھینچی ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہندوستان کا دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے۔

" بیان " سے قطع نظر ان کی " زبان " کی چند خصوصیات بھی قابل ذکر ہیں عجیب بات ہے کہ میراں جی اپنی زبان کو جگہ جگہ ہندی لکھتے ہیں لیکن ان کے فرزند نے اسے گجری بھی لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اُردو ہی کے نام ہیں۔ جیسا کہ میر حسن " سخن آفرینیان ہندی " میں اس کی توجیہ کی۔

" جب یہ زبان دکن آئی تو اس میں دکنی لفظ اور لہجہ داخل ہو کر دکھنی کہلائی
گجرات میں پہنچی تو اس خصوصیت کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی "
خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق نے بھی لکھا ہے
یہ ہے کہ :

" وہ زبان جن میں ان کا کلام ہے ہندی ہے لیکن گجری ہندی ہے " [۱]

میراں جی کی تحریروں کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے۔ غالباً اسی بنا پر ڈاکٹر عبدالحق نے ان کی زبان کو گجرات سے وابستہ کیا ہے۔ اور ان کی حسب ذیل گجراتی خصوصیات گنائی ہیں جو درج ذیل ہیں :

۱۔ " اچھنا " اور اس کے مشتقات میں گجراتی " چھے " کا اثر ہے۔

۲۔ " ہمن ۔ ہمنا " گجراتی " ہمنے " کا اثر ہے۔ " سینا " کی طرح " سیمنے " بھی گجراتی ہیں۔
فاعل و مفعول دونوں حالتوں میں استعمال ہوتا ہے۔

---

[۱] رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۷ء

۳۔ "اپن" "ہم" کے معنوں میں گجراتی ہے۔

۴۔ "المنا" (وقت گزارنا) "سونا" (برداشت کرنا) "ابھال" (بادل) "ایلڈر" (ورے) "ہیلاڈ" (پرے) "انجھو" (آنسو) "اندرا" (نیند) گجراتی کے الفاظ ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مولوی صاحب جس چیز کو گجرات کا اثر کہتے ہیں اس سے موجودہ زبان جو گجراتی کہلاتی ہے، وہ نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ "سنیتی کمار چٹرجی" نے "انڈو آرین اور ہندی" میں بتایا ہے۔ اس سے (گوجروں) کی زبان مراد ہے۔ جو پنجاب سے آکر گجرات پر حکومت کر رہے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب ان کے اسلوب کی خصوصیات کے بارے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ ان فارسی عربی الفاظ کی جو بگڑ بگڑا کر عوام کی زبان پر چڑھ گیے تھے، صحت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے گویا انھوں نے اس کو ہندی بنا لیا تھا۔ اور یہ اردو کے مزاج کے مطابق بن گیے تھے۔ جو بول چال نیز تحریر میں آتی تھی مثلاً

"دنیاں کو چھوڑ دیں گے بدل خدا تھی خدا کی مدت (مدد) سوں"

انھوں نے عربی فارسی الفاظ کو بجائے اپنی اصل کی طرف لوٹانے کے عوامی بول چال کے استعمال پر برقرار رکھنے کی کوشش کی

(۶)
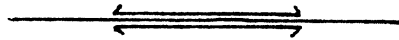
شاہ برہان اور شاہ امین کے نثری کارنامے

نویں صدی میں اُردو نظم و نثر کی تصانیف کی کثرت ۔ دکھنی درباروں کی سرپرستی ۔
شاہ برہان کی پیدائش و وفات ۔ تصانیف نظم :۔ ارشاد نامہ ۔ منفعت الایمان ۔
سک سہیلا ۔ حجۃ البقاء ۔ نعیم الکلام ۔ رموز الواصلین ۔ بشارت الذکر ۔ وصیت الہادی
نکتہ واحد ۔ پنج گنج ۔ کفر نامہ ۔

نثری تصانیف :۔ کلمۃ الحقائق ۔ مقصود ابتدائی ۔ ذکر جلی ۔ کلمۃ الاسرار ۔ معرفت القلوب
ہشت مسایل ۔ رسالہ تصوف ۔ تصانیف نثر پر تبصرہ ۔ شاہ برہان کے طرز بیان
کی خصوصیات ۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کے حالات زندگی ۔

منظوم تصانیف :۔ رموز السالکین ۔ محبت نامہ ۔ مفتاح التوحید ۔ قربیہ ۔ وجودیہ ۔
مدح شاہ برہان ۔ کشف الانوار ۔ رسالہ نظم و نثر ۔ رسالہ منظوم ۔ کرسی نامہ ۔

نثری تصانیف :۔ گنج مخفی ۔ گفتار شاہ امین ۔ نور نامہ ۔ ارشادات ۔ نکات المعرفت ۔
رسالہ نظم و نثر ۔ عشق نامہ ۔ شرح کلمہ طیب ۔ ذکر نامہ ۔ ارشاد نامہ ۔ وجودیہ ۔
امین الدین اعلیٰ کا اسلوب ۔

۶

شاہ برہان اور شاہ امین کے نثری کارنامے

نویں صدی ہجری میں شاہ میراں جی کے علاوہ کبیر[1]۔ نانک[2]۔ خوب محمد چشتی[3]۔ شاہ علی جیوگام دھنی[4]۔ عبدالقدوس گنگوہی[5]۔ بہاؤالدین برناوی[6] اور گولکنڈہ کے اشرف[7]۔ اور فیروز[8] وغیرہ کے کارناموں میں بھی اُردو کے ابتدائی آثار دستیاب ہوتے ہیں۔ گو ان کے کارنامے منظوم ہیں۔ تاہم ان کی تخلیقات سے زبان کے ارتقاء کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس زمانے میں جن بزرگوں نے اُردو کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہو گئی تھیں اور طوائف الملوکی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی بنیادیں بڑی حد تک مستحکم ہو چکی تھیں۔ ہندوستانیوں کو جنگ و پیکار سے فرصت ملی تو مذہب اور ثقافت کی طرف توجہ ہوئی۔ یوں بھی ہندوستانی عوام پر ابتداء سے مذہب کا تسلط رہا۔ لیکن فرصت کے دور میں اس رجحان نے اور بھی شدت اختیار کر لی اس لیے اس زمانے کے عوامی ادب پر بھی مذہب کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ہندی میں یہ بھی دور "بھگتی کال" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے کہنے والوں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔

---

[1] کبیر کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔
[2] نانک کا کلام گرنتھ میں محفوظ ہے۔
[3] خوب محمد چشتی کی "خوب ترنگ" مشہور متصوفانہ مثنوی ہے۔
[4]
[5] "ارشاد نامہ" مشہور مثنوی ہے۔
[6] انھوں نے موسیقی پر ایک کتاب یادگار چھوڑی۔
[7] اشرف کی مثنوی "نوسرہار" ادارہ ادبیات اُردو میں ہے۔
[8] فیروز کا کچھ کلام بھی دستیاب ہوا ہے۔

ان (Deleste) کی تحریروں سے ایک قسم کے مشترکہ ،، ہندلمانی ،، کلچر اور تصورات و خیالات کو عام کرنے کی کوشش ظاہر ہوتی ہے۔ اس ہندلمانی ،، کلچر کو عام کرنے اور پھیلانے میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ زبان کلچر کا سب سے اہم جزو ہے اور اس زبان کی سرپرستی دونوں درباروں نے دل کھول کر کی۔ اور خود بادشاہوں نے عملی طور پر اس کی ترقی میں حصہ لیا۔ گولکنڈہ کا پانچواں بادشاہ محمد قلی (۹۸۸ھ ۔ سنہ ۱۰۲۰ھ) جو میراں جی کے اٹھارہ سال بعد تخت نشین ہوا۔ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ گولکنڈہ میں شعر و سخن کا چرچا ابتدا ہی سے رہا تو بیجاپور میں نثر کی داغ بیل ڈالی اور وہیں اس کی نشو و نما ہوئی۔ میراں جی کے بعد ان کے بیٹے شاہ برہان الدین جانم اور پوتے امین الدین اعلیٰ نے اردو نثر کو بڑی وسعت دی اور کئی مستقل تصانیف یادگار چھوڑیں۔ شاہ برہان الدین کے متعلق ڈاکٹر زور لکھتے ہیں :

> ،، لسانیاتی نقطۂ نظر سے شاہ برہان الدین کے کارنامے محققین کے لیے کافی مواد پیش کرتے ہیں ،، [۱]

یہ صحیح ہے کہ قدیم دور میں شاہ برہان ہی وہ خوش قسمت ہستی ہیں جن کی اکثر تصانیف دستبرد اور تصرّف زمانہ سے بچ رہیں اور جو قدیم ادب کے محققین کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے نثر کی کئی تصانیف کے علاوہ آٹھ ہزار اشعار کا سرمایہ چھوڑا ہے جس سے اس زمانے کے لسانی سماجی اور تہذیبی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔ شاہ برہان کا شاعرانہ آرٹ بھی شاہ میراں جی کے مقابلے میں زیادہ نشو و نما یافتہ ہے۔ شاہ برہان نے جس وقت لکھنا شروع کیا۔ بیجاپور میں ہر طرف علم و ادب کا چرچا تھا۔ شاہ برہان ۔ علی عادل شاہ اول کے عہد حکومت ارشاد و ہدایت کا کام کرتے تھے۔ علی عادل شاہ ثانی خود بھی بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے ملک کے علماء و فضلا کی سرپرستی کی بلکہ دوسرے ممالک کے علماء کی بھی قدردانی کی اور انہیں بیجاپور آنے کی دعوت دی چنانچہ مشہور عالم ملّا فتح اللہ شیرازی اسی کی دعوت پر شیراز سے ہندوستان آئے تھے۔ دربار میں ہر ہفتہ تین بار شاہی

---

[۱] اردو شہ پارے : صفحہ ۴۳

علما فضلا جمع ہوتے اور بادشاہ کے روبرو مباحثے اور مناظرے کیا کرتے تھے۔[1] یہ شاہ برہان الدین کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں ایسا سازگار ماحول ملا۔

حالات زندگی

شاہ برہان الدین جانم[2]۔ اپنے والد کے نہ صرف خلیفہ بلکہ ان کے اصول کے بھی سچے پیرو تھے۔ اور باپ کے مستند ارشاد اور علم و فضل کے بھی صحیح وارث ثابت ہوئے۔ ان کو اپنے والد سے بڑی محبت تھی جس کا اندازہ اُن اشعار سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے والد کی مدح میں لکھے ہیں۔

ان کی ولادت سنہ ۹۵۰ھ میں بیجاپور میں ہوئی۔ صاحب "اولیائے دکن" لکھتے ہیں کہ سنہ ۹۵۰ھ ان کا سنہ وفات ہے۔[3] پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی "فہرست اُردو مخطوطات" جامعہ عثمانیہ میں اس سنہ کو مستند مانا ہے۔[4] لیکن "اُردو مثنوی کا ارتقا" میں موصوف ہی نے سنہ وفات سنہ ۹۹۹ھ درج کیا ہے۔[5] ڈاکٹر عبدالحق،[6] ڈاکٹر زور اور حامد حسن قادری، شاہ برہان کا سنہ وفات ۹۹۰ھ کے بعد قرار دیتے ہیں۔ اور اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ شاہ برہان نے خود اپنی نظم "نکتہ واحد" ۹۶۷ھ اور "منفعت الایمان" کے نیچے سنہ ۹۹۰ھ اپنے قلم سے درج کیا ہے۔ اس بنا پر مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ شاہ برہان کا سنہ وفات سنہ ۹۶۸ھ ہے۔[7] ڈاکٹر زور کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ سنہ وفات سنہ ۹۹۰ھ بتاتے ہیں۔ بعض اہم شواہد کی بنا پر جن کا ذکر آگے آئے گا یہی سنہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] "اُردوئے قدیم" صفحہ، "بساتین السلاطین" اور "فتوحات عادل شاہیہ" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

[2] اس کی وجہ کسی تذکرے میں مذکور نہیں۔ جانم کو بعض اوقات "جان من" بھی لکھا گیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر عبدالقادر سروری کی مقبوضہ بیاض میں "جانمن" درج ہے۔ یہ غالباً انکے والد کا دیا ہوا خطاب ہے۔

[3] "تذکرہ اولیائے دکن" صفحہ ۲۰۶

[4] "فہرست اُردو مخطوطات" جامعہ عثمانیہ صفحہ (۶۸)

[5] "اُردو مثنوی کا ارتقا" صفحہ ( )

[6] "رسالہ اُردو" جولائی سنہ ۱۹۲۷ء

[7]

شاہ برہان نے علوم ظاہری و باطنی اپنے والد سے حاصل کیے۔ اور ان میں کمال حاصل کیا چنانچہ "اولیائے دکن" کے مصنف لکھتے ہیں۔ :

" تصوف و سلوک میں متعدد رسائل تالیف کیے ہیں۔ توحید و تصوف کے دقایق و حقایق کو خوب شرح و بسط سے بیان فرمایا ہے " [۱]

شاہ برہان نہایت نیک سیرت پاک باطن اور ہمدرد بنی نوع انسان بزرگ تھے۔ طالب علم والے واقعہ سے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کا دل دکھانا ان کے مسلک میں روا نہ تھا۔ چنانچہ جب ان کے والد ماجد نے طالب علم کو مایوس لوٹایا تو شاہ برہان کو اس کی حالت پہ ترس آیا اور وہ اسے گھر لے آئے۔ اور خود تعلیم دی مصنف "برکات الاولیا" ان کے طرز ہدایت کے بارے میں لکھتے ہیں :

" علم طریقت اور سلوک راہ مولی تعالیٰ میں ایک تازہ ڈھنگ اور اچھا طریقہ ایجاد کئے تھے۔ " [۲]

تصانیف حکیم شمس اللہ قادری کو ان کی تصانیف میں صرف ایک "حجۃ البقا" [۳] کا سراغ مل سکا تھا۔ لیکن ڈاکٹر عبدالحق نے ان کی تصانیف کی تعداد دس [۴] بتائی ہے۔ حامد حسین قادری نے بھی ایک نثری رسالہ کا حال لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ان کی نو تصانیف [۵] بتائی ہیں۔ مجھے مواد کی جستجو کے دوران میں برہان الدین جانم کی (۱۰) تصانیف کا پتہ چلا ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ان کی منظوم تصانیف یہ ہیں :

۱۔ ارشاد نامہ ۲۔ منفعت ایمان ۳۔ سک سہیلا ۴۔ حجۃ البقاء ۵۔ نسیم الکلام ۶۔ رموز الواصلین ۷۔ بشارت الذکر ۸۔ وصیت الہادی۔ ۹۔ نکتہ واحد

---

[۱] تذکرہ اولیائے دکن صفحہ ( ) [۲] برکات الاولیا صفحہ ( ) [۳] اُردوئے قدیم صفحہ (۴۵)
[۴] رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۷ء
[۵] تذکرہ اُردو مخطوطات (جلد اول) صفحہ ۲۰ و دیباچہ "ارشاد نامہ" زیر طبع

۱۰۔ کفر نامہ

۱۔ ارشاد نامہ: ان کی سب سے طویل نظم ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی میں تصوف کے مسائل سوال و جواب کے پیرائے میں سمجھائے گیے ہیں۔ اس کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اپنے والد اور مرشد شاہ میران جی کی مدح میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ ایک جگہ ہندی میں لکھنے کی معذرت بھی کی ہے۔ "ارشاد نامہ" اور شاہ برہان کی دوسری نظموں کو ڈاکٹر زور مرتب کر کے شائع کر رہے

۲۔ منفعت الایمان: اس نظم میں ملحدوں کے عقاید بیان کیے گئے ہیں اور پھر ان کی تردید بھی کی گئی ہے

۳۔ سک سہیلا: یعنی "سکھ کا گیت" اسے ڈاکٹر حفیظ سید نے حواشی کے ساتھ شائع بھی کیا۔ ہے۔ (۵۶) اشعار پر مشتمل اس نظم کے ہر بند کے آخر میں یہ شعر ٹیپ کے شعر کی طرح دھرایا جاتا ہے:

لوکان یہ مت کہو الادھی ❊

جس بوجھ بختوں لادھی ❊

۴۔ حجتہ البقا: اس نظم میں خاص توحید اور اس کی ذات و صفات کی تلقین ہے۔ یہ سارے مطالب ایک ولی اور اس کے معتقد کے مکالمہ کے پیرائے میں بیان کیے گیے ہیں۔ یہ نظم بھی "ارشاد نامہ" کے ساتھ ڈاکٹر زور شائع کر رہے ہیں۔

۵۔ نسیم الکلام: (۴۵) اشعار کی اس نظم میں مذہب کے احکام و مسائل بیان کیے گیے ہیں۔ پہلے قرآن کی آیت دی گئی ہے۔ پھر اس کا مطلب اپنی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ گویا قرآن کی بعض آیتوں کی منظوم تفسیر ہے۔ اس نظم کا تذکرہ ڈاکٹر عبدالحق نے بھی کیا ہے[1]۔ ڈاکٹر زور اس نظم بھی "ارشاد نامہ" کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

۶۔ بشارت الذکر: شاہ برہان نے اس میں اپنے نثری رسالہ "ذکر جلی" کے مسایل منظوم کیے ہیں۔ یہ نظم (ساٹھ) اشعار پر مشتمل ہے۔ اور اس میں مختلف اذکار جیسے جلی خفی۔ قلبی اور روحی کی تشریح کی۔ یہ نظم بھی "ارشاد نامہ" کے مجموعہ میں شامل ہے۔

---

[1] "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۶۵)

۷۔ رموز الواصلین:۔ نظم معرفت الٰہی کے نکات پر مشتمل ہے جس میں نور، روح، دل، نفس کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ اس نظم کو بھی ڈاکٹر زورؔ "ارشاد نامہ" کے شائع کر رہے ہیں۔

۸۔ وصیت الہادی:۔ اس میں بھی معرفت کے مسایل بیان کیے گیے ہیں کہیں کہیں "نسیم الکلام" کی طرح قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کی تفسیر بھی کی ہے۔ یہ نظم بھی "ارشاد نامہ" کے ساتھ چھپ رہی ہے۔

۹۔ نکتہ واحد:۔ اس کے کُل ۲۹ شعر ہیں۔ توحید کی تلقین حرف ابجد سے کوئی لفظ بنا کر کی جاتی ہے ڈاکٹر زور اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس قسم کی دو نظمیں ہیں ایک (۱۲) شعر کی اور دوسری (۲۹) شعر کی۔ [1]"

۱۰۔ کفر نامہ:۔ اس نظم کا تذکرہ کسی نے نہیں کیا ہے مجھے اپنی تحقیقات کے دوران میں اس مثنوی کا ایک مخطوطہ کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں دستیاب ہوا۔ یہ نظم بڑی اہم ہے۔ اس میں اشعار فارسی اور اُردو دونوں میں لکھے ہیں۔ ایک بند فارسی میں ہے اور دوسرا بند اُردو یا ہندی میں۔ ہندی بندوں میں زیادہ تر ہندی شاعری کے لوازم کی پیروی کی گئی ہے۔ نظم میں سالک کی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ شاہ برہان کا صوفیانہ مسلک بہت ہمہ گیر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سالک خواہ مسجد میں بیٹھے خواہ کنشت میں، سالک ہی رہتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ہر جگہ خدا کو یاد رکھے۔ کیونکہ دونوں جگہ اسی کا جلوہ ہے۔ ابتدائی دور کے اکثر بزرگ اسی قسم کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ دین کے فیضان کو محدود کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ عالمگیر اخوت اور آپس میں بھائی چارہ بڑھانا ان کی تحریر و تقریر کا اولین مقصد تھا۔ اس نظم میں جگہ جگہ شاہ برہان کا نام آتا ہے۔ جیسے اس شعر میں:۔

خدا قدعا کم برہان چہ فرمود　　ترا برہان گزیدن کرد بس سود

ابتداء میں یہ اشعار ہیں:

کنم سر داستان کفر نامہ　　ز اسلام مجازی کفر نامہ
بگو با من کہ ایں را ز جوید　　ہمہ با سوز اندر ساز جوید

---

[1] "اُردو شہ پارے" صفحہ ۳۲

بیا گوکل خود خوان حکایت | کہ از عشق آمد این روایت
بتان ہند را این درجہ کار اند | ہنوز آن عشق کشن دارند
یکی از کشن میخواند حکایت | یکی دارد زدی شیریں حکایت
یکی خنداں یکی گریاں نہ دانم | چہ آمد ایشان شادی و غم
اگرچہ کشن از خلق است پنہاں | ولے باشد عیاں نزدیک ایشاں
چو می کرد مست از کثرت خویش | ہمی گوید پیش کشن مدہوش

اس کے بعد ہندی اشعار دیئے گیے ہیں جو درج ذیل ہیں :۔

ہمیں کوئی رہین بسین سوپن جہاں نہان
تمہیں کن کہ جگائیں ہند ما نہان
تمہاری بانسری نے ہم جگائیں
تمہاری پند کارن یہ جگائیں
تمہاری بانس نت جو بانسری ہے
ہماری بانسری یہ سانسری ہے

رسالہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

چو این ابیات را بنگاشتہ خامہ
نہادم نام آن را "کفر نامہ"

اس کے کچھ اور ہندی اشعار یہ ہیں :

ہمیں پورب دسا کی بات لائی | کنتھا نے پوربہ کہنے جو آئے
اپورب بات پورب کے نہ کہنی | سنبھوں کی بات سن سکہ موند رہیئے
سنادیں وہاں چیری پوسے کون | نہیں جو پوری جیسری اُسنی کہوں

آخر میں پھر فارسی اشعار ہیں جن میں سے ایک میں شاہ برہان کا نام آتا ہے :

نشہ در امت عیسی گذارت | کہ برہان محمد کرد کارت

نثری تصانیف | شاہ صاحب کی نثری تصانیف حسب ذیل ہیں :-
(۱) کلمۃ الحقایق (۲) مقصود ابتدائی (۳) ذکر جلی (۴) کلمۃ الاسرار
(۵) معرفت القلوب (۶) ہشت مسایل (۷) رسالہ تصوف۔

۱۔ **کلمۃ الحقایق** : اس کے مخطوطے جامعہ عثمانیہ، آصفیہ اور ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زور نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق اس کے متعلق لکھتے ہیں :-

" یہ رسالہ اچھا بڑا ہے اور اس میں تصوف کے مسایل سوال وجواب کی طرز پر بیان کیے گیے ہیں " [1]

ڈاکٹر زور نے اس رسالہ کو اس لیے اہم بتایا ہے کہ

" دکھنی زبان کی تحقیق کرنے والوں کو اس سے بہت بڑی مدد ملتی ہے " [2]

پروفیسر عبدالقادر سروری نے جامعہ عثمانیہ کے مخطوطات کی فہرست میں اس کتاب کا تذکرہ نہیں کیا لیکن جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔ اس میں شاہ برہان نے اپنی زبان کو "گجری" کا نام دیا ہے۔ اس میں خدا کائنات اور مسئلہ جبر و قدر پر فلسفیانہ بحثیں ہیں اور ان مسایل کو سوال وجواب کی صورت میں سمجھایا گیا ہے۔ سوال وجواب کا یہ طریقہ سنسکرت کی قدیم کتابوں میں بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کے کلاسکی ادب میں مثلاً افلاطون وغیرہ کا نتیجہ فکر بھی مکالموں یعنے سوال جواب کی صورت میں ہی ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تفہیم کا ایک اچھا طریقہ ہے۔ شاہ برہان نے "کلمۃ الحقایق" میں یہی طریقہ اپنایا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اس رسالے کی ضخامت (۴۴) صفحات بتائی ہے۔ لیکن میری نظر میں مخطوط کی ضخامت (۵۶) صفحات ہے۔ ان مخطوطوں کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کہیں کہیں حذف واضافہ بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے "کلمۃ الحقایق" کا جو اقتباس دیا ہے۔ وہ

---

[1] "اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ (۶۸)
[2] "تذکرہ اُردو مخطوطات" جلد اول صفحہ (۵۱) و "اُردو شہ پارے" صفحہ (۳۳)
[3] اس مخطوطے کو حال میں میں نے اپنے مقدمہ کے ساتھ چھاپا ہے جس میں موجودہ تمام نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔

اس مخطوطا میں نہیں مل سکا۔ ان مخطوطوں کی عبارت میں جگہ جگہ اُردو اشعار بھی آئے ہیں۔ ساتھ ہی بیچ بیچ میں کہیں فارسی اور کہیں عربی عبارتیں بھی درج ہیں۔ ایک جگہ ذات باری تعالیٰ کے عنوان کی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذات باری فہم سے جدا ہے۔ کیونکہ وہ ذات کامل اور انسانی عقل ناقص ہے۔ اس حقیقت کو شاہ برہان قرآن حدیث اور روایات کی اسناد کے ساتھ اس طرح واضح کرتے ہیں۔ :

د قال اللہ تعالیٰ

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو الطیف الخبیر۔

ایسا کس کا مجال ہوئے گا کہ پچھان ذات کا کرے گا۔

د قال نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تفکرو فی صفات اللہ ولا تفکرو فی ذاتہ

ولیکن جسے خدا پوری اسے راہ دیوی اپس میں کہ " یہدی من یشاء " امید دکھایا وہ مدد کیا کہ الذین جاھدو فینا ھذا انیھم سبکنا۔ تو جد اکوشش کرے خدا میں تے کہ قال علی صلوات اللہ علیہ کہ عرفت ربی بربی۔ تو سوال کر کہ " خدائے تعالیٰ اول تھے کون تھا ؟ ۔

جواب۔ بیچون وبیچگونہ تھا۔ (چون وچرا نباید گفتن ولیکن ہستی باقی لاشک وشبہ)۔

سوال۔ اد کہاں تھا کہیں تو تعلقات جا گا سون دھرتا تھا بھی۔

جواب۔ تیرے وقت سون تعلق دھرتا ہے۔ تو ہر شے کا آفریدگار او ہے۔ ہور اس جا گا کا سب کا آفریدگار او ہے پچھان اس تی اول واول کا ہے۔ اول وآخر قدیم وجدید سب استے زبان ہوتا اس تھے بول میں آیا کہ اول تی ہے۔ جملہ مخلوقات سرلامکان ہے ۔

قرآن وحدیث کے شواہد کے علاوہ مطالب کو سمجھاتے ہوئے مشہور صوفیا مولانا رومی اور ابوبکر شبلی کے خیالات اور اقوال بیان کرتے ہیں۔ جیسے کہ مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوگا۔ :

ش خواجہ روم از خواجہ شبلی پرسید.....

سوال، پس سمجھ نہیں کیوں قرار دینا و تحقیق کفر کون انپڑنا کہ کچھ نہیں ۔پس کیوں ۔

جواب، ای عارف تو نہ مخلوق ہے ۔تیرا تعلق و دہما ایک جاگا ۔سو نے تعلق دھرتا ہے کہ تون بندہ عاجز ہے ۔

سوال: قدرت کیا

جواب: خدا اپنا کہ من خدا ندیم الی انا اللہ جسے فرمایا کہ آن معنے باشد بر ہمہ معنے ۔

سوال: در قدرت و خدا چہ فرق باشد

جواب: کہ قدرت تعلق با فعل دارد کہ اپنی فعل پر نمودار شاہد باشد ۔

جبر و قدر کے مسئلہ کو اس طرح سمجھایا ہے :۔

" یہ تن ایک موس ہے اس میں جیو اس اوٹ کریا "

سوال: موس ایک ہے یا دو

جواب: موس ایک

سوال: کافر و مسلمان سمج کیوں

جواب: یہ تن موس کا تن کیری و خصلت سو اصلی موس اوتی کے اس خصلت جیو اس جیون ادتیا کیا ۔"

بعض بعض جگہ ویدانت کی بھی اصطلاحیں استعمال کی ہیں ۔جیسے " آکار " " نرآکار " وغیرہ ۔بعض اوقات عبارت میں ادبی خوبی کا خاص خیال رکھا گیا ہے ۔مثلاً ذیل کی عبارت میں ادبی شان پیدا کی گئی ہے ۔:۔

" سوال: جکر کچھ نہیں کیا تھا تیں آپ تھا پس نور نبی کیا کیوں ظہور ۔

جواب: سن کہ اللہ تعالیٰ المخفی گنج تھا در امن امنیت در خودی خود نہ پنہاں نہ اظہار ۔نہ آکار نہ نراکار ۔نہ جلال نہ جمال نہ شوق نہ ذوق نہ یاد نہ فراموش نہ انج نہ گنج ....."

شاہ برہان کی تحریروں میں ان کے پیش رو مصنفین کے مقابلے میں ادبیت زیادہ جھلکتی ہے ۔جس کی طرف اکثر اصحاب نے اشارہ کیا ہے ۔شاہ برہان کی زبان پر گجراتی کا بھی نمایاں اثر ہے ۔کبھی کبھی وہ ایسے ہندی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں ۔جو ان سے پہلے کے مصنفین کے ہاں نہیں

ملتے ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو :

" یہ تن الادھا دستا۔ ولیکن جیتا بکار۔ ٹوٹنے نہیں بلکہ سنتتر بکار روپ دستا ہے۔ یک تل قرار نہیں جیون مرکٹ روپ "۔[1]

اوپر کے اقتباس میں الادھا (علحدہ) بکار (متحرک) سنتتر (بدلنے والا) روپ (بھیس) اور مرکٹ (بندر) کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اسی لیے حامد حسن قادری نے شاہ برہان کی زبان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

" دکن میں اُردو زبان دہلی سے پہنچی تھی لیکن دکنی زبان کی اس قدر آمیزش ہوگئی کہ سمجھنا دشوار ہے "۔[2]

لیکن قادری صاحب کی رائے شاہ برہان کی تمام تصانیف پر صادق نہیں آتی۔

۲۔ مقصود ابتدائی : اس رسالہ کا جو مخطوطہ ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں مصنف اور کتاب کا نام درج نہیں لیکن چونکہ یہ رسالہ شاہ برہان کے رسالے " کلمۃ الحقایق" کے ساتھ منسلک اور اسی ڈھنگ پر لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اسے شاہ برہان ہی کی تصنیف مانا ہے۔[3]

اس رسالہ میں خدا اور کائینات کی ماہیت اور آغاز وغیرہ سے متعلق تصوف کے مسایل سوال جواب کے پیرایے میں بتائے گیے ہیں۔ " کلمۃ الحقایق " کی طرح اس رسالے میں بھی آسمان۔ عرش کرسی اور لوح وقلم وغیرہ کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو :

" سوال۔ اول تھے اول کیا تھا۔ جواب : اول حق ہی ہچ تھا

سوال۔ کیوں تھا جواب : بولیا آپ سین آپ تھا "۔

سوال وجواب کے بیچ بیچ میں کہیں کہیں اشعار بھی آجاتے ہیں۔ جن سے مطالب کی وضاحت کی جاتی ہے۔ رسالہ کا اختتام بھی ایک شعر ہی پر ہوا ہے جو حسب ذیل ہے :

---

[1] " یہ جسم علحدہ نظر آتا ہے لیکن زندہ متحرک ہے۔ ٹوٹتا نہیں بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ متحرک حالت میں نظر آتا ہے۔ ذرا سی دیر کو قرار نہیں گویا بندر ہے "۔

[2] " داستان تاریخ اُردو" صفحہ (۲۷)

[3] فہرست اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ (۵۴)

" یوں دیکھے آپ ڈھونڈول
ست کر کیرے سانچے بول "

۳۔ کلمۃ الاسرار : اس کے دو مخطوطے مجھے دستیاب ہو سکے ہیں۔ ایک مخطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ[1] ہے۔ اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ[2] میں آصفیہ والے مخطوطے کے حاشیہ پر واضح طور پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے :

رسالہ حضرت شاہ برہان الدین جانم قدس اللہ برہانہ "

اس رسالہ میں " کلمہ " کی تشریح کی گئی ہے۔ یوں تو قدیم ادب میں " کلمہ " کی تشریح و تفسیر " شرح کلمہ طیب " اور " کلمہ طیب " کے نام سے بہتوں نے کی ہے۔ لیکن " کلمۃ الاسرار " کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں " کلمہ " کی محض صرفی و نحوی تشریح نہیں بلکہ عارفانہ شرح ہے اور تصوف کے نکات سمجھائے گیے۔ اس طرح یہ کتاب شاہ صاحب کی تصانیف میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔

اس رسالے کی دوسری بڑی خوبی اس کی ادبیت ہے۔ شاہ برہان کے دیگر رسالوں کی بہ نسبت اس کی زبان بہت سلیس ہے۔ اس میں وجود باری کا بیان بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا گیا ہے۔ خدا اور بندے کے تعلق کی توضیح مچھلی اور پانی کی خیال انگیز تشبیہ سے کی ہے۔ کلمہ کے باطنی معنی کی تشریح کرتے ہوئے آنحضرتؐ کی شہادت اس طرح دی ہے :

" کلمہ کا باطن معنا ہو رہے جب تلک اس باطنی معنی کو تیں سمجھیا تب تلک مسلمان نہیں ہوا۔ مثال اس کی یو ہے کہ سورج کی دھوپ دیکھ کر معلوم کیا کہ سورج ہے، تب دھوپ نکلی ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو دھوپ نا نکلتی ولیکن سورج کون دیکھا نہیں یو محمد صاحب کے معجزے دیکھ کر معلوم کیا کہ اللہ ایک ہے تب محمد صاحب کے معجزے ظاہر ہوئے ہیں۔ اگر اللہ نا ہوتا تو محمد صاحب کو نا بھیجتا

---

[1] کتب خانہ جامعہ عثمانیہ نمبر کیٹلاگ ۴ ن ک ۶ ۲۹۷
[2] " " آصفیہ " " ۶۲۳ فن تصوف

ہور محمد صاحب کے معجزے کہاں سے پیدا ہوے ظاہر یو کلمہ کا معنا۔ بوجکر اتنا معلوم
کیا کہ ولیکن خدا کون نیں دیکھا ہور محمد صاحب کون نہیں پیچھانا کہ اللہ محمد بن کتنا
تفاوت ہے۔ ہور اللہ کن کا ناوان ہور محمد کس کا نادان یو رمز نہیں معلوم کیا و
لیکن خدا کون نہیں دیکھا ہور محمد صاحب کون نہیں پہچانا کہ اللہ محمد میں کتنا تفاوت
ہے ہور اللہ کس کا ناون ہے ہور محمد کس کا ناون یو رمز نہیں معلوم کیا ؂

خدا اور بندے کے وجود کو ایک تمثیل کے ذریعے یوں سمجھاتے ہیں :

؂ ہور اس بیچون بیچگونہ کون اچھے دیک ہور یہ نکتہ اپنے دل پر یقین کر یکہ
لا الہ الا ھو الحی القیوم وھی بیچون بی چگونہ جسے لا کہتے ہیں۔ وہی چہ
زندہ اچھکر قایم کنیر اری بھائی انکھیاں جیانکونکو اس لا کون عین بیچون بیچ کہ
نہ بے شبیہ بے نمونہ ذات کو جان ہو۔ یو بات ہماری جھوٹ اور خلاف کر نکو
سمجھ کر سانچ کرمان اگر کچھ تیری ہیں ہے۔ کیان تو اسکون بھی لاچ سمجھ کر لا چہ
دل میں سیکھ اس محل میں ایک حکایت یاد آئی۔
اس حکایت کو خوب دل سون سمجھ لا کی معنی دیہان میں لا ہور مچھلی نمن لا کا دریا
سب جا کا پانی نقل است۔ تب سب مچھلیاں نے آپس میں پانی بیچہ اچھکر فکران
کیا کہ لوکان کہتے میں مچھلیاں کا جیو مول سو پانی ہے ہور ہمیں پانی کیلہے رہیکر
دیکھیان نہیں پانی کو دیکھتا پانی ہوا کیا ہور ہماری کتیک داڑھے ہو کدھر ہے
الیس میں اپین فکران کیان ہور پانی کو بہوت ڈھونڈیان ولیکن پانی انونکون
نادسیا پچھی اونومین سون ایک مچھلی بولی کہ یو پانی ہمنا کون کہاں دس آئیگا۔
چلو فلانی بڑی مچھلی پاس اوہمنا کون پانی بتلائے گی ہور کہاں پانی کتیک
دور ہے سو دکھلائے گی۔ تب اس مچھلی پاس بسب مل کر گیان ہور اپنی حقیقت
بیان وار کیان توں سب مچھلیاں سون بڑی ہم سب مچھلیان کی سردار ہے تجھے
پانی معلوم اچھیگا۔ ہور توں پانی کو دیکھی اچھیگی خدا واسطے ہمنا کو پانی دکھلاکس

واسطے کہ لوکان کہتے ہیں پانی مچھلیاں کا ٹھاو ٹھکان ہے ہور پانی مچھلیاں
کا جیو مول ہے۔ ہور مچھلی سدا دریا بیچہ اچھتی ہے ہور پانی نہ ہووے تو مچھلی تڑپھڑا
کرمرجاتی ہے۔ ہمیں تو پانی کیسا ہے دیکھیا نہیں ہور یو بات کیا ہے کہ اپنی جیو
مول کوں نا دیکھنا ہور جس مکان میں رہتے بستے ہیں اس مکان کوں نا جاننا بڑی بیوقوفی
ہور احمقی اور نادانی ہے بلکہ جو کوئی اپنے جیو کوں نا پچھانے اس پر کھانا پینا حرام ہے
پچھیں اس بڑی مچھلی نے تعجب کر کے سینی ہور بولی کہ پانی تمنا کوں کیوں دستا نین
تمہاری انکھیاں پر کہاں کا پردا ہے۔ ہور تمہارا دل کیدھر کوں گیا ہے ہور تمنا
کوں کیسے غفلت نے گھیری ہے جو ایسا پانی تمنا کوں دستا نہیں۔ اری بھائی
دیوانیاں ہو پانی تمہارے نیچے اوپر دائیں بائیں ان کی پچھیں تمارے موں میں
حلق میں تماری کان انکھیاں میں تماری سینے دل جان میں بھریا ہے۔ ولیکن
تمنا کوں دستا نہیں۔ ایسا پانی کیوں نہیں دس آتا سو تعجب بات ہے پچھیں
اس بڑی مچھلی نے یو سب کیفیت کہہ کر تلاتی تلاتی کیاری پاس مچھلیاں کوں
لی گئی ہور ایک جھکولا ایسا دے جو ساریاں مچھلیاں پانی میں سو ساریاں جاکر
باہر پڑیاں ہور تڑپنے لگیاں پچھیں پکاریاں کہ بیگی سوں ہمنا کوں کھینچ لے پانی میں
دگر نیں تو ہمیں تڑپتہ کر مرجائیاں ہیں اب حقیقت پانی کی ہمنا معلوم ہوئی۔ :۔

اس طرح مختلف تمثیلوں اور حکایتوں کے ذریعے خدا اور بندے کے تعلق کی وضاحت کی
گئی ہے۔ ایک حکایت سکندر و نوشابہ کی ہے کہ کس طرح سکندر ہرکارہ بنکر نوشابہ کے پاس گیا لیکن
نوشابہ نے اسے پہچان لیا۔ اس حکایت سے آنحضرت کو اللہ کے رسول کی حیثیت سے پہچاننے
کا درس دیا ہے۔ حکایت درج ذیل ہے :۔

:۔ پیغام سکندر بادشاہ کا پونچنا ناہوں ہور کہتے ہیں نوشابہ بڑی صاحب عقل
ہور صاحب فراست ہور دانہ تھی او تے بادشاہاں کیاں تصویراں ہور سکندر
بادشاہ نے اس کی تصویر لکھ کر اپنے پاس رکھی تھی۔ سو معلوم کی کہ یہ رسول ہرکارہ نئیں ۔

اس رسالہ کا تذکرہ کسی تاریخ یا تذکرہ میں نہیں ملتا۔

۳۔ ذکرجلی: ذکرجلی کا تذکرہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے اپنی فہرست مخطوطات میں کیا ہے۔ ؎ وہ لکھتے ہیں:

: یہ رسالہ بھی تصوف پر مگر نثر میں ہے :

اس رسالے میں مختلف اذکار اور تصوف کے اسرار بتائے گیے ہیں۔ رسالے کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی عورتوں کو دینی تعلیم دینے اور معرفت کے اسرار سکھانے لکھا گیا تھا۔ کیونکہ بہت سی باتیں اس میں عورتوں کی دلچسپی کی لکھتے ہیں۔ مثلاً سینا پرونا وغیرہ۔ اس کا ایک اقتباس نیچے دیا جاتا ہے:

: اللہ محمد کے راز رموز کیان باتاں کسی نامحرم کے انگے نا بولنا اگر بولے گا تو کافر ہووے گا نیا گا سو دیوانہ ہوئے گا کیسکون سنا کر دیوانہ نا کرنا ہور اپی بھل کر کافر نہ ہونا اول طالب سون یوں شرط کرنا بعد ازاتی اسکون ارشاد بولنا۔ نظم ارشاد ہے یو ذکر بھی کا اس میں فیض ہے رحمت کا خاتمہ ہے اس فکر کا ختم ہے اس ذکر کا :

اس میں موقع بہ موقع اشعار بھی ہیں۔ مثلاً

جے کری سو ہووے خاص	اپنے پیر کا ہووے داس
یو ذکر جلی ہے اس کا نام	تسدن اسکون جپین مدام

: ذکرجلی کی تشریح اس طرح کی ہے :

: ذکرجلی کا ارشاد یوں ہے کہ اس زبان سون بولنا اللہ اللہ پلک سون پلک مارتے وقت بولنا اللہ اللہ آنک موندتی وقت بولنا اللہ اللہ آنک کھولتے وقت بولنا اللہ اللہ اسے منظر سون جو دستا ہے سو سب دیکھنا اللہ اللہ اس کانون میں آواز پڑتی وقت سب سنتا اللہ اللہ کھانے کے بھاندی ہیں ہات بھاتی وقت بولنا نوالہ باندتی وقت بولنا نوالا مون میں بھاتی وقت بولنا

؎۔ فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ ۰، نمبر مخطوط ۶۲، ۲۹۷

چابتی وقت بولنا نگلتی وقت بولنا پانی کے بھانڈی کو اٹھانے وقت بولنا کھت
کھت پانی پیتے وقت بولنا سوتی وقت بولنا کروٹ بدلتے وقت بولنا پتی
پکاتی وقت جھاڑتے جھوڑتے وقت سیتی پروتی وقت زور میلا کرنی وقت لکھتی
پڑھتی وقت اداخت فراخت کرنی وقت بھوک بھوکتی وقت رون رون رگی
رگ سب اعضیاں سوں بولنا یوں سب سنبھال کر برتی تو اسے : ذکر جلی، بولتے
ہیں۔ سارا دن ساری رات اسی یاد میں اچھے جو کام کری سو اسے یاد میں کرے
کوئی دم خالی نہ جاوے جو دم اسے یاد میں لازمی تو بہوت فایدہ ہے :

"عناصر" کی تخلیق کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔ :

: ای عزیز تون وہاں انپیر بگا تو نور کی عناصراں ہوں طبعتیاں کا دھات
تجھے معلوم ہوے گا جو نکہ یو چار روز اکیاں طبعتیاں چار ہیں ماٹی۔ پانی۔ آگ
بارا۔ ماٹی سب دنیا کی نسبت کیے ہیں دنیا کا پیدا ہونا اس تے ہے ہور یو عناصر
ان ذاتی عناصراں تے پیدا ہیں۔ جو اول خدائے تعالیٰ اپنے کنج مخفی میں قرار تھا
اپس سوں اپین ہور اس حال کا ناون رہ ہوا، کر دکھیا ہور ہوا کون بھی قرار نپا ہی
یوں خدائے تعالیٰ اپس سوں اپس قرار پاتا ہے۔

شاہ برہان تشبیہ اور استعاروں کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں مثلاً :

: اس روحی عناصراں تے جسمانی عناصراں پیدا کیا ہے اس تن میں پانچ
موذی ہیں چیل۔ سانپ۔ نیولا۔ کتا۔ بچھو۔

نظر سون چیل
کان سون سانپ
ناک سون ہنور
زبان سون کتا
شہوت سون بچھو

ان پانچو کو باندکر اللہ کی یاد میں اچھنا ہور اس تن میں پانچ چور ہیں ہو پانچ ساد ہیں۔

عقل کا چور	غصہ
علم کا چور	تکبری
نماز کا چور	کاہلی
روزہ کا چور	بھوک پیاس
ذکر کا چور	طمع۔ ہور اس تن میں آٹھ حب ہیں

اول حُب ذلت کا کہ میں سید ہوں یا شیخ ہوں کریو جب پکڑیا ای تو فنا ہے۔

دسرا حب قبیلی کا کہ میری بہایاں ہور میری خویش بہوت بری۔

اسی طرح:- حب:- بقا کی تشریح کی ہے۔ :

: اول حب اللہ کی یاد کا سو بقا ہے

دسرا حب جانبات کا سو پیر کی جن۔ت کا.... :

رسالے میں زیادہ تر تہذیب نفس پہ زور دیا گیا ہے۔ زبان نسبتاً سلیس ہے۔
شاہ صاحب کے اسی رسالے کو ان کے ایک مرید شریف نے منظوم بھی کیا تھا[1]۔
جس کا ایک مخطوطہ جامعہ بمبئی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس میں وہ اپنے مرشد شاہ برہان کا ذکر کرتا ہے۔ شاہ برہان نے خود بھی اسے منظوم کیا تھا اور : بشارت الذکر :۔ نام رکھا ہے [2]۔

۴۔ <u>معرفت القلوب</u>: اس رسالے میں شریعت، طریقت اور حقیقت کے راز اور طریقے بتائے گیے ہیں۔ اس رسالے کا ایک مخطوطہ آغا حیدر حسن صاحب سابق استاد اُردو نظام کالج حیدرآباد دکن کے کتب خانے میں ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف دی بمبئی یونیورسٹی

[2] ملاحظہ ہو مقالہ ہذا

رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

: بسم اللہ نانوں اللہ کا الرحمٰن مہربان الرحیم :
بخشنے ہارا اور بخشا نہارا ۔ سرانا نوازنا خدا کون
بہوت کہ اور پرورش کرنہارا تمام عالم کون :
جان اے سالک پچھانت کرنا شریعت کا ہور طریقت
کا ہور معرفت کا اس میں بیان تمام ہے کہ نفع پانے کے بدل عالمان
کون ہور عاشقان کون ہور واصلان کون اب تو سب کون تسلی دکھلاتا
ہے ہور دل کون ان پر کرراحت پاتے ہیں :

۵۔ ہشت مسایل : اس نام کی ایک تصنیف کا تذکرہ مولوی عبدالحق نے خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کے سلسلے میں کیا ہے۔ لیکن آغا حیدر حسن کے کتب خانے میں اس کا ایک مخطوطہ ہے اور یہ شاہ برہان سے منسوب ہے۔ ہشت مسایل، کائنات کے آغاز اور ذات باری تعالیٰ کی تشریح و تفسیر ہے اور معراج محمدی کا حال بھی اس میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے واضح ہوگا :

: پیغمبر صاحب صلی اللہ وعلیہ وسلم کون معراج ہوا تب محمد رسول اللہ
علیہ السلام نے سوال کیے سات طبق آسمان اور سات طبق زمین
کیا قدیم ہے یا جدید۔
جواب : خدا کہیا اے حبیب من ایں ہمہ جدید آفریدہ شد۔
سوال : تو کچھ نہ تھا تو کیا تھا
جواب : تجہ سون میں تھا :
یہ پورا رسالہ اسی طرح سوال جواب کے پیرائے میں لکھا گیا ہے۔

۶۔ رسالہ تصوف : شاہ برہان کے اس نثری رسالہ کا حوالہ مجھے پروفیسر عبدالقادر سروری کی اسی بیاض میں دستیاب ہوا ہے۔ جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ رسالہ

پر یہ عبارت درج ہے :

" من کلام حضرت شمس المحققین شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری قدس اللہ سرہ "

اس کے نیچے " ارشاد نامہ : درج ہے جس سے غالباً آپ کے فرمودات مراد ہیں چنانچہ بیاض میں اس کے بعد ہی جس رسالے کا نوٹ درج ہے اس کے عنوان پر بھی " ارشاد نامہ " لکھا ہوا ہے اور یہ شاہ کمال الدین کی تصنیف ہے جو میراں جی کے مرشد و استاد تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

" ظاہر کاتن واجب الوجود۔ اس کا دیکھ روح جاری۔ اس کا شاہد مشہود "

اس رسالے کا اختتام نظم پر ہوتا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے :

" ہاتاں سو قدر کر ہوا ناؤں
دواسم مرید پیٹ اور پاؤں "

شاہ برہان کا طرز بیان

شاہ برہان کے نثری رسالے مختصر ہیں۔ لیکن ان کی زبان اگلے مصنفین کے مقابلے میں زیادہ صاف اور سلیس ہے۔ ان میں بہت سی ادبی خوبیاں بھی ملتی ہیں۔ ان کے ادبی رسالوں کی ادبی خوبیوں اور شاعرانہ لطافتوں کی طرف اکثر محققین نے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

" ان کا کلام میراں جی کے لگ بھگ ہے۔ مگر اس سے کسی قدر صاف ہے اور اس میں شاعرانہ ذوق بھی کسی قدر صاف ہے " [1]

آگے چل کر ایک اور مقام پر مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ :

" شاہ برہان کا کلام اگرچہ سادہ ہے لیکن بعض مقامات پر شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے " [2]

ڈاکٹر زور نے بھی شاہ برہان کے اسلوب کی ادبی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

---

[1] " اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام " صفحہ ۶۳
[2] " " " " " " ۶۷

وہ لکھتے ہیں :

" باپ کی طرح ان کی نظمیں بالکل صوفیانہ خیالات اور اعتقادات سے مملو نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے پڑھنے سے شاہ برہان کے ذوق شعری کا بھی پتہ چلتا ہے "۔ [1]

واقعہ یہ ہے کہ شاہ برہان کا اسلوب اور زبان قدیم دور کے مصنفین میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے لیے صرف اُردو کو منتخب کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندی زبان میں لکھنے میں کوئی عیب نہیں اور طالب حقیقت کو متنبہ کرتے ہیں کہ معنی کو دیکھنا چاہیئے۔ لفظوں پر خیال دھرنا بیکار ہے۔ کیونکہ سمندر کے موتی اگر کسی "ڈابر" (جوہڑ) میں بھی ملیں تو عقلمند آدمی انھیں کیوں نہ لے؟ چنانچہ "ارشاد نامہ" میں صاف طور پر کہتے ہیں :

" یہ سب بولوں ہندی بول پن تو ابنہویتی گھول
عیب نہ راکھیں ہندی بول معنی تو چک دیکھ ڈھنڈول
جو نکے موتی سمندر سات ڈابر جے لاگیں ہات
کیوں نہ لیوے اس بھی کوے سہاناچیز جو کوئی ہوئے
ہیں سمند کے موتی یو گیان رتن کے جوتی یو " [2]

اور

" ہندی بولوں کیا بکھان جے گر پرشاد تھا منج گیان "

۲۔ شاہ صاحب کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظموں میں اکثر ہندی بحریں استعمال ہوئی ہیں۔ اور وہ ہندوستانی اور اسلامی دونوں روایات اور تلمیحات سے یکساں کام لیتے ہیں۔ مثلاً یوسف زلیخا وغیرہ کے ساتھ وہ سری کرشن جی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

---

[1] "اردو شہ پارے" صفحہ ۳۳
[2] "ارشاد نامہ" صفحہ ( ) مطبوعہ انجمن دکھنی مخطوطات

۳۔ ان کی نظموں کی بحروں میں موسیقیت اور ترنم ہے تشبیہہ اور استعارے برجستہ ہوتے ہیں۔ فلسفیانہ مضامین کو وہ ہلکی پھلکی زبان سے بڑی عمدگی سے ادا کرتے ہیں مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں جس شخص میں "آدم" کے گن نہ ہوں اس کو انسان کیسے کہہ سکتے ہیں۔ صورت اعتبار کے لائق نہیں بلکہ اوصاف زیادہ اہم ہیں۔ شعر یہ ہے :

" جو آدم کے گن نہ راکھے کیوں کہلائے انسان "

۴۔ شاہ برہان کے ارادت مندوں اور شاگردوں کا حلقہ کافی بڑا نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان کے بعد کے اکثر لکھنے والے ان سے گہری ارادت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف ایک اچھے عالم ہی نہیں تھے بلکہ ان کے ذاتی اوصاف اور ان کی سماجی حیثیت بھی مسلم تھی۔ بنی نوع انسان کی بھلائی اور اس کی روحانی اور اخلاقی رفعت کے لیے انھوں نے عمر بھر کام کیا اور نہ صرف خود کام کیا بلکہ دوسروں کو بھی کام کرنے پر ابھارا۔ شاہ صاحب کے ارادتمندوں کے دل میں ان کی جو عقیدت تھی اس کا اندازہ ان "جیہ اشعار سے لگ سکتا ہے جو ان کے مریدوں نے ان کے متعلق لکھے۔

ان کا ایک مرید شریف تھا جس نے ان کی رسالہ "ذکر جلی" کو منظوم کیا اور "کشف الاذکار" نام رکھا تھا۔ اس نظم کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے وہ لکھتا ہے :

" تو آشا برہان کی دار اوپر

کہ او سالکان کی جت راہ بر "

ایک اور مرید نے جس کا نام معلوم نہ ہو سکا اور جس کی مثنوی "پنج گنج" کا مخطوطہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے اپنے پیر کے بارے میں اس طرح رطب اللسان ہے :

" دکن کے جو ہیں پیر شاہ برہان

کہے دو وزا سون ہر انک کو بیان

اول تون یوں جان لے

دیم وجہ ترکس کیرا ھبیان ہے

شاہ امین الدین اپنے والد شاہ برہان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

سانچا حضرت شاہ برہان

سیرت ہو کر کیتی جہان ۔ [1]

اس مخطوطے کی تفصیل پروفیسر عبدالقادر سروری نے فہرست مخطوطات میں دی ہے۔

[1] فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۲۸

شاہ امین الدین اعلیٰ

مذہبی تصنیفات وتالیفات کا یہ دور جس کی شروعات بندہ نواز سے ہوئی تھی دو سو سال تک یعنی شاہ امین الدین اعلیٰ کی وفات (۱۰۶۸ھ) تک جاری رہا۔ شاہ امین الدین اور ان کے معاصرین نے نثر کی طرف کافی توجہ کی۔ اس زمانے میں نہ صرف مذہب کے موضوع پر طبع زاد کتابیں لکھی گئیں بلکہ عربی فارسی کی مستند کتابوں کے ترجمے بھی اُردو میں کیے گئے جن میں سے : شرح تمہیدات[1] : شرح عوارف المعارف[2] : ترجمہ شمایل الاتقیا : [3] : احکام الصلواۃ : [4] : مفتاح الخیرات : وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اب اُردو میں اتنی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی کہ اس میں فقہ تفسیر حدیث اور قرآن کے دقیق مسایل کی افہام وتفہیم خوش اسلوبی سے کی جا سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں شاہ امین الدین اور ان کے خلفاء وتلامذہ کے نام یادگار رہیں گے۔

حالات زندگی شاہ امین الدین اعلیٰ قدیم دور کی مذہبی تصنیف وتالیف کے سلسلے میں آخری بزرگ ہستی ہیں جنھوں نے اپنی ساری عمر عوام کو احکام دین کی تبلیغ کرنے اور ان کے کردار کو بلند کرنے میں گزار دی۔ جس طرح ان کے والد شاہ برہان کے سنہ وفات اور

---

[1] مصنفہ میران جی خدانما

[2] مصنفہ

[3] مصنفہ میران یعقوب

[4] مصنفہ مولانا عبداللہ

ان کے دادا میران جی شمس العشاق کے سنین ولادت و وفات میں اختلاف ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کی بھی سنین وفات و پیدائش میں بھی علما مختلف الرائے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر گریم بیلی لکھتے ہیں[۱]۔

THE RELATIONS OF FATHER SON AND GRAND SON SAID ON PAGE 17 TO HAVE ESISTED BETWEEN NO: 5'6' AND 8 (SHAH MIRANJI) SHAH BURHAN AND AMIN UDDIN ALA IS ACCORDING TO POPULAR REPORT OBWOIS BY ONE OR TWO GENERULIONS. HAVE DROPPED OUT.

یعنی ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ درمیان میں ایک آدھ پشت چھوٹ گئی ہونگی اور وہ ان ہی غلط سنین کی بدولت ہوا۔

شاہ امین الدین بیجاپور کے آخری چار تاجداروں ابراہیم عادل شاہ ثانی، محمد عادل شاہ علی ثانی اور سکندر عادل شاہ ثانی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ شاہ امین اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے اور شاہ برہان کے وفات کا سنہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق ۱۰۶۸ھ تسلیم کیا جائے تو شاہ امین الدین کی ولادت ۱۰۶۸ھ ہجری ہوتی ہے۔ اس سنہ کو حکیم شمس اللہ قادری بھی مستند مانتے ہیں[۲]۔

شاہ امین کا سنہ وفات مصنف اولیائے دکن نے ۱۱۱۶ھ لکھا ہے جس کو ڈاکٹر عبدالحق صحیح نہیں سمجھتے۔ انھوں نے رسالہ اُردو میں اُردو کے مصنفین کو روشناس کرانے کا سلسلہ قدیم اُردو کے سلسلے کے نام سے شروع کیا تھا۔ اس میں شاہ امین الدین اعلیٰ کے حالات لکھتے ہوئے ان کا سنہ وفات ۲۴۔ رمضان ۱۰۸۶ھ بیان کرتے ہیں[۳]۔

---

[۱] مختصر تاریخ ادب اُردو صفحہ ۹ [۲] "اُردوئے قدیم" صفحہ ۸۸
[۳] رسالہ اُردو سلسلہ "قدیم اُردو"

یہ تاریخ وفات انھوں نے مندرجہ ذیل شعر سے نکالی :

تاریخ واسم وخطاب از ہاتفم آمد ندا
شاہ امین الدین علی فرد قطب الاولیاء

مولوی صاحب نے مذکورہ بالا ماخذ نہیں بتایا حکیم شمس اللہ قادری سنہ وفات ۱۱۴۳ھ بتلاتے ہیں۔ حامد حسن قادری بھی مولوی عبدالحق کے تتبع میں شاہ امین کا سنہ وفات ۱۰۸۶ھ ہی لکھتے ہیں۔ حامد حسن قادری نے مادہ تاریخ "ختم ولی" بتایا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" میں ان کا سنہ وفات ۱۰۸۷ھ مانا ہے [1]۔ ساتھ ہی حاشیہ میں انھوں نے اس شبہ کا بھی اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں :

" راقم نے شاہ امین ان کے والد شاہ برہان اور دادا میران جی کے متعلق مواد انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کے ایک مضمون سے حاصل کیا ہے جنھوں نے ان کی تصانیف انجمن کے کتب خانہ کے لیے جمع کی ہیں۔ راقم کے پاس تحقیق کے لیے فی الحال سوائے اس کے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے کہ ان سنین کی تحقیق کرے اور ثبوت بہم پہنچائے۔ کیونکہ یہ تبلایا گیا ہے کہ دادا کا انتقال ۹۰۲ھ میں ہوا اور شاہ امین کا ۱۰۷۶ھ میں "۔

" روضۃ الاولیائے بیجاپور " میں سنہ وفات ۱۰۸۵ھ بتایا گیا ہے۔

اگر ۱۰۸۵ھ یا ۱۰۸۶ھ یا ۱۰۸۷ھ کو جو قریبی سنہ ہیں صحیح مانا جائے اور سنہ ولادت ۱۰۶۸ھ قرار دیا جائے تو شاہ امین کی عمر کل سترہ۔ اٹھارہ اور انیس سال ہی کی ہوتی ہے۔ اگر مصنف " تذکرہ اولیائے دکن " کے سنہ پر اعتبار کیا جائے تو عمر ۴۸ سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ لیکن ۱۱۱۶ھ یعنی مصنف " اولیائے دکن " کی تاریخ صحیح نہیں سمجھی جا سکتی اس وجہ سے

---

[1] "اردو شہ پارے" صفحہ ۶۹

کہ وہ شاہ امین کے حالات زندگی میں لکھتے ہیں :

: عالمگیر آنے کے پیشتر آپ فوت ہوگئے : لے

عالمگیر نے ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور کی عادل شاہیہ حکومت کا خاتمہ کیا۔ اس لیے ان کا سنہ وفات ۱۱۱۶ھ نہیں ہوسکتا۔ اگر شاہ برہان کا سنہ وفات ۹۹۰ھ مانا جائے تو شاہ امین کا سنہ پیدائش ۹۹۰ھ اور سنہ وفات ۱۰۷۶ھ قرار پاتا ہے۔ تمام تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ وہ مادر زاد ولی تھے کیونکہ شاہ برہان خود بھی بلند پایہ عالم اور صوفی تھے۔ ان کے امرا اور معتقدین کا بڑا حلقہ تھا۔ شاہ امین کی سب عزت کرتے تھے جو کوئی ان کے سامنے جاتا زمین پر سر رکھ دیتا تھا۔

شاہ امین کے علم و فضل و خوارق عادات کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ اگر ان روایتوں کو صحیح نہ بھی مانا جائے تو کم سے کم اس سے ایک بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں کے دل میں اور عام طور پر ان کے زمانے کے لوگوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔

محمود خوش دہان جو شاہ برہان کے محبوب خلیفہ تھے۔ ان کو ظاہری تعلیم اور خلافت کا خرقہ عطا کیا تھا۔ انھیں شاہ برہان کی کلاہ شاہ عطا اللہ چشتی نے اپنے ہاتھ سے پہنائی تھی شاہ امین بھی اپنے دادا "شمس العشاق" کی طرح مرتاض اور متقی بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ ایک حجرہ میں بارہ سال تک چلہ نشین رہے۔ اس کے بعد ہدایت و ارشاد میں مشغول ہوئے۔ شاہ امین کی طبیعت کی افتاد کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے تھے۔ ان کے سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مذہب کے احکام ظاہری کے زیادہ پابند نہیں تھے۔ اکثر اوقات حالت جذب میں مستغرق رہتے تھے جب اس کیفیت کا غلبہ ہوتا تو نظم و نثر میں عرفان کے حقائق اور اسرار ارشاد فرماتے تھے۔ صاحب "تذکرہ اولیائے دکن" نے لکھا ہے کہ مذہب کے احکام ظاہر سے لاپروائی کے سبب ایک روز بیجاپور کے تمام علما نے سکندر ثانی سے درخواست کی کہ وہ انھیں اپنے حکم

لے : تذکرہ اولیائے دکن : صفحہ ۱۱۹

کے ذریعہ احکام دین کی پابندی پر مجبور کرے ۔ چنانچہ بادشاہ کی طرف سے یہ حکم آمین الدین کے پاس بھجوایا گیا کہ وہ نماز ادا کیا کریں ورنہ ان پر بھی شرع کی حد جاری کی جائے گی اور سماجی مقاطعہ کیا کیا جائے گا۔ یہ حکم سن کر شاہ آمین نے فرمایا کہ سب سے کہو کہ میں کل شرع کی پیروی کروں گا۔ سب کے سب تالاب کے کنارے موجود رہیں۔ مقررہ دن بادشاہ اور علما تالاب کے کنارے پہنچے شاہ صاحب بھی آئے اور خادموں کو حکم دیا کہ وہ مصلیٰ تالاب میں روئے آب پر بچھائیں۔ سب نے اس کو مذاق سمجھا۔ لیکن جب خادموں نے حکم کی تعمیل کردی تو سارے علما اور حاضرین ششدر رہ گیے ۔[۱] اسی واقعہ کو ڈاکٹر عبدالحق نے اس طرح بھی بیان کیا ہے کہ سید محمد بخاری جو اس زمانے کے بڑے عالم تھے۔ جب انھیں اطلاع ملی کہ شاہ آمین ارکان شرعی اور صوم وصلواۃ کی پابندی نہیں کرتے تو وہ چند اور عالموں اور بزرگوں کے ساتھ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا بزرگان دین باوجود شہود استغراق کے ارکان شرع کو ترک نہیں کرتے تھے آپ کا یہ فعل مناسب اہل طریقت نہیں۔ جس پر آپ نے اپنے ایک خلیفہ کو شاپور کے تالاب کے وسط میں مصلیٰ بچھانے کا حکم دیا۔ اور آواز دی کہ :" کوئی ہے جو مجھے نماز پڑھائے "۔ لیکن کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ تب آپ نے خود مصلے پر جاکر نماز ادا کی۔ اور تالاب کے باہر آئے۔ اس خارقِ عادت واقعہ پر تمام علما ان کے قدموں پر گر پڑے۔ اور ان کی کرامت کے قایل ہوگیے۔ شاہ صاحب نے سکندر عادل شاہ ثانی سے خطاب فرماکے کہا :" ہم نے ان سیاہ رویوں کو نکالا اور سفید رویوں کو بلایا "۔ تھوڑے دن نہیں گزرے کہ عالمگیر بادشاہ بیجاپور میں آیا۔ اور بیجاپور کو تسخیر کرلیا۔ عالمگیر کے آنے سے پیشتر آپ کا انتقال ہوچکا تھا لیکن لوگوں نے عالمگیر کے آنے کو شاہ آمین کی مذکورہ بالا پیش گوئی پر محمول کیا۔

اولاد | تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جب ان کے گھر لڑکا تولد ہوتا تو وہ اس کے جسم پر ہاتھ پھیر کر فرماتے :" آرام کرو "۔ بچہ فی الفور فوت ہوجاتا۔ جب بابا حسینی پیدا ہوئے والدہ

---

[۱] : تذکرہ اولیائے دکن ، صفحہ ۱۱۹

نے بارہ برس تک انھیں حضرت سے چھپائے رکھا۔ وہ ایک دن انجانے پن میں حضرت کے سامنے آگیے۔ والدہ پریشان ہوئیں تو انھوں نے بیوی سے کہا کیوں غم کرتی ہو یہ باباحسینی ہے اس کی نسل قایم رہے گی۔ پھر صاحبزادے کو خلافت کا خرقہ مرحمت فرمایا باباحسینی بھی اپنے اسلاف کی طرح ارشاد و ہدایت کا فرض انجام دیتے تھے۔ ان کے بھی مریدین کا وسیع حلقہ تھا۔

خلفاء "تذکرہ اولیائے دکن" میں مذکور ہے کہ شاہ امین کے خلفا کی تعداد کثیر تھی۔ مشہور خلفا شاہ میراں جی سید حسن خدانما۔ سید خداوند خدا نما۔ اور قادر لنگا ہیں۔

تصانیف شاہ امین نے اپنے والد اور دادا کی طرح نظم و نثر دونوں میں کارنامے چھوڑے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے شاہ صاحب کی تصانیف میں متعدد رسالوں کی نشان دہی کی ہے [۱]۔ ڈاکٹر زور ان کی شاعری اور تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شاہ امین فطری شاعر تھے اردو زبان میں انھوں نے کئی ایک کتابیں تصنیف کی ہیں" [۲]

شاہ صاحب کی جن منظوم تصانیف کا پتہ چل سکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ رموز السالکین ۲۔ محبت نامہ ۳۔ مفتاح التوحید ۴۔ قربیہ ۵۔ وجودیہ
۶۔ مدح شہ برہان ۷۔ کشف انوار ۸۔ رسالہ نظم و نثر ۹۔ رسالہ منظوم
۱۰۔ کرسی نامہ

یہ تمام تصنیفیں ان کے دو مجموعوں (۱) "مجموعہ رسایل امین الدین اعلےٰ" اور (۲) "جواہر الاسرار" میں محفوظ ہیں۔ شاہ امین کی ساری نظمیں مختصر ہیں۔ ان میں شاہ برہان کی نظم "ارشاد نامہ" کی طرح کی طویل نظم ایک بھی نہیں ہے۔ کتب خانہ ویلور میں جو مجموعہ "جواہر اسرار" کے نام سے موجود ہے اس میں نمبر (۱) تا (۵) نظمیں شامل ہیں۔ اس

---

[۱] "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۳۷
[۲] "اردو شہ پارے" صفحہ ۶۹

مجموعہ کا ذکر حکیم شمس اللہ قادری نے ؛ اُردوئے قدیم ؛ میں کیا ہے۔ لیکن شاہ امین کی یہ نظمیں اور مختلف کتب خانوں میں بھی ملتی ہیں جن کا تذکرہ ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری نے کیا ہے

نمبر ۶ تا ۱۱ نظمیں کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ؛ رسایل امین الدین اعلیٰ ؛ میں موجود ہیں جن کی تفصیل پروفیسر سروری نے اپنی مرتبہ فہرست میں لکھی ہے۔ ان نظموں کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے :

۱۔: رموز السالکین :۔ اس نظم کو پروفیسر سروری، ڈاکٹر زور اور حکیم شمس اللہ قادری سب نے شاہ امین الدین اعلیٰ کی تصنیف مانا ہے۔ اس میں ذات باری تعالیٰ کی صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس نظم کا آغاز ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے :

: اللہ پاک منزہ ذات — اس سوں صفاتاں قایم سات
علم ارادت قدرت بار — سنتا دیکھتا بوسن ہار
ہے صفت یہ جان حیات — اس کو ناہیں کد ممات
ایسی صفاتاں سوں ہے ذات — جو نکے چند نے چند سنگات :۔ [۱]

لیکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ان اشعار کو ؛ نسیم الکلام :۔ کے اشعار بتایا ہے۔ جو شاہ برہان الدین کی تصنیف ہے۔ عبدالحق صاحب کی تحقیق سے ڈاکٹر زور کو اتفاق نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے شاہ برہان کی تصنیف ؛ ارشاد نامہ :۔ اور دیگر مثنویوں کے ساتھ اسے شامل نہیں کیا۔

۲۔: محب نامہ یا محبت نامہ :۔ کے متعلق مولوی عبدالحق [۲] اور ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ یہ ایک عشقیہ نظم ہے جو قصیدے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔

پروفیسر سروری لکھتے ہیں :

۱؎ ۔ فہرست اُردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ" صفحہ ۳۵
۲؎ " اُردو کی نشوو نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۷۰
۳؎ " اُردو شہ پارے" صفحہ ۶۹

"قدیم اُردو میں اس طرز کی نظمیں کم دستیاب ہوتی ہیں چنانچہ "محب نامہ" جو کافی طویل نظم ہے اس میں قافیہ اور ردیف کے التزام میں دشواری پیش نہیں آتی۔ تاہم ان کی پابندی اب بھی بہت زیادہ آسان چیز نہ تھی۔ اس لیے آپ نے عموماً ہر دو شعر کے بعد قافیہ تبدیل کر دیا ہے"

آگے چل کر پروفیسر سروری لکھتے ہیں :

"اس کا قافیہ ایک ہی ہے مگر ردیف کہیں کہیں بدلی ہوئی ہے۔ اس کا نمونہ درج ذیل ہے

قمر بن نین تیرے ساحر ہوئے ہمن ان ۔۔۔ گمراہ کر بلاوے قوس و قزح بھون کون

بیچوں بھوباں زلف تج موجوں ڈبے بحر موں ۔۔۔ ہر لہر پر کرشمہ عشاق کے بچن کون"

۳۔ مفتاح التوحید : مجھے کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ صرف حکیم شمس اللہ قادری کے بیان سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حکیم صاحب نے اس نظم کو شاہ امین الدین کی تصانیف میں شامل کیا ہے

۴ و ۵۔ "قربیہ" اور "وجودیہ" نظمیں "ویلور" کے مجموعہ "جواہر الاسرار" میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے مخطوطے مدیر رسالہ تاج کے کتب خانہ میں موجود تھے جس کا حال پروفیسر سروری نے لکھا ہے۔

پروفیسر سروری کہتے ہیں :

"وجودیہ اور قربیہ کا پتہ مدیر رسالہ تاج کے کتب خانہ سے چلا ہے جن کی ابیات کی مجموعی تعداد تین سو بیالیس ہے"

اس وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ امین کی یہ کسی قدر طویل نظموں میں سے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے "وجودیہ" کا یہ اقتباس دیا ہے :

"نفس کا دوڑنا ہے اس ٹھار ۔۔۔ یو تو آہے نفس بچار

نفس کو لیا و تو دم کی جاگا ۔۔۔ لائیں ذکر تین تو جاوے بھاگا"

۶۔ مدح شاہ برہان : یہ ایک مختصر سی نظم ہے۔ جو قصیدے کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اور اس میں شاہ برہان کی مدح کی گئی ہے۔ اس نظم کا تذکرہ پروفیسر سروری اور ڈاکٹر زور دونوں نے کیا ہے۔

۷۔ کشف الانوار : اس نظم کا تذکرہ پروفیسر سروری نے " فہرست اُردو مخطوطات" میں کیا ہے ۱؎۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہے اور اس میں ذات باری تعالیٰ کی تشریح کی گئی ہے شاہ امین " نور احدیت " اور " نور واحدیت " کی توضیح اس طرح کرتے ہیں :

احمد نور اور واحد نور — اپین نور اور کل کا ظہور

ذات صفات اور آسمان نور — ان بیچ وحدت وہ ہے نور

وہ حق اپین آپ مقیم — یہ سب جملہ نور قدیم

اس کو نائیں کد ممات — وہ سکہ جس کون آب حیات

۸۔ رسالہ منظوم : (رسایل شاہ امین امل) میں کئی رسالے ایسے ہیں جن میں نظم و نثر دونوں شامل ہے۔ اس رسالہ کا حال بھی پروفیسر سروری نے لکھا ہے ۲؎۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

الٰہی کلیاں کھول حاجات کیاں
بر آوئے امید اس مناجات کیاں
تیرا ناون کیلی ہر ایک گنج کا
تیرا رحم مرہم ہر ایک رنج کا

۹۔ رسالہ منظوم ۲ : (رسایل شاہ امین) اس کا مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ہے :

قدرسون ہے مانڈیا کھیل — اسا قدرت کا ہے میل

قدرت کا پچھو صاحب ہوئی — نہیں شرق اس دوجا کوئی

ہر دم پیو سون ماں کی ڈھال — نور محمد امین حال

اس کے علاوہ ان کی کئی غزلیں اور دوہرے بھی ملتے ہیں۔

۱؎ اُردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ ۔ صفحہ ۲۸

۲؎ فہرست اُردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ ۔ صفحہ ۲۹

نثری تصانیف شاہ امین کے حسب ذیل نثری رسالے اب تک دستیاب ہوئے ہیں۔ رسالوں کے نام یہ ہیں :

۱۔ گنج مخفی
۲۔ گفتار شاہ امین
۳۔ نور نامہ
۴۔ رسالہ ارشادات
۵۔ نکات معرفت
۶۔ رسالہ نظم و نثر
۷۔ عشق نامہ
۸۔ شرح کلمہ طیب
۹۔ ذکر نامہ
۱۰۔ ارشاد نامہ (نثر)
۱۱۔ رسالہ تصوف (وجودیہ)

ذیل میں مذکورہ رسالوں کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں :

۱۔ گنج مخفی شاہ امین کے اس نثری رسالے کا تذکرہ سب سے پہلے ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں کیا تھا [۱]۔ اس رسالے میں ذاتِ باری تعالیٰ کی تشریح، عقاید صوفیہ کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ :

: اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیان کرنا چاہا تو اول اس میں سون ایک نظر نکل سو اس سے امین، دیکھیا ہوا۔ امین شاہد کہتے ہیں یو دونوں ذات کے دو طور ہیں ذات نے اپس کو دکھیا اسے نظر کہتے ہیں دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں :

مولوی نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنی کتاب "دکن میں اُردو" [۲] میں اس رسالے کا ذکر کیا ہے اور اقتباس بھی دیا ہے۔ لیکن یہ اقتباس مذکورہ بالا اقتباس ہی ہے جو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی کتاب میں مندرج ہے۔ اسی بنا پر قیاس یہ ہے کہ مولوی ہاشمی صاحب کی معلومات کا ماخذ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی کتاب ہی ہے۔

---

[۱]۔ "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۲۷
[۲]۔ "دکن میں اُردو" صفحہ (۲۱۵)

مجھے "گنج مخفی" کا ایک مخطوطہ کتب خانہ درگاہ امین الدین اعلیٰ میں دستیاب ہوا ہے۔
اس میں شاہ امین اپنے مرشد سید محمد حسینی کا حوالہ ان الفاظ میں دیتے ہیں۔ :

"سید محمد حسینی میرے پیر، عبد کون تون ہے دستگیر۔
اللہ مجھ پر کرم کر، برکت محمد پیغمبر۔ "

رسالے میں زمین آسمان عرش کرسی کی وضاحت انسانی اعضا کی تشبیہ کے ذریعہ سے کی گئی ہے۔ جابجا اشعار بھی آتے ہیں۔ مسلکِ صوفیہ، رموز اور تکوینِ خلق اور دوسرے مسایل جیسے محمد کا ظہور، ذکر جلی۔ قلبی اور روحی کا بیان ہے۔ اور "من میں ڈوب کر سراغ زندگی" پانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس رسالہ کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ قدیم گنج مخفی میں آپ مقیم پانچ ذکران میں مگتا ابی جلی قلبی روحی سری خفی۔ اپس میں تھا آپ خفی اندیشا کیا سو دوسری دیکھا اپس روحی سون بوجا اپس قلبی سون جلی ذکر میانی اون اتلہی بولیا کن فیکون محمد ہو کر نکلا بہار ابر قہ خاکی کر اٹھا پنج تن لیانی اپین رب ہر ہر تن میں پنج کی سب ذات کیوں کیا نور جھلک جیئو سون یو ہے دیکھ ایک نزد کھواب تجکون

بیان فرض جایز میں سب کون عیان ذات یان "

اشیاے کائنات کی تشریح انسانی اعضا کی تشبیہ کے ذریعہ اس طرح کرتے ہیں :

" زمین پر جیون ہے ندیا لہران ۔ تیون ہے جسد کے سب ہزا (اعضا)

زمین پر جیتی جیا نیل ساری تنگی سر کے بال
تل برابر ہد انکھ میں جو برابر ہد نفس میں
تیرے رخسار ہے کرسی پیشانی تیری ہے عرش کی کنگوری

تلی کہی سو زمین کا قیال کلیجا کہی سو........ (مٹا ہوا)
سورج حال دل ہے چاند کے مانند جان کر دیے ہیں۔ تاریاں تیبون بیجیان
روح بادشاہ عقل وزیر کتووان ہے "

"گنج مخفی" کو شاہ امین کے ایک مرید معظم نامی نے منظوم کیا ہے۔ اس نظم کا ایک مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے [۱]۔ معظم، سکندر عادل شاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ اس کی دو تصانیف "شجرۃ الاتقیا" اور "گنج مخفی" کا تذکرہ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "دکن میں اردو" میں کیا ہے [۲]۔ معظم نے اپنے مرشد شاہ امین کی مدح حسب ذیل اشعار میں کی ہے :

اب جانوں بیجاپور ہے پور وہاں شہ پور
وہاں امین علی ہے پیر ہے روشن دیکھ ضمیر
ہے پیر میرا تو قادر اور حاضر ہے اور ناظر

معظم نے سلطان سکندر کی مدح میں بھی چند شعر لکھے ہیں جن میں سے ایک شعر یہ ہے :

جیوں تو شہنشاہ دیکھ پہچانے سلطان سکندر جانے

۲۔ گفتار شاہ امین : اس رسالے کا تذکرہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو "رسالہ اردو" [۳] میں شایع ہوا ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں :

"ایک چھوٹا رسالہ گفتار شاہ امین کے نام سے ہے جس میں تصوف کے بعض مسایل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی ہے"

۳۔ نور نامہ : یہ رسالہ "مجموعہ رسایل شاہ امین الدین اعلیٰ" میں شامل ہے جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے۔ اس پر پروفیسر سروری نے فہرست مخطوطات میں تشریحی نوٹ لکھا ہے [۴]۔ رسالہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

"الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علی رسولہ و محمد و آلہ اجمعین۔ بدان راشدک اللہ فی الدین

---

[۱] "تذکرہ اردو مخطوطات" جلد اول صفحہ ۱۴۸
[۲] "دکن میں اردو" طبع چہارم صفحہ ۲۱۲
[۳] "رسالہ اردو" جلد ہشتم شمارہ
[۴] "فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ" صفحہ ۳۴

ہر طلب صادق مخفی و محتجب نماند کہ حق تعالیٰ در قرآن مجید فرمودہ کہ

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

ہور اس کا معنا خدا کہیا ہے دیا کہ تحقیق نہیں کوئی موجود جز این .....

اس کے بعد نورِ معرفت کی تجلیات کے مظاہرے کا ذکر ہے۔

" کہتا دوسری یکہ تمیز یو ہے کہ نور یکہ دریا بے پایاں ہے اس پر توظان (موجان) آتیاں جاتیاں سو عرفان ہے اس دریا کے بہیتر تے موظان پر تیا سو ذات کا میوہ ہے "

۴۔ ارشادات : اس کی صرف تمہید نثر میں ہے [1]۔ "ارشاد نامہ" نامی ایک اور رسالے کا مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ذکر کیا ہے [2] جس کا پتہ انھوں نے مولوی عبداللہ صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں چلایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ امین نے اپنے والد شاہ برہان کی مثنوی "ارشاد نامہ" کو نثر کا جامہ پہنایا "ارشادات" کے مطالب کو نو ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کو "تماشا" سے موسوم کیا گیا ہے اس طرح اس رسالے میں نو "تماشے" ہیں۔ پہلا "تماشہ" نظم سے شروع ہوتا ہے :

" سفر تماشا ظاہر و باطن دیکھنا لازم تجہ امر الست بر بکم مختار میثاق تھے بوجہ
پہلا تماشا دیکھنا واجب پہلے تن کا بھوکیہ حواس خمس ہو کیوں کر برتیں کتیا کتے
سنجو کہ پانچ اناسر "

۵۔ نکات معرفت : جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں وجود اور معرفت باری کے رموز بیان کیے گیے ہیں یہ رسالہ بھی کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے اور پروفیسر سروری نے اس کی کیفیت "فہرست" میں قلمبند کی ہے۔ ذیل میں اس رسالہ کا اقتباس درج ہے :

" اللہ بڑا صاحب ہے اسکوں بھوت ہور نور درنا اس کے خدائی تھے۔

---

[1] [2] "دکن میں اردو" طبع چہارم صفحہ ۲۱۵

دونوں عالم پیدا کرنے میں عقل کیا آنکھیاں حیران ہیں خدا دایم قایم ہے :

یہ عبارت شروع کے حصۂ تمہید کی ہے اس کے بعد سے ابواب شروع ہوتے ہیں۔ پہلا باب : بصیرت اور بصارت : کے عنوان سے ہے۔ لیکن نسخہ کرم خوردہ ہے اور بعد کے اوراق غائب ہیں۔

: اُجلے کاغذ پر اس کالی ستران میں نور تو نا دیکھین اسے مخلوق کہتے ہیں ایچ ہین
پہلے قرآن ہیں خدا کہیا اس قرآن کون کاغذ :

۶۔ رسالہ نظم و نثر : یہ رسالہ بھی نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے : مجموعہ رسایل شاہ امین : کے مخطوط میں شامل ہے۔ اس میں شاہ امین نے اپنے والد شاہ برہان کے اقوال کے حوالے جا بجا دیے ہیں۔

: ہور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح بھی اور تمام پیغمبران کی روح بھی ہر
یکیک احوالان کی روح بھی گزرنے کی اب آگے ہونے والے کاماں ہور اب گذرے
کاماں اس طالبوں کو

۷۔ عشق نامہ : یہ رسالہ چھ رسالوں کے ایک مجموعہ کے ساتھ کتب خانہ درگاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپور میں مجھے دستیاب ہوا۔ لوح پر عبارت : رسالہ امین الدین اعلیٰ : درج ہے۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل رسایل ہیں :

۱۔ : چہار پیر و چہار خانوادہ : مصنف نامعلوم
۲۔ : رسالہ تصوف : " " (فارسی زبان میں)
۳۔ : کتاب المرغوب فیہا الکلام لب لباب حل الرموز مفاتح النور اسرار اللہ : درج ہے۔
۴۔ : رسالہ عشق نامہ : شاہ امین الدین اعلیٰ
۵۔ : رسالہ فارسی : مصنف نامعلوم
۶۔ : شرح کلمہ طیب : شاہ امین الدین اعلیٰ

: عشق نامہ : کی ابتداء درود سے ہوتی ہے اور آگے چل کر عشق خداوندی کے رموز بیان کیے

گیے ہیں۔ ذیل کے اقتباس سے رسالے کے مطالب کا اندازہ ہوسکے گا :

: لیکن بھایوں کتا ہے بیچ اسباب کی امید الی اللہ لاتقنطو من رحمت اللہ ای بھائی جان کہ بیچ اس جہان کے تین چیز ہیں۔ یعنی عشق، ہور عاشق ہور معشوق، یہ تین ظاہر ہیں۔ جب یو عشق بیچ دل کے بتر کے تو جو کچھ کے غیرت ہوئی یعنی محبوب ہو تیو او سی جلا ڈال جیسا کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں جہاں عشق است دیگر زرق ساری ہمہ بازیست الاعشق بازی جس وقت کہ ای اک تیری تئیں حاصل ہوئی یعنی تیرے دل میں عشق پیدا ہوئی تو تن تیرا چھیا لکڑی یو نکی ہیں سو میں جاوی یعنی دوی جل جاوے تو جب تو ن نار ہے تیرے میں :

۸۔ شرح کلمہ طیب : یہ رسالہ چودہ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا آغاز بھی "عشق نامہ" کی طرح محمد صلعم اور صحابہ اور اہلبیت پر درود سے ہوتا ہے۔ آگے چلکر "کلمہ طیب" کی شرح کی گئی ہے۔

ذیل میں اس کا اقتباس درج ہے :

: جان جو بنا اسلام کی ہور دین رسول اللہ علیہ وآلہ کا کلمہ طیب اور وہ جامع ہے خاص سب۔ مراتب عروجی ہور نزولی کیتن ہور تجلیات الٰہی کیتین :

اس کے ساتھ چند عربی اشعار ہیں جن کی شرح دکھنی میں کی گئی ہے نمونہ حسب ذیل ہے۔ :

: اتشفعُ امتہ بی فاذا ارادا الذکر :

شفاعت کا کرامت کا اپنی باپ کے پس جس وقت ارادہ کرے ذکر کر تھاری کے۔

۹۔ ذکر نامہ : اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں مخطوطہ ہے۔ ایک اور مخطوطہ کتب خانہ درگاہ شاہ امین الدین اعلیٰ میں بھی مجھے دستیاب ہوا لیکن درگاہ امین الدین اعلیٰ کا مخطوط بہت مختصر اور صرف ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ مخطوط نامکمل ہے۔

"ذکر نامہ" میں ذکر کے مدارج بتائے گیے ہیں۔ اسی موضوع پر ان کے والد شاہ برہان نے بھی لکھا ہے۔ لیکن عبارت اور اندازِ بیان دونوں کا مختلف ہے۔

ذیل کے اقتباس سے مختلف اذکار کی تفصیل واضح ہوتی ہے :

* ذکر جلی یعنی زبان سوں ہے ہور تمام باتاں وہی ہے۔ ذکر قلبی یعنے دل میں یاد، ذکر روحی جیو کی بہتر نظر سوں، ذکر سری بہتر نذر کے وہ مقصود تحقیق، ذکر خفی غیر اللہ ثابت کرتا ہے۔ دیگر اوس ودرسوان) ذکر جلی میں کرنا زبان سوں اپنی صفت خدا کی کرنا جون محیط ہے یوں مقصود پچھانی مور معرفت کریں و قلبی جیکچہ کیا و بیان کیا ہور سو دہ اپنے دل میں قرار خدا و روح جوں اپنے دل میں قرار کیا ہے۔ و تحقیق دیکھے مشاہدہ اللہ کا دسے جیکچہ دیکھا سو اس پر محبت یکریں سب چیزوں میں ایسی پچھاتیں ہور دیکھیں :

اس کے بعد ایک فارسی حکایت لکھی ہے :

ارشاد نامہ : اس رسالہ کا تذکرہ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب: دکن میں اردو[1] کیا ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے۔ :

* بسم اللہ نام اللہ کا۔

اللہ محمد کے راز رموز کے باتاں کسی نامحرم کے آگے نا بولنا بولینگے تو کافر ہوئینگے سو دیولنے ہو وینگے تو اتو کون بول کر دیولنے نا کرنا ہوا پی سنا کر کافر ہونا یو شرط اس زبان سوں ذکر کرنا اللہ اللہ..... اے بار خدایا ارادت کو مجھ پر آستی تا کہ تیری احد ذات میں فنا ہوئی الف کا لا نفی الا ثبات ذات تعلق صفات بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔

پروفیسر عبد القادر سروری صاحب کی بیاض میں اسی نام کا ایک رسالہ ملتا ہے لیکن اس کی ابتدائی عبارت مختلف ہے۔ ذیل کا اقتباس مذکورہ بیاض ہی سے اخذ کر کے یہاں دیا جارہا ہے :

---

[1] " دکن میں اردو " صفحہ ۲۱۵

"ثنا اور شکر سزاوار ہے اس خدا کون جو انسان کیتیں مشرف کیا ہے اپنے ذات وصفات کے معرفت سوں"

رسالہ وجودیہ: اس کا تذکرہ بھی مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے کیا ہے۔ لیکن مرتب مقالہ کو یہ رسالہ دستیاب نہ ہوسکا۔ مولوی ہاشمی صاحب کی کتاب سے اس رسالے کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:

"اے عارف خدائے تعالیٰ قرآن میں فرمایا ہے، کُل شیئً محیطاً وَ فِی اَنفُسکُم اَفَلَا تُبصِرُونَ

اس واسطے ضرور ہوا کہ کچھ معرفت حق کا بولنا جون آپ کون سچا کیا

تبتوں قال علیہ السلام تکلم الناس علی قدر عقلوھم

یعنی آدمی بات کرتا ہے اپنی عقل موافق

جو کوئی پیر کامل سون یہ دیکھے عن اوس کا متاع ہے نین ہے

اے عارف ہر ایک انسان کون پانچ وجود ہیں ہر ایک وجود باری تعالیٰ کا ہے

ہر ایک وجود کی شرطان اور لوازمات ہیں"

شاہ امین کی تصانیف پر تبصرہ

شاہ امین کے اسلوب بیان کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:

"شاہ امین کی زبان اپنے دادا شمس العشاق میران جی اور اپنے والد شاہ برہان سے کسی قدر زیادہ صاف ہے"[1]

ڈاکٹر زور نے بھی تقریباً اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"باپ اور دادا کے مقابلے میں شاہ امین کے اسلوب بیان میں بہت روانی اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ دوسرے ہم عصر شعراء کے مقابلے میں ان کی شاعری فطری اور قیود شعری سے آزاد ہے"[2]

---

[1] رسالہ "اردو" جلد ۲۹۔ ۸

[2] "اردو شہ پارے" صفحہ ۷۰

پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :

" شاہ امین الدین کی شخصیت اس عصر کے شعرا میں سب سے مقدس ہے۔ اسلاف کی طرح آپ نے بھی سلوک و معرفت میں کئی رسالے ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں چند منظوم ہیں اور کچھ نثر میں ہیں۔ نظم فرمائے ہیں۔ نظم میں آپ نے کچھ جدتیں بھی کیں مثلاً آپ کی نظم جو "محب نامہ" کے نام سے منسوب ہے۔ غزل کے قافیہ کی ترتیب رکھتی ہے "

آگے چلکر لکھتے ہیں :

" قدیم اُردو میں اس طرز کی نظمیں کم دستیاب ہوتی ہیں یہ نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان اُردو میں پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ وسعت پیدا ہو گئی تھی " ۔ [1]

شاہ امین کا اسلوب ان کے باپ اور دادا کے رسالوں کے اسلوب کے مقابلے میں کسی قدر نشو و نما پایا ہوا ہے۔ اور شاہ برہان پر ہندی کا اثر زیادہ تھا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ شاہ برہان کی اکثر نظموں کی بحریں بھی ہندی ہیں۔ شاہ امین کی تحریروں سے عربی اور فارسی کے اثر کی زیادتی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب بیان پر بھی فارسی کا تھوڑا بہت اثر ہے۔ وہ فارسی اضافتوں اور ترکیبوں سے بھی بہت کام لیتے ہیں۔ مثلاً ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو :

۱۔ اے بارِ خدایا ارادت کو مجھ پر آستی کر۔ تیری احد ذات میں فنا ہوئی۔ الف کا لانفی الاثبات۔ (رسالہ وجودیہ)

۲۔ " تحقیق ذکر ہے غیر نفی اللہ ثابت کرنا ہے " [2] (ذکر نامہ)

---

[1] " اُردو مثنوی کا ارتقاء " صفحہ ۵۸

[2] مقالہ ہذا صفحہ

۳۔ : جو کوئی پیر کامل سون یہ دیکھے عین اس کا متاع ہے :

بعض جگہ عربی فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ مثلاً

نبی پر کٹ ذات ظہر ہے ؎ معشوق حق اللہ نور ہا علی نور ہے

حقیقت حقایق ذات کمال ہے ؎ صورت معنی ذوالجلال ہے ۔ ؎۱

شاہ امین کی اکثر نظموں کی بحریں فارسی ہیں مثلاً ذیل کی غزل میں :

راہ صراط پل جو ن سر مانگ جو چھپی ہے ؎ کاہے کشان سمان پر محب بلادے کون

اور

زدستم رفت عنان جو رھیا نہ ہوش منج میرا

بیا اے ماہ ظلماتم دھڑک دل کون کی دیتا نیں ؎۲

شاہ امین کے رسایل زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں عوامی مسلوں کو بیان نہیں کیا گیا بلکہ صرف تصوف اور حقیقت کے مسایل ہی بیان کیے ہیں شریعت کے مسایل پر بھی وہ زیادہ توجہ نہیں کرتے۔

؎۱ : اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ؛ صفحہ ۶۲

؎۲ : رسالہ اُردو جلد ششم : صفحہ ۲۹

(۷)

شاہ برہان الدین اور شاہ امین کے خلفاء و تلامذہ

نثر کی ترقی۔ مذہبی تحریروں کی طرف رجحان ۔ اس دور کے مشہور مصنفین ۔
مولانا عبداللہ مصنف : احکام الصلواۃ :۔ میران جی خدانما : شرح تمہید :
: رسالہ وجودیہ :۔ : چکی نامہ :۔ : شرح تمہید : کے مختلف ترجمے ۔ شاہ میران
حسینی ۔ : خلاصتہ الرویا :۔ میران یعقوب : شمایل الاتقیا : شاہ برہان
الدین قادری راز الہی ۔ : وجودیہ :۔ شاہ نور محمد قادری : رسالہ نور دریا :
: نو بطون :۔ عابد شاہ : گلزار السالکین : : کنز المومنین : عبدالصمد
: تفسیر وہابی :۔ محمد شریف : گنج مخفی : حبیب اللہ قادری : تحفتہ المرسلہ :
ولی اللہ قادری : معرفت السلوک : شاہ میر : اسرار توحید : انتباہ الطالبین :
نو بطون : رسایل قادریہ :۔ : عوارف المعارف : اور چند اور کارنامے
جن کے مصنفین کا پتہ نہ چل سکا ۔ مذہبی نثر پر تبصرہ ۔

(۷)

شاہ برہان اور شاہ امین کے خلفاء و تلامذہ

نثر کا جو بیج آٹھویں صدی میں بویا گیا تھا (۹) نویں اور دسویں صدی ہجری میں نا ور درخت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اور گیارھویں صدی میں اسے برگ و بار آنے لگے۔ شاہ میراں جی اور ان کے خاندان کے بزرگوں نے اُردو میں تصنیف و تالیف کے جو معیار قایم کیے تھے۔ ان ہی کو ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں اور بعد کے لکھنے والوں نے اپنا نمونہ (Models) بنایا۔ قدیم دور کے وہ شاعر اور انشا پرداز پیدا ہوئے جن کے بلند رتبہ کارناموں کی وجہ سے اس دور کو "زرین دور" سے بجا موسوم کیا گیا ہے۔

اس دور میں اُردو نظم و نثر کی وسعت کا اندازہ شاعروں اور ادیبوں کے اس وسیع گروہ سے ہوتا ہے جو اس زمانے میں ابھرا اور نظم اور نثر میں ایسے کارنامے پیش کیے جو "کلاسکس" کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان میں گولکنڈے کے تاجدار محمد قلی اور اس کے دربار کے شعرا وجہی۔ غواصی اور ابن نشاطی نے معرکتہ الآرا ادبی اور شعری کارنامے پیش کیے۔ بیجاپور میں شاہ میراں جی۔ شاہ برہان الدین جانم۔ شاہ امین الدین اعلیٰ۔ شاہ میراں جی خدا نما۔ مولانا عبداللہ نے مذہبی اور فلسفیانہ تحریروں کو ترقی دی۔ اور شاعروں میں مقیمی۔ نصرتی۔ ہاشمی وغیرہ نے نظم میں گولکنڈہ کے شعرا سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ شاہ برہان الدین اور شاہ امین کے اکثر خلفا اور مریدین نے انھیں بزرگوں کے اتباع میں مذہبی موضوعات پر تصنیف او ترجمہ کا سلسلہ جاری رکھا اور لکھنے والوں میں مشہور یہ ہیں :

۱۔ مولانا عبداللہ ۲۔ میراں جی خدا نما ۳۔ میراں حسینی ۴۔ میراں یعقوب

۵۔ برہان الدین راز الہٰی ۶۔ مخدوم شاہ حسینی ۷۔ حبیب اللہ قادری
۸۔ ولی اللہ قادری ۹۔ سید شاہ میر ۱۰۔ اعظم۔

مولانا شاہ عبداللہ سنہ ۱۰۳۲ھ

مولانا عبداللہ کے رسالے "احکام الصلوٰۃ" کا حوالہ نثر کی اکثر تاریخوں میں "منشورات"[1] "اُردو کے اسالیب بیان" "دکن میں اُردو" وغیرہ میں ملتا ہے۔ ان کتب میں مولانا عبداللہ کی اس تصنیف کے اقتباس بھی دیے گیے ہیں لیکن کسی نے ان کے حالات زندگی پر کچھ نہیں لکھا۔

پروفیسر سروری نے اپنی کتاب "اُردو مثنوی کا ارتقاء"[2] میں شاہ وجیہہ الدین گجراتی[3] کے فرزند میاں شاہ عبداللہ کا ذکر کیا ہے۔ جو ہاشم حسینی العلوی (متوفی ۱۰۵۹ھ) کے مرشد تھے۔ ہاشم حسینی العلوی نے جو خود بھی اُردو میں لکھتے تھے۔ انھوں نے نظم میں اپنے کارنامے چھوڑے ہیں۔ ہاشم حسینی شاہ وجیہہ الدین گجراتی کے بھتیجے تھے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ "احکام الصلوٰۃ" کے مصنف مولانا عبداللہ، شاہ وجیہہ الدین گجراتی کے فرزند "مولانا شاہ عبداللہ" ہیں۔ اس کی تائید میں مندرجہ ذیل دلایل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ :

۱۔ مولانا شاہ عبداللہ کا زمانہ وہی ہے جو "شاہ عبداللہ" کا زمانہ ہے۔

۲۔ کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ نماز سے متعلق مسایل بیان کیے گیے ہیں۔ اور یہ وجیہہ الدین اور ان کے سلسلے کے اکثر بزرگوں کے خاص موضوع ہیں۔ اس لیے اغلب ہے کہ وجیہہ الدین کے فرزند نے ہی فقہ حنفی پر یہ کتاب لکھی ہو۔

شاہ ہاشم حسینی العلوی گجرات کے اولیاء کبار میں سے تھے۔ ان کی درگاہ بھی بیجاپور میں عوام و خاص کا مرکز اور مرجع تھی۔ مجھے ان کے ملفوظ "مقصود المراد" کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان ملفوظات کو ان کے مرید شاہ مراد ابن سید جلال نے جمع کیا تھا۔

---

[1] تاریخ نثر اُردو موسومہ بہ منشورات از احسن مارہروی
[2] اُردو مثنوی کا ارتقاء صفحہ ۲۰
[3] وجیہہ الدین گجراتی کی اُردو تصانیف کا حال پیچھے گذر چکا ہے۔

جو قلمی صورت میں تھے ۔ موجودہ سجادہ صاحب نے اس کو طبع کروا دیا ہے ۔ اس میں : بہت سے : عمل : اور اشعار وغیرہ اُردو میں بھی ہیں ۔

مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف : اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کے کام : میں شاہ عبداللہ کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے ۔ لکھتے ہیں [۱] ۔ :

" شاہ ہاشم ایک دن شاہ عبداللہ کی خدمت میں بغرض بیعت حاضر ہوئے ۔ مولانا عبداللہ نے بیٹھنے کے لیے ارشاد کیا ۔ شاہ ہاشم نے جواب دیا ۔ : میں تو خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں : ۔ مولانا عبداللہ نے فرمایا : میں تم سے کیسے خدمت لے سکتا ہوں تم میرے بھائی ہو ۔ شاہ ہاشم نہ مانے اور کہا میں آپ کی خدمت کے ارادے سے حاضر ہوا ہوں اس پر مولانا عبداللہ نے فرمایا مجھ میں جو کچھ ہے وہ میں نے تجھے بخشا اور پانچ عمل سکھائے :

اس واقعہ اور ان اشغال کو شاہ ہاشم نے منظوم کیا ہے ۔ نظم کا کچھ حصہ یہ ہے :

ہنس ہنس سپنے کہیا نانہان
دیوے تنج سب جیسے منج مانہان
میں بی نم نم سر کو لیتا
کیوں نہ لیو جو دیوے ییتا
پانچ شغل لکھ اکھیں سائیں
جیون رے کہوں ہوں چلن تو انھیں
شغل تکھینا کہیا پیو
ننھا بڑا ایک جانے جیو

---

[۱] " اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۱۴

اور

تھی دوشنبہ کیری رات

شاہ عبداللہ اکھی بات

کیونکہ اس خاندان کے دوسرے بزرگ ہاشم حسینی العلوی وغیرہ اور خود ان کے والد شاہ وجیہہ الدین دادا قاضی نصراللہ اور چچا قاضی برہان الدین (جو ہاشم حسینی العلوی کے والد تھے۔) بلند پایہ فقیہہ اور علم دین کے عالم گزرے ہیں ۔اس لیے مولانا عبداللہ کا اس موضوع پر اُردو میں تصنیف یادگار چھوڑ جانا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

حالات زندگی

: تذکرہ اولیائے دکن : میں شاہ عبداللہ کے حالات زندگی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وجیہہ الدین العلوی کے بیٹے اور خلیفہ تھے۔ : علم حدیث و فقہ میں بے مثل، تصوف و عرفان میں بے بدل تھے : [1] وہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں بیجاپور آئے اور مدت تک خلایق کو ارشاد و ہدایت سے مستفید فرماتے رہے ۱۰۳۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا مزار حیدرآباد میں فتح دروازہ کے باہر بتایا جاتا ہے، جہاں سید شاہ راجو ثانی بھی مدفون ہیں۔

تصانیف

ان کی تصنیف : احکام الصلواۃ : کے بارے میں ڈاکٹر زور اور مولوی نصیر الدین ہاشمی دونوں کی متفقہ رائے ہے کہ یہ فارسی کا ترجمہ ہے مجھ کو اس کا اصلی نسخہ کہیں نہ مل سکا۔ ہاشمی صاحب رسالے کے متعلق لکھتے ہیں :

: یہ ایک رسالہ ہے جو چھوٹی تقطیع پر خط نسخ میں لکھا ہوا ہے :۔ [2]

ہاشمی صاحب نے اس کا پتہ نہیں بتایا کہ اس کا نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا۔ البتہ انھوں نے ایک طویل اقتباس دیا ہے جس سے عیاں ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو دیکھا اور اس کا مطالعہ کیا ہے۔

---

[1] : تذکرہ اولیائے دکن : صفحہ ۵۸۰

[2] : دکن میں اُردو : طبع چہارم صفحہ ۱۱۷

ذیل میں ہاشمی کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

• اول کلمہ طیب پہلا کلمہ بولتا ہوں پاکی کا، کائیکی پاکی ایمان کی کفرتی۔ شرکتی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نہیں کوئی معبود برحق اِلَّا اللّٰہ ۔ مگر اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ محمد رسول خدا کے برحق ہیں۔ دوم کلمہ شہادت دوسرا کلمہ بولتا ہوں میں شہادت کا یعنی گواہی دیتا ہوں اس خدائے تعالیٰ کی ایک پنی یہ اشھد اور گواہی دیتا ہوں میں ان لا الہ کہ نہیں کوئی معبود برحق :

: بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دعا منگنے نماز جاتا ہے۔ ہی واہ کینے سوں نماز جاتا ہے۔ درد سوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ رونے سوں یاد نیا کی سبب سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں کسی کی موت کی خبر سن کر قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ بولتی سوں نماز جاتا ہے خبر سن کر نماز جاتا ہے نماز میں سُبْحَانَ اللّٰہ بولتی سوں نماز جاتا ہے :۔ نماز میں قہقہہ ہنسے سوں نماز جاتا ہے ۔

روح قبض ہو اسی وقت اسکیاں انکھیاں موچنا ہور پاؤں دراز کرنا ہور ہات دراز کرنا ہور دونوں پہلو کی طرف ولیکن سینہ پر نا رکھنا ہور اسی کی تھوڑی ہور سر کوں ہلا کر بندنا اسے تبر نخدان بولتے ہیں یو سب سنت ہے۔ •

ڈاکٹر زور نے بھی "اسالیب بیان" میں اس کا ایک مختصر اقتباس دیا ہے۔ تقریباً اسی زمانے کے لگ بھگ شاہ ملک نے ایک رسالہ مسایل دین کے متعلق نظم دکھنی میں لکھا تھا۔ اس میں بھی نماز کے فرایض و احکام بیان کیے گیے ہیں اس کا مخطوطہ کتب خانہ انڈیا آفس میں ہے اور مخطوطات کی فہرست کے مرتب بلوم ہارٹ نے اس کا نام "شریعت نامہ" بتایا ہے۔ لیکن مصنف "اردوئے قدیم" حکیم شمس اللہ قادری کی تحقیق کی رو سے اس کا نام "احکام الصلواۃ" ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبداللہ اور شاہ ملک دونوں

کے ترجموں کا ماخذ کوئی فارسی کتاب تھی۔

میراں جی خدا نما ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۷۴ھ

ان کا نام حکیم شمس اللہ قادری[۱] اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق[۲] نے سید میراں حسینی بتایا ہے۔ ڈاکٹر زور[۳] اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی[۴] ان کا نام "میراں جی خدا نما" بتاتے ہیں یہ دوسرا نام زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "رسالہ اُردو" میں ایک مضمون جو "قدیم اُردو کا سلسلہ" کے عنوان سے شایع کیا ہے۔ اس میں میراں جی حسن خدا نما ہی لکھا ہے۔ غالباً اسی بنا پر حامد حسن قادری نے اپنے خیال میں دونوں ناموں میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ "تاریخ داستان اُردو" میں لکھتے ہیں۔ :

"شاہ میراں جی خدا نما سید میراں حسینی بھی کہلاتے ہیں"[۵]

حالانکہ میراں حسینی اسی دور کے ایک دوسرے بزرگ ہیں۔ جن کا پورا نام "عبدالقادر شاہ میراں حسینی" تھا۔ یہ بھی شاہ امین کے اور شاہ محمود شیریں دہن کے فیض صحبت کے تربیت یافتہ تھے۔

حالات زندگی[۶]

میراں جی خدا نما صحیح النسب سید تھے۔ اور سلطان عبداللہ شاہ کے دربار سے متوسل تھے۔ سلطان نے ان کو سکندر عادل شاہ کی خدمت میں مملکت کے بعض امور طے کرنے بیجاپور بھیجا تھا۔ بیجاپور میں اس زمانے میں شاہ امین الدین اعلیٰ کی بڑی شہرت تھی۔ میراں جی اپنے مفوضہ کام سے فارغ ہو کر جب واپس ہونے لگے تو خبر اطلاع ملی کہ شاہ امین الدین اعلیٰ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان کے دل میں بھی ملاقات کا

---

[۱] "اُردو قدیم" صفحہ ۱۱۷
[۲] "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" صفحہ ۲
[۳] "اُردو شہ پارے" صفحہ ۹۹
[۴] "دکن میں اُردو" صفحہ ۱۲۰
[۵] "داستان تاریخ اُردو" صفحہ ۳۸
[۶] "تذکرہ اُردو مخطوطات" جلد اول صفحہ ۶۲ "رسالہ اُردو" اپریل ۱۹۲۸ء

شوق پیدا ہوا۔ وہ وہاں پہونچے اور زیارت سے مشرف ہوئے۔ شاہ امین کا بھی اپنے دادا شمس العشاق میراں جی کی طرح یہ قاعدہ تھا کہ غلبہ حال سے فارغ ہو جانے کے بعد حجرے سے باہر آکر ہدایت فرماتے تھے اور سر نگوں ہو کر زمین کرید اکرتے تھے۔ جب آنکھیں کھولتے تو تمام حاضرین سر جھکا لیتے۔ اس روز ان کی نظر ایک پتھر پر پڑی حاضرین سے پوچھا یہ پتھر کیا کہتا ہے۔ تمام لوگ خاموش رہے جس پر میراں جی نے آگے بڑھ کر کہا: یہ پتھر کہتا ہے امین الدین خدا ہو گیا ہے اور خدا امین الدین: یہ سُن کر شاہ امین اٹھے اور میراں جی کا ہاتھ پکڑ کر انھیں حجرے میں لے گیے اور چند گھنٹے کی خلوت رہی۔ جب میراں جی باہر آئے تو تمام خلفا اور مریدین کو یہ شبہ ہوا کہ خود حضرت امین الدین باہر آئے ہیں۔ سب کے سب سجدے میں گر گیے۔ جب سر اُٹھایا تو دیکھا میراں جی ہیں۔ اس کے بعد شاہ امین باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ: امین الدین میراں جی ہو گیا اور میراں جی امین الدین: انھوں نے میراں جی کو کچھ دنوں اپنے ساتھ رکھا۔ آخر خرقۂ خلافت عنایت فرما کر گولکنڈہ رخصت کیا۔ گولکنڈہ آکر وہ ہدایت و ارشاد میں مشغول ہو گیے۔ اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی اُردو میں تصنیف و تالیف کی۔ ان کی وفات بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۰۸۷ھ میں ہوئی۔: روضتہ الاولیا: کے مصنف کے بیان کے مطابق ان کا مکان اور روضہ بیرون حصار حیدر آباد تھا۔

: تاریخ گلزار آصفیہ: میں مذکور ہے کہ ان کی قبر شہر حیدر آباد کے باہر مستعد پورہ ' کاروان عبداللہ پور میں واقع ہے۔ ان کے مزار پر ان کے بیٹے امین الدین ثانی نے گنبد بھی تعمیر کرادیا تھا جو: کھڑکی گنبد کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بزرگ میراں جی خدا نما کے نام سے مشہور تھے عالمگیر کے گولکنڈہ فتح کرنے کے وقت وہ زندہ تھے۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ عالمگیر بادشاہ نے آپ سے فرمایا: کیا جناب خدا نما ہیں:

فرمایا: بابا اگر خدا نما نہ باشم پس خود نما باشم:

ان کی تین تصانیف کا سراغ ملتا ہے۔ جن میں سے دو نثر میں ہیں اور ایک نظم میں۔ نثر کی تصانیف یہ ہیں:-

۱۔ شرح تمہید ۲۔ رسالہ وجودیہ

نظم میں ان کی ایک تصنیف "چکی نامہ" "عرفان" لے ہے۔

چکی نامہ عرفان یہ ایک ترکیب بند ہے جس میں تین تین اور دو دو مصرعوں کے سولہ بند ہیں۔ ہر بند کے آخر میں ایک ہی شعر بطور ٹیپ کے لکھا گیا ہے۔

مثلاً :

بسم اللہ ذاتی ناون
قرآن اوپر لیا ٹھاون
کُل شیئ اس کی چھاون

لَااِلٰہَ کہنا اللہ میں رہنا۔ نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا

اس نظم کا ایک مخطوطہ کتب خانہ "ادارہ ادبیات اُردو" حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔

شرح تمہید : "تمہیدات" نامی ایک کتاب عربی میں عین القضاۃ ہمدانی کی مشہور تصنیف ہے۔ عین القضاۃ کا اصل نام عبداللہ بن محمد تھا۔ وہ میانہ کے رہنے والے تھے۔ اس لیے "میانجی" کہلاتے تھے۔ شیخ احمد غزالی برادر امام محمد غزالی کے وہ شاگرد تھے اور "تمہیدات" انھوں نے تصوف کے موضوع پر لکھی ہے۔ عبدالفضات ۳۳ھ میں قوام الدین ابوالقاسم سلطان سنجر کے وزیر کے حکم سے قتل کر دیے گیے۔ کیونکہ انھوں نے ایک اور کتاب "مکتوبات" لکھی تھی۔ اس میں قرآن کی بعض آیات کے باطنی معنی بیان کیے تھے جنھیں خلاف شرع متصور کیا گیا تھا۔

عین القضاۃ کی اس کتاب کی ایک شرح خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے بھی فارسی میں لکھی تھی۔ دوسری شرح میران جی خدانما نے اُردو میں لکھی ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میران جی نے خواجہ بندہ نواز کی شرح کا ترجمہ کیا ہے۔ یا اصل کتاب کا کیونکہ ڈاکٹر عبدالحق نے اس کے دو نسخے اور دو نام بتلاے ہیں۔ ایک "شرح تمہید ہمدانی" اور دوسرا "شرح شرح تمہید"

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کے کتب خانہ کی ایک بیاض میں ایک اور نسخہ جو موصوف کے بیان کے مطابق رایل ایشیاٹک سوسایٹی کلکتہ کے نسخے کی کیفیت اور

اس کا اقتباس ہے۔ اس نسخہ کے سرنامہ پر "ترجمہ تمہیدات عین القضاۃ" درج ہے۔ اس کی کتابت ۱۲۳۳ھ میں ہوئی ہے۔ مصنف کا نام درج نہیں۔ کاتب کا نام شیخ عبدالقادر ولد شیخ عبدالغفور لکھا ہے۔ اس کے جملہ (۱۵۵) اوراق ہیں۔ روضتین کے نسخہ کے (۳۶۵) اوراق ہیں۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"نہ جان ولی جان لینا اپنی ہیں دوسرا حال بدلتا ہے۔ خدا کون یوں ہی دایم یک حال ہے۔
قولہ تعالیٰ یمحوا اللہ مایشاء و یثبت۔ خدا کیا اس تن کو فنا کروں گا ہور جیو کو خوبصورت فرشتے کی ایسی دیگر رکھوں گا۔"

چند ابواب کی تفصیل یہ ہے: پہلا باب بصیرت ہور بصارت۔ دوسرا باب پیر ہور مرید کا مقصود۔ باب تیسرا جان۔ چوتھا باب اپنی پچھانت ہور خدا کی پچھانت کا۔
مجھے روضتین میں "تمہیدات" کے نام سے اس کتاب کا ایک مخطوطہ دستیاب ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق[1] اور ڈاکٹر زور[2] لکھتے ہیں کہ میران جی کی شرح اصل فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کا تھوڑا سا اقتباس بھی دیا ہے جو یہ ہے:

"اے عزیزان اے بات نین سنیاں بادشاہان گھوڑے منتعد کیے باج نین سوار ہوتے ہور کھوڑے میں کچ گھوڑا اچھے تو بھی نین قبول کرتے یعنی پیر کے عشق میں سچا ہوئے باج خدا کے عشق میں بن نا آسک سی ہور دیکھ تا سکی اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلوق حیا کن۔ اس کا معنا خدا کی پچھانت کر سوائے یات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات نواز نہارا ہے ہور اس کا اجالا جا لنہارا ہے یعنی دوست سو تو از نہارا ہور خوبیاں دینا ہارا ولے اس کا محبت اسے دگدا نا ہے یعنی معشوق کا محبت عاشق کو

---

[1] رسالہ اُردو: نہم شمارہ
[2] اُردو شہ پارے: صفحہ ۹۹

گالنلے ہے اس کے فراق ہیں ؀

کتب خانہ روضتین کے نسخہ کا اقتباس یہ ہے :

؀ اس کی خدائی تی دونوں عالم پیدا کرنے میں عقل گیان کیان انکھیان حیران ہیں۔ خدا دایم قایم ہے۔ اب کی بزرگی کا مہر سب پر ہے۔ ہور خدا ایکیلا ہے پیدا کرتا ہے ہور مارتا ہے۔ سب کونا اپنے ہاتھوں کرتلہے دوسرے کوں فرماتا ہے۔ ہور کہتے ہیں۔ دونوں عالم ہو کر اپی ایک اشارات میں دوجی بار کا حاجت نہیں رکھیا خدائے تعالیٰ ایسا پاک ہے۔ اوکے سانہیں ایسے خدا کون صورت نہیں خدا کون ایک جا ٹاتین خدا پیدا کرنہارا ہے ؀

تمہیدات : دس ابواب پر منقسم ہے :۔

رسالہ وجودیہ [1] اس نام کے کئی رسالے ملتے ہیں۔ ایک سید امین نے بارھویں صدی ختم کے قریب لکھا تھا۔ دوسرا رسالہ نور دریا قادری نے لکھا تھا جو شاہ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ تھے۔ ادارہ ادبیات اُردو میں ان دو کے علاوہ ایک اور رسالہ وجودیہ بھی محفوظ ہے جس کو ڈاکٹر زورؔ میراں جی کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ میری رائے میں بھی میراں جی ہی کی تصنیف ہونی چاہیئے۔ ان کے پیر شاہ امین الدین اعلیٰ نے بھی ایک مختصر سی مثنوی اس موضوع پر لکھی۔ ممکن ہے اسے ہی میراں جی نے نثر میں لکھا ہو۔ یہ مخطوط (۲۱) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

؀ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ایں رسالہ وجودیہ

اللہ محمد کے راز رمز کے باتاں کسی نامحرم کے انگے نابولنا بولینگے سو کافر ہووینگے وتینگے سو دیوانے ہووینگے۔ اون کون دیوانے بھی نہ کرنا اپے

---

[1] اسکا مخطوطہ ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ فہرست اُردو مخطوطات جلد اول ۲۵۰

کافی بھی نہ ہونا۔ زبان سون ذکر کرنا اللہ اللہ جون زبان میں کہتے ہیں تو دام
اوتے جاوتے اللہ اللہ کہنا سارا دن ساری رات کیا کام کرتے ہیں۔ سو اللہ
کی یاد سون کرتا یوں سنبال کر برتے تو ذکر جلی اللہ کی یاد سون کیا تین کا فائدہ
کیا۔ اور اللہ کی یاد سون نہ کیا ضایان کیا۔ جون شروع بیچ میں کیا سو حرام
ہے۔ اور درست رکھے سو حلال ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔
اللہ کی یاد سون فعل کیا تو حلال ہے۔ اور اللہ کی یاد سون نہ کیا حرام جیا۔
وہ حرام تے اے حرام ہے۔ ابلیس کی طرف تھے یاد کی طرف ثابت کیا سو
مشاہدہ ہے۔ یعنی اللہ ہمارے نزدیک ہے تن کے۔ فعل کرتے ہیں سو دیکھتا
ہے۔ بولتے ہیں تو سنتا ہے۔ برا خطرات نہ لاونا بری بات نہ بولنا۔
برے فعل نہ کرنا یو اللہ حاضر ناظر ہے۔ اپنے تن واجب الوجود۔ اس کا
مقام شیطان تے راہ شریعت ذکر جلی.....

اختتام کی عبارت حسب ذیل ہے :

شغل پانچواں حروف ت کو نعمت میں رکھا ہے۔ دعوت اس کا
شغل فی کھتر تعمتک یا اللہ یعنی بار خدایا تمام نعمت تیری بار کر منجے شغل
چھٹا حرف ب کون بسم اللہ میں رکھا ہے۔ دعوات اس کا بدر نافمی بخنک
یا اللہ یا بار خدایا برکت دے منجے اپنی برکتوں سین اون برکتوں سین برکت
پاؤں۔

شغل ساتواں حرف : ا : کو ذات اللہ کی بین رکھا ہے۔ دعوت اس کا
احد نانی احدک یا اللہ یعنی یا بار خدایا احد کر مت کون تاکہ تیری احد ذات
میں احد ہوں۔

واحد الوجود کا سگن نرگن مرنا سو سگن اور مر کے جیونا سو نرگن چہار روح نامیہ
روح متحرک روح ناطقہ روح قدسی چہار دل واجب الوجود ممکن ممتنع عارف

قلب مضغہ قلب منعم قلب سلیم قلب شہید نفس دل روح نور ایک سب
یعنی شاہد فعلون خارج دیکھو ۔

شاہ میران حسینی ولی گیارھویں صدی کے اواخر کے بزرگوں میں سے تھے ان کا اصلی نام عبد القادر ہے یہ بھی حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید اور تربیت یافتہ تھے۔ ان کے حالات بھی میراں جی خدانما سے ملتے جلتے ہیں لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ امین الدین اعلیٰ کے ایک اور شاگرد میران نام کے تھے وہ بھی اتفاق سے حیدرآباد ہی کے رہنے والے اور سپاہی پیشہ تھے۔ امین الدین اعلیٰ کی شہرت سن کر وہ بیجاپور گئے اور ان سے بیعت کرنے کے بعد ملازمت ترک کردی۔ بارہ برس کامل پیر کی خدمت میں لگے رہے۔ بعد تکمیل علوم باطنی خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اور حیدرآباد لوٹے انھوں نے شاہ امین کے خلیفہ شاہ محمود شیریں دہن سے بھی فیض باطنی حاصل کیا۔ ان کا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا اور شاہ علی بنڈہ کے قریب مدفون ہوئے۔ ان کی تصنیف ایک مذہبی رسالہ ہے جو "خلاصۃ الرویا" کے نام سے موسوم ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں خلاصۃ الرویہ کا ایک مخطوطہ موجود ہے اس کے سرنامے پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"یہ رسالہ شاہ عبدالقادر عرف شاہ میران کا لکھا ہوا ہے"

شاہ میران حسینی کی تحریر میں ادبیت جھلکتی ہے۔ وہ تصوف کے خشک سے خشک موضوع کو بھی جاندار بنا کر پیش کرتے ہیں تصوف کی دقیق اصطلاحوں جیسے "لاہوت" "ماہوت" وغیرہ کی تشریح وہ دلچسپ حکایتوں کے ذریعے کرتے ہیں۔

ایک حکایت کے ذریعے انسانی وجود کی توضیح کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنے اصل کی نقل ہے اس کی تشبیہ شیخ چلی کی حکایت سے کی گئی ہے جو اپنے آپ کو بھول گئے تھے۔

رسالے کی وجہ تصنیف یہ بتاتے ہیں :-

"بیان ذات ہور صفات کا ہور رمز اقبا اور مثال کے چند کلمہ ظاہر کیا جاتا ہے اگر کوئی طالب خدا کا سالک راہ کا اس بیان کے تئیں خوب تامل اور تفکر

سے دیکھے پانے تو انشا اللہ تعالیٰ پچھانت ذات اور صفات کا حاصل ہوکر
دونوں عالم میں دیدار خدا عیاں ہوا ؎

اس کے بعد درود ہے اور درود کے بعد اس طرح عبارت شروع ہوتی ہے :-

؎ ہر ایک شخص کون کسی چیز کے پانے کی تلاش ہوتی ہے تو لازم ہے کہ اول اس
چیز کے صفت اور ذات کی خبر معلوم کری بعد از اس چیز کی تلاش نیں تو اس
چیز کے پانے میں دہوکہ کھاوے گا اور دغا پاوے گا اگر کوئی شخص ہیرے کو پانے
کا طلب کرے تو اول ہیرے کا صفت اور خاصیت معلوم کرے بعد ازاں
ہیرے کو ڈھونڈھنے کی تلاش میں ہوئی ؎

پھر خدا کی صفات کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے :

؎ ہور صفات سو حی[1] قدیر[2] بصیر[3] علیم[4] سمیع[5] حکیم[6] برید
یہ سات صفتاں ذاتی ہیں صفت ذات سوں جدا نیں ہوتی ہے جیسا کہ دھوپ
آفتاب سوں جد نیں ہے۔ چراغ سوں جوت جدا نیں ہو سکتے اسے سات صفتاں
سوں سات عالم پیدا کیا جیسا کہ سات طبق آسمان سات طبق زمین سات
دریا سات پہاڑاں سات بہشت سات دوزخ سات روزاں سات آدمی
کے آزا بے سات ہیں یعنی آنکھ۔ ناک۔ موں۔ کان۔ ہاتاں۔ سینہ۔ پیٹھ۔
پاؤں۔ تعلق پیٹ کلہے کن فیکون اس کے بھی صرف سات ہیں ؎

تصوف کے منازل کی بھی تفصیل لکھی ہے مثلاً بتایا ہے کہ مراقبہ کیا ہے۔ جبروت لاہوت
سے کیا مراد ہے۔ وہ تصوف کے مشکل سے مشکل مسئلے کو دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

رسالے کے آخر میں ان کے کسی مرید صدر الدین نے ایک قطعہ لکھا ہے جس میں وہ اعتراف
کرتے ہیں کہ انہیں روح کے حقایق کا علم شاہ میراں کی بدولت ہوا ہے۔ قطعہ یہ ہے

جو ہے شاہ میران ولی جس کا نام   کھی مجکوں سب بھید اس کا تمام
جتا کچھ جو طالب کوں درکار ہے   وہ سب نظم کے بیچ اظہار ہے

صدر الدین اب نظم کون کر تمام درود بر محمد علیہ السّلام

میران یعقوب ۱۰۷۸ھ ان کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے لیکن ان کا نام اپنی بے مثل تصنیف "شمائل الاتقیا" کے سبب یادگار رہے گا۔ ادارہ ادبیات اُردو میں اس کتاب کا جو مخطوطہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف میران یعقوب۔ میران حسینی خدانما کے مرید تھے۔ اس میں میران یعقوب نے خدانما کے فرزند شاہ امین الدین ثانی اور نواسے شاہ میران ثانی کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اپنے مرشد کا سنہ وفات انھوں نے ۱۰۷۰ھ بتایا ہے لیکن عام طور پر میراں جی خدانما کا سنہ وفات ۱۰۰۱ھ بتایا جاتا ہے۔ اصل کتاب فارسی میں برہان الدین غریب کے مرید شیخ رکن الدین نے شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کے نام سے لکھی تھی۔ اس میں مصنف نے فارسی عربی کی تقریباً سو کتابوں سے تصوف کے متعلق بہت سے مقولے اور روایات جمع کر دیئے تھے۔ اس کی فہرست میراں یعقوب نے اپنے اُردو ترجمے میں بھی دی ہے۔ شیخ رکن الدین کی ایک اور کتاب: نفائس الانفاس: بھی مشہور ہے جن میں اپنے مرشد برہان الدین کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔

میران یعقوب نے شمائل الاتقیا کا جو ترجمہ کیا ہے وہ چار حصوں پر منقسم ہے پہلے حصے میں (۵۰) موضوع شامل ہیں۔ دوسرے میں (۳۰) تیسرے اور چوتھے میں گیارہ گیارہ یعنی اس طرح کل (۹۱) مسایل پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

کتاب کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ میراں یعقوب نے اس کتاب کا ترجمہ اپنے مرشد زادے شاہ امین الدین ثانی کی فرمایش پر کیا تھا یہ کتاب مرشد کی زندگی میں ختم نہ ہو سکی کیونکہ ان کا انتقال ۱۰۷۴ھ میں ہو گیا ان کے بعد ان کے بھانجے یعنی خدانما کے نواسے شاہ میراں ثانی ابن سید حسین خلیفہ ہوئے تو میراں یعقوب نے یہ کتاب ختم کرکے ان کی خدمت میں پیش کی۔

شاہ میراں ثانی کے بعد میراں یعقوب نے ایک اور بزرگ بابا ابراہیم خلیل کا ذکر کیا ہے پھر کتاب کی وجہ تالیف بیان کی اور یہ بھی لکھا ہے کہ اصل کتاب کس کی ہے۔ اس کی زبان

سلیس ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں اُردو کے اسلوب میں کافی تغیر ہوگیا تھا بہت سے قدیم الفاظ ترک کر دیے گیے تھے اور ان کی جگہ نیے نیے لفظ زبان میں داخل ہو رہے تھے۔ اسالیب میں جملوں کی سادہ ساخت اور اظہارِ خیال کے راست انداز سے بہت فرق پیدا ہوگیا تھا۔ بہ حیثیت مجموعی میراں یعقوب کی زبان جدید اُردو نثر کی زبان سے بہت قریب ہے۔

ابھی تک میراں یعقوب کی ایک ہی تصنیف "شمایل الاتقیا" کا حال معلوم ہوسکا ہے اس کے دو مخطوطوں کا پتہ چلا ہے جن میں سے ایک کتب خانہ آصفیہ اور دوسرا ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ آصفیہ والا مخطوطہ[1] (۱۱۶۵) صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ ابتداء میں (۱۶) صفحات کا ایک دیباچہ ہے جس میں اصل کتاب "شمایل الاتقیا" کے مضامین کی فہرست دی گئی ہے۔ کتاب کے نام اور موضوع کی وضاحت مصنف نے اس طرح کی ہے :-

" اس کتاب کا ناوں "شمایل الاتقیاء" کر رکھا گیا ہے ہور اس میں طریقت حقیقت کے علم ہور مقاماں کے چہار قسم ہور نو د پر ایک بیان کیا گیا ہے۔

پہلا قسم — طریقت کے لوگاں کے افعال کے بیان میں ہے و و لگلے پچاس بیان سوں۔

دوسرا قسم — حقیقت کے لوگاں کے احوال کے بیان میں و و لگلے تین بیاسوں ان

تیسرا قسم — خدائے تعالیٰ کے وجود ہور ذات کے صفات کے بیان میں ہور ازل ہور ابد کے بیان میں ہور حضرت محمد کے نک بک ذات کے صفت ہور نسبت میں ہے چہار بیان سوں۔

چوتھا قسم — نہایت کے اچنبھے ہور نازکیاں کے بیان میں ہور وزا و زا کی حقیقت ان کے رموزات ہور باریکیاں کے بیان میں ہور مہتر آدم کی پیدائش کی صفت میں ہور آدمیاں کی برائیاں ہور انسان کیاں خصلتاں ہور انو کی امیدواریاں ہور انو کے حق میں خدا

کیان عنایتاں کے بیان میں ہے کین بیان سون ۔

شمایل الاتقیا : مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے :

(۱) تقسیم طریقت کے لوگاں کے خوب افعال ہور سالکان کے مقاماں ہور مریدوں ہور طالباں ہور اس کے عجائبات ۔

(۲) توبہ فضلاں ہور انبیا ہور اولیاں کے خصلتاں ۔

(۳) بیان ذمیمہ ہور حمیدہ کا یعنی بری صفتاں ہور خوب صفتاں کا ۔

(۴) بیان ہدایت ہور ارشاد ہور دعوت کے مرتبیاں کا ۔

(۵) حقیقی اور مجازی خلافت کا ۔

(۶) خدا کے ولایت لانے کا ہور صاحب ولایت مشائخ کے خصلتاں کا ۔

(۷) بیان پیغمبروں کے معجزوں کا ہور ولیاں کے کرامت کا ۔

(۸) بیان ارادت ہور بیعت کے معنی کا ہور مرداں ہور عورتاں پیراں کے مریدیوں کے روش کا ۔

(۹) بیان مرید ہور مراد کے معنی ہور فضیلتاں کا ۔

(۱۰) بیان خرقہ کے فضل کا ہور خرقہ پوشاں ہور تو لیے والیاں کا ۔

(۱۱) بیان کترنے کے فضلاں کا ہور سب سر منداں ہاری ہور تھوری کچھ بال کتران ہاری آن کا ۔

(۱۲) بیان مریداں کی ادب کا خدا ہور پیر سون ۔

(۱۳) بیان زہد و ورع کے فضیلت کا ہور زاہدوں کا ۔

(۱۴) بیان تصوف کے فضلاں کا ہور صوفیا کے خصلتاں کا ۔

(۱۵) عام ہور خاص الخاص کے خوب ہور ....

(۱۶) بیان شریعت طریقت کے

(۱۷) بیان شریعت طریقت حقیقت کے لوگاں کے نمازاں کا ۔

(۱۸) قرآن کے تلاوت ہور تلاوت کرن ہارے کے فضلان کا۔
(۱۹) عبودیت ہور تحیت کے جنس میں سجدیاں کا۔
(۲۰) بیان عاشقاں ہور محبان عارفان ہور مقربان کے قبیلہ کا ہور کعبہ ہور حج کا۔
(۲۱) طریقت کے حقیقت کے لوگاں کے روزیاں کے فضل کا۔
(۲۲) یادلیوان بیان طریقت حقیقت زکوٰۃ کا ہور فضل کا۔
(۲۳) بیان شریعت طریقت کے بھانت کے علم ہور پرہیزگاری عاں کے خصلتاں کا۔ ہور ناپرہیزگاری عاں کا جبلیت کا۔
(۲۴) بیان شریعت معرفت کے فرق ہور اس کے مرتبے ہور درجاں رمزان کا۔
(۲۵) بیان عالم ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت کے مقام ان کا ہور رموزان کا۔
(۲۶) خدا کے محبت و معرفت و قرب و وصلیت کے طالبانکا سلوک کا۔
(۲۷) بیان ظاہر ہور باطن کے سفران کا ہور اس کے لطف عجائبیانکا۔ ترجمہ قشری
(۲۸) بیان خلوت کی فضلان کا ہور گوشہ نشیاں کے خصلتاں کا اس شرطانکا۔
(۲۹) صحبت کے فایدے ہور صوبانی کا ہور اس کے شرطان کا۔
(۳۰) بیان تجرید اور تفرید کے فضلان کا ہور دنیا کے خوبے ہور برائی ہور دنیا چھوڑنے کی فضلان کا۔
(۳۱) سلوک ہور جن کے فضلاں ہور خوبیان کا۔ بھوت بونے کی ضرر ہور برائی کا۔
(۳۲) بیان ذکر لسانی اور طلبی کے فضلان کا ہور ذکر مری ہور رومی کے ذاکران کے خصلتان کے ہور ذکر کے شرطان کا۔
(۳۳) بیان وزا وزا کی نیندان کا ہور اس کے خوبی عیان کا۔
(۳۴) بیان خطرے اور ہواجس کا ہور اسے رفع نفی کرنکا۔

(۳۵) بیان محو ہور سکو کا ذوق ہور شراب کا ہور اس ہر یک کے۔

(۳۶) قبض ہور بسط کا

(۳۷) (سات اکلی تیسواں) بیان عبادت ہور عبودیت ہور عبودیت ہور اصلیت

(۳۸) طاعت ہور اطاعت کا مطیعات خصلتاں کا۔

(۳۹) صدق ہور اخلاص کے خوبیاں کا ہور اس کے حقیقت بوجھنے کا ہور کذب ہور نفاق کے ہوایان کا۔

(۴۰) بیان خوب خصلتاں ہور برائی کا۔

(۴۱) بیان جود ہور سخا کا کرم ہور عطا کا ہور ایثار اتفاق کے۔

(۴۲) بیان علم الیقین ہور عین الیقین کے باریکیاں کا۔

کتاب کی وجہ تالیف یہ بتاتی ہے :۔

: یو کتاب پہلین فارسی تھا رکن عماد پیر معنوی حضرت سلطان العارفین خواجہ برہان الدین غریب کے مرید تھے۔ انو بھوت مدت تک بزرگان کے بھوت کتاباں ہور رسالے مطالعہ کیے تھے۔ اس کتاباں تھے ہر ایک بیان علاحدہ کرکر یو کتاب فارسی لکھے ہیں۔ ہور اس کا ناؤں شمایل الاتقیا کر رکھے ہیں۔ یعنی پرہیزگاران کے خصلتاں ہور اس تمام کتاباں میں جو کچھ ولیاں کا قول و احوال ہور خصلتاں ہور خارج کشف اپنے پیر کی زبان مبارک تھے سنے ہیں ہور تلقین پائے سو بھی تمام کتاب میں لیائے ہیں :

ذیل میں اس کتاب سے تجرید و تفرید کی بحث نقل کی جاتی ہے :۔

: تیسواں بیان تجرید و تفرید کے فضلان کا ہور دنیا کے خوبی ہور برائی ہور چھوڑنے فضلان کے تجرید ہور قول محقق تجرید ایس تین ہے ہور تفرید خدا باج سب چیز نیں ہے۔ خلق تے مجرد ہونا سو یو ہے جو نفع ہور ضرر سکہ ہور دکہ ایتو نے نہ جلتے ہور آپس تے ہور خدایا۔ سب چیزاں میں مفرد ہونا سو مردان

کی نشانی ہے۔

بیت : اس دوست کی درگاہ میں اول تون اپین کھوکہ جا
دوجک کے الایش سیتے دا اپنا تو دھوکہ جا

تجرید سو عاشقان کی بازار کا روز تفرید سو عارفان۔ وصادقان کا اسرار کا روز ہے۔ تجرید دجی جو بی چیز کن کے تلھار آیا ہو تس نے کناری ہووی تفرید او وہ ہے جو دو عالم تے (سے) ہور باخدا سب تے بیزاری لیوے تجرید ظاہر کے جلائی ہے خلق ہور ملک میں تفرید باطن کے جدائی ہے ملک ہور ملکوت تے (سے) رسالہ رموزالوہین تجرید تلوین کے مقام میں ہے ہور تفرید تمکین کے مقام میں ہے۔ تجرید غیر تے جدائی ہور تفرید خدا باج سب تے جدائی ہے کیفیت دنیان کا یو ہے فوایدالفواد دنیا نکون چہار صفت ہیں ایک ظاہر میں دیتا ہے ہور باطن میں نہیں سو جمع کرتا ہے اپنے حلال عورتان سون او نو کا حق ادا کرنے کی نیت سون دوسرا ظاہر میں دنیا نہیں ہور باطن میں دنیا ہے۔ سو طاعت بن کے ہے جو خلق کون دکھلانے بدل کرتے ہیں۔ تیسرا ظاہر ہور باطن میں دنیا ہے سو یو ہے۔ جو کسی کون دنیا کے چیزان ہور اسباب حاجت تے (سے) اکلا (لیکھ) اچھین (رکھین) چوتھا نہ ظاہر میں دنیا ہے نہ باطن میں سو طاعت ہے۔ جو اخلاص سو خدا چہ کے خاطر کرتے ہیں۔ رموزالوہین قدسی حدیثان میں ہے۔

یادنیا اخدمی من خدمتی واستخدمی من خدمك یعنی خدا کہتا ہے دنیا کون اے دنیا جس نے میری خدمت کرتا ہے۔ اتسکی تون خدمت کر جینے تیری خدمت کرتا ہے تون اسے اپنی خدمت فرما۔ دنیا تیری چھاؤں کے مثال ہے اگر تون اپنی چھانواں سے پیٹھ کرے گا۔ تو او تیری طرف مون کریں گے ہور تیری پچھین پچھین آوئے گی اگر تون اس طرف مون کرے گا تو او تیری طرف پیٹھ کرے گی ۔

شاہ برہان الدین قادری رازالٰہی وفات ۱۰۸۳ھ

شاہ برہان الدین قادری جو رازالٰہی کے لقب سے مشہور تھے۔ مشاہیر مشائخین کرام واکابر اولیائے عظام میں سے تھے فیضِ ارادت وخلافت شطاریہ حضرت شاہ عیسٰی جند اللہ شطاری سے حاصل کیا تھا۔ ہمیشہ متوکل اور تارک الدنیا رہے۔ زمانہ شاہزادگی میں عالمگیر اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور واسطے حصول سلطنت کے دعا کرنے درخواست کرتا۔ ایک شب جب شاہزادہ نے دعا مانگی آپ نے آمین کہہ دیا۔ روایت ہے کہ آپ کی دعا کی برکت سے عالمگیر تخت پر بیٹھا۔ آپ کے دو ملفوظ: روایح الانفاس: اور: ثمرات اطبات: فارسی میں ہیں۔ اُردو میں ان کی ایک تصنیف: رسالہ وجودیہ[1]: کا پتہ چلا ہے۔ برہان الدین قادری نے ۱۵ شعبان ۱۰۸۳ھ وفات پائی اور برہان پور کے محلہ سندھی پورہ میں مدفون ہوئے۔

رسالہ وجودیہ

اس رسالہ میں تصوف کے مسائل جیسے وحدتِ وجود دیدارِ باری تعالیٰ اور نماز کی اہمیت، روزہ کی برکتیں، حرص وآز کی برائیوں پر لکھا گیا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ رسالے کے آخر میں ایک ترقیمہ ہے جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔:

وجودیہ کی زبان بہت سلیس ہے۔ عالمگیر کے عہد تک اُردو زبان کے سانچے کافی منجھ گیے تھے جس کا کچھ اندازہ ولی اور اس کے معاصرین جیسے شاہ سراج اورنگ آبادی ــــ لچھمی نارائن شفیق وغیرہ کے کلام سے ہو سکتا ہے۔:

" خدا کے دیدار کو اپنے کر خدا کے راز کا ذوق لے کر نمنے ہوتا ہے ہور کسے مانگ سکتا۔ "

شاہ نور محمد قادری ۱۰۹۵ھ

رائچور کے: نوردریا: خاندان کے جدِ اعلیٰ اور شیخ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ تھے۔ ان کی زندگی کے بہت کم حالات کا

---

[1] : فن تصوف: نمبر ۸۱۷

پتہ چلتا ہے کسی تذکرے میں ان کے حالات نہیں ملتے۔ ان کے رسالوں کا ذکر حکیم شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور دونوں نے کیا ہے۔ حکیم صاحب "اردوئے قدیم" میں تحریر کرتے ہیں:

" عالمگیر کے زمانے میں گذرے ہیں آپ نے زبان دکنی میں کئی رسالے لکھے ہیں منجملہ ان کے ایک مجموعہ میں ہم نے آپ کے دو رسالے دیکھے جن میں مسایل وحدت وجود اور قضا و قدر پر بحث ہے "۔ [1]

ڈاکٹر زور نے "اردو اسالیب بیان" میں اس کا تھوڑا سا اقتباس دیا ہے۔ مجھے مندرجہ ذیل تین رسالوں کا پتہ چل سکا ہے:-

۱- رسالہ نور دریا [2] (وجودیہ)

۲- رسالہ نو بطون [3]

ان دو کے علاوہ ایک کتاب "صراۃ المستقیم" [4] نامی بھی ہے۔ احادیث جمع کیے گئے ہیں۔

رسالہ نور دریا اس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ یہ کل (۳۷) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوّف کے اسرار و غوامض بیان کیے گیے ہیں۔ مصنف اپنے استاد اور مرشد شاہ امین الدین اعلیٰ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ رسالے میں تکوین کائنات پیدائش نور محمدؐ اور اس سے متعلق مسایل لکھے گیے ہیں۔ احدیت اور واحدیت کی تفسیر بھی کی گئی ہے۔ اس حصے کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

" یو تینوں جل ذات کی مرتبے ہیں وہانسوں چاہا کہ اپس کی مراتب کا ظہور کروں کہ خود دیکھا دیکھتے میں یو پیدا ہوا کیا واسطے جہاں دیک ہے وہاں بوجھ۔ بغیر بوجھ کی دیک کو وجود ہیں ساس دیک کوں احدیت

---

[1] اردوئے قدیم طبع دوم ص ۱۱۹ - [2] مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ فن تصوف نمبر ۶۱۴

[3] مخطوطہ کتب خانہ روضتین

[4] مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ

بولی اس بوجکون وحدت بولے جو بوج میں ہور دیک میں دیسکو آیا سو اسی
واحدیت بولتے ہیں۔ ہور احدیت ذاتِ واحد ہے۔ وہاں کچ اعتبار صفت
کا نین سوائے یک نسبت کے ہور بیں پن کی ہور وحدت ذات قابل محض ہے۔
ہور واحدیت اینکہ ذات ہے صفتاں کی اعتبار سون احدیت مرتبے
سون پھر نزول ہور ظہر کیا سو آکر دیکھیا یعنی قابلیتاں پر نظر کیا اسی
دیکھنے میں بوج حایل ہوا اس بوج سون صفتان کو معاینہ کیا۔ ہریک صفت
صورت یک کر دسیاں سو اس دیک کو ارواح بولتے ہیں۔ اس بوج کون مثال
بولتے سب صورتاں دسیاں سو اسے ممکنات بولتے ہیں۔ سو ظاہر کاتن واجب الوجود
والسلام سون اول کے تین درجہ ہور بصر سون دویم کے تین درجہ پیدا ہوئے۔
ہوالاول ہوالآخر ہوالظاہر ۔

واجب الوجود کیا ہے اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں :

ظاہر کاتن واجب الاوجود اس کی ایک روح جاری اس کا شاہد من نور یو
تینوں مل مرتبہ بندہ کا ہے۔ باطن کاتن ممکن الوجود اس کی ایک روح مقیم اس
کا شاہد آنا نور یو تینوں مل مرتبہ محمد کا ہے۔ یہی ذات کا وجود اس وجود ذات کی
دیک ذات کی عروج کی ہور ظہور کے ہیں۔ ہور اسے نو بطون بولتے ہیں کنج مخفی
نقطہ ذات مطلق احدیت وحدت واحدیت ارواح مثال شہادت یو نوں مرتبہ
ذات کے نزول کے ہور ظہور کے ہیں جس وقت ذات مطلق نے اپنی نقطہ میں
سون گنج مخفی کو دیکھا سو تین درجے ہوئے سو احدیت وحدیت واحدیت
جو سنائی محمد کے ہیں سو احدیت جو دانائی محمد کے ہیں سو وحدت جو ہستے پنا وجو
پنا ہے سو واحدیت ہے احدیت نے اپنی وحدت میں سون واحدیت سون
دیکھا سو تین درجے ہوے ارواح یعنی جاری سو نینائی بندے کی مثال سو توانائی
بندے کی شہادت واجب الوجود عناصری ظاہر ہے و خاکی بندہ ہے ۔

رسالہ نوبطون اس رسالے کا ایک مخطوطہ مجھے روضتین (گلبرگہ) کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ رسالہ کے سرنامے پر : رسالہ نوبطون شاہ محمد قادری : درج ہے۔ حاشیہ میں یہ عبارت تحریر کی ہوئی ہے۔ : ارشاد بخش نوردریا کا ہے : ۔ یہ کل دس ورق کا چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں روح عناصر خمسہ کی تفصیل لکھی گئی ہے۔ ذیل میں اس کا اقتباس درج ہے :

: چہار باتاں چہار وجوداں چہار نفساں چہار عقلاں چہار منزلاں پانچہ عناصر کس کس ہوس خمسہ سبع صفات دو یم اس میں بر تنہاری روح ہور شاہد سے جو سٹ کر اوسی بولتے ہیں۔ ہور جو سٹ کر صفاتے ہیں۔ ہو ذاتی جو سٹ کر بوجی نین ۔

سوال۔ حق تعالیٰ واجب الوجود کیوں محیط ہے ہور ممکن الوجود کیوں محیط ہیں :۔

مخدوم شاہ حسینی ۱۰۸۰ھ ان کا مصنفہ ایک رسالہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے اس کے مطالعہ سے ہوتا ہے کہ مخدوم شاہ ۔ شاہ پیر اللہ حسینی اور پیر اللہ حسینی کے مرید تھے کیونکہ انھوں نے شاہ پیر اللہ کی مدح کی ہے۔ دوسرے مخطوطے کے سرنامہ پر جو عبارت درج ہے۔ اس سے ان کے شاہ پیر اللہ کے بھی مرید ہونے کا پتہ چلتا ہے :

: مخدوم شاہ حسینی جو حضرت شاہ پیر اللہ کے مرید تھے جو حضرت شاہ میراں جی خدا نما کے مرید تھے۔ :

ان کے تصنیف کردہ رسالے کا نام : تلاوت الوجود : (مراۃ السالکین) ہے۔ یہی رسالہ کتب خانہ سالار جنگ میں بھی حضرت خواجہ بندہ نواز کے رسایل کے ساتھ منسلک ہے۔ اور اسے بھی خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا گیا ہے ۔ سالار جنگ والے رسالے میں ابتدائی عبارت میں جس میں مصنف کا نام لکھا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطے میں حسب ذیل عبارت درج ہے :

: این رسالہ تلاوت الوجود (مراۃ السالکین) از تصنیف مخدوم شاہ حسینی۔

: این ما قولہ تعالیٰ الا لہ الخلق و الا مر۔ اس کا معنی خدا کہیا مجی بوجھو تمن کون پیدا کیا میرا اد تماری پر ہوا۔ او رامر خدا کا ہے اس وقت قالو بھی کہے تمن

میری سون وعدہ کی اس تن میں اچھکر ہمن تجھی تحقیق کرتے کہا اگر کوئی اس وعدے
کون پونچی تو مریکا دوست ہوئے گا اگر نین تو میرا دیدار نا دیک سکے گا ۔

رسالے کے آخر میں یہ عبارت درج ہے :-

" از تصنیف مخدوم شاہ حسینی کہ یکی از مریدان سلطان المحققین حضرت
شاہ پیرالہ حسینی وایشان خلیفہ تاج السالکین کامل العاشقین حضرت
شاہ میران جی خدانما است "

یہ رسالہ بھی سوال وجواب کی شکل میں لکھا گیا ہے جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوگا :-

" ای سالک سب عالم دو جھکری کی میانی پڑ کر ہلاک ہوتے ہیں۔ ان کی
مرادیوں ہے کوئی عاقبت کون دیدار دیکھنا یو ملتی ہیں کوئی یہاں دیکھنا بولی
ہیں عاقبت کون دیکھنا کہو رندی یہاں دیکھنا کہی سو ملعون یو دونو معنے
عاشقان کون صحیح ہیں جہاں دیکھن کو مرشد کی ظاہر صورت اور اپنی میں دیکھنا
سو عاقبت خدا کہا ہیں تماری کے شہرک کے نزدیک ہون کہیا سو پوچھنا یوں
قرآن ہیں سند اچھکر عمر ضایع کرنا کیا فاعدہ ۔

سوال طالب : پوچھا اے مرشد یو سند اللہ کی زبان قرآن نبی کی زبان حدیث اچھکر
نین پوچھنے کا کیا سبب ۔

جواب مرشد : سن اے طالب یو آیت یو ہے (عربی)
یو سب یک عالم کون دو دیکھتے ہیں۔ کوئی میں تون بولتے ہیں کوئی اللہ بندہ
بولتے ہیں۔ کوئی ازل ابد بولتے ہیں۔ کوئی نور ذات بولتے ہیں کوئی من عرف
نفسہ عرف بولتے ہیں کوئی تجرید تفرید بولتے ہیں کوئی نفی اثبات بولتے ہیں
کوئی فنا بقا بولتے ہیں۔ کوئی کفر اسلام بولتے ہیں کوئی میثاق محشر بولتے ہیں
کوئی دنیا دین بولتے ہیں جیکوئی اپنی پچھانت کی ہیں انو کو یو سب حاصل ہے
ای سالک اس دو جھکری [illegible] راحت نین۔ کوئی خدا کون اپنی

سکتا ہے تو تحقیق کرنا آپس کون۔

سوال طالب ۔ اے مرشد اسکون تحقیق کرنے کا طریقہ کیون کر ہے۔

جواب مرشد۔ ای طالب بندہ بالغ ہونے میں فرض اول اپس کون تحقیق کرنا اللہ کو پچھانیا یو مسلمانا کون ہور مسلمانا کیا عورت کون فرض ہے بوجنا حدیث اطلبوا العلم ولوکان باالسین اس کا معنی تو چین ماچین ملک ہے۔ وہاں تک مرشد تلاش کرنا تو تیرا مراد پاوے گا۔ پیر کامل ملی تو سالک پچھانا جیو پانی پانی کا جیو آگ جیو بارا باری کا جیو خالی خالی کا جیو ذات قدیم مانی پانی میں حزم پانی آگ ہیں حزم آگ بارے میں حزم بارا خالی ہیں حزم خالی اے سالک ان کی ۲۵ کن پانچہ پھل پانچہ رنگ پانچہ لذت پانچہ مقام پانچہ دروازے یو مرشد بلج بوجنا نین ۔

سوال طالب ۔ اے مرشد پانچ فرشتے کیوں پیدا ہوے۔

جواب مرشد۔ سُن اے طالب اول عزازیل ذات تے پیدا ہوا اس کا قدیم نانو رحمٰن التی اسرافیل پیدا ہوا اسرافیل تے عزرائیل پیدا ہوا۔ سالک جبرئیل آواز کون بولتے ہیں میکائیل مطلب کون بولتے ہیں عزرائیل نہنا ریھون بولتے ہیں۔ اسرافیل مطلب بوجا نہاریکھون بولتے ہیں میں عزرائیل دیکھنا دیکھون بولتے۔ اس کا نروارا مرشد بغیر نا ہووے۔

عابد شاہ سنہ ۱۰۹۲ھ

عابد شاہ کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملے ۔ کتب سے محض اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ یوسف شاہ راجو ثانی کے مرید تھے۔ جو ابوالحسن تانا شاہ کے مرشد تھے۔ سیّد شاہ راجو ثانی کا ذکر گزر چکا ہے۔ اکثر اس زمانے کے شاعر اور ادیب شاہ راجو سے عقیدت رکھتے تھے۔ عابد شاہ کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی۔ عابد شاہ دو رسالوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ گلزار السالکین ۲۔ کنز المومنین

گلزار السالکین یہ رسالہ سالکان راہ معرفت کی رہنمائی کے لیے لکھا گیا ہے۔ راہ سلوک و معرفت اس کے منازل اور مقامات روح۔ توحید۔ غرض تصوف کے کئی مسایل سے اس میں بحث کی گئی ہے۔ رسالہ کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے حمد و نعت کے بعد مصنف اپنے مرشد شاہ راجو کی مدح کرتا ہے۔ شاہ راجو کا انتقال ۱۰۹۲ھ میں ہوا اور مصنف نے یہ مدح خاص انہیں کے لیے لکھی ہے اس لیے قیاس یہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۰۹۲ھ سے قبل لکھی گئی ہوگی۔ مناجات کے آخری شعر میں مصنف نے اس رسالے کے دکھنی زبان میں لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ شعر یہ ہے :

شروع جو کیا ہوں یہ دکھنی کتاب
ہوا تمام جلدی سوں ہوئے شتاب

کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

اول ثنا و صفت کرنا اللہ تعالیٰ کا کہ او قادر ہے تمام چیز اوپر قدرت رکھتا ہے۔ اور ہر شے میں حاضر و ناظر ہے جیسا کہ شکر مٹھائی اور پھول میں باس۔ اسی طرح سب میں صنعت گیری رکھتا ہے۔

دیکھ تون آدم میں کیا صفت دھریا
اس کا صانع ہے خدائے کبریا

ہور تمام شے پر اس کی ذات بالاتر ہے۔

آخری حصہ کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

اگر کوئی پوچھا کہ اے مالک تیرے وجود کتے ہیں ہور راہ ہور منزلان ہور نفس اور شہادت اور مقام اور حال اور روح اور توحید اور نظر اور بادل اور زبان اور درجہ اور عناصر اور رنگ اور مزہ اور پھل اور مثال اور خاندان اور یہ سب چیزیں آپس میں کہتے ہیں جواب دے اس واسطے اس کی پچھانت کین تخلص ( ) بنایا ہوں [1]

---

[1] تذکرہ مخطوطات صفحہ ۳۱۴

کنز المومنین | اس ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ [1] اور دوسرا آصفیہ میں محفوظ ہے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے مخطوطے کے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :

: کتاب کی زبان دکھنی ہے۔ اس کے ماخذ مصنف نے عربی اور فارسی کی حسب ذیل کتابیں بتلائی ہیں :

آگے کتاب کے ماخذوں کی تفصیل دی گئی ہے جو حسب ذیل ہے۔ :

کنز المومنین۔ مفتاح الصلوات۔ کفایت الاسلام۔ کفایت العباد۔ تحفۃ الجواہر۔ تحفۃ النصائح۔ فتاویٰ۔ کتاب الاخبار۔ ہزار مسایل۔ محیط کاخ۔ کنز العباد۔ کنز ابتیاں۔ شرح وقایہ ہدایہ۔ بحر فایق۔ رایق۔ مشکات۔ تفسیر حسینی۔ تفسیر جواہر۔ قانی حال۔ منہاج الانوار۔ لطایف شاہی۔ کشف الحقایق۔ فتاوی ملتفت۔

: کنز المومنین : انیس ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کئی کئی فصلوں میں منقسم ہے جن کی مجموعی تعداد خود مصنف نے : ستر پر تین (۷۳) بتاتی ہے مشتملات کی تفصیل پورے دو صفحوں پر حاوی ہے۔ ان ابواب میں مسایل شرعیہ اور مسایل معرفت تفصیل سے بیان کیے گیے ہیں جیسا کہ مصنف خود لکھتا ہے۔ :

: علم شریعت علم معرفت پر جملہ اس کتاب میں انیس باب اور ستر پر تین فصل ہیں :

اس کتاب کے لکھنے کی بڑی غایت یہ تھی کہ :

: جو مشرکانہ عقاید دیگر اقوام سے میل جول بڑھنے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیل گیے تھے ان کی برائیاں دکھا کر ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے :

ذیل کے اقتباس سے مصنف اور

: الحمد اللہ رب العالمین۔ یعنی سرانا ہور تعریف کرنا سزاوار ہے۔

اللہ تعالیٰ کون کہ پیدا کیا ہے تمام خلقت کون۔ بعد ای عزیز اس کتاب کا نام
کنز المومنین رکھا ہوں۔ اس کا معنا مومن کا خزانہ ہے۔ ہور اس کتاب بنانے
والے کا نام فقیر الحقیر تراب الاقدام عابد شاہ حسینی الحسینی قدس اللہ سرہ العزیز
اس کتاب کون دکھنی ہے کہ ہلکا نکو سمجھو۔ اس بری بری فقہ سین مسئلہ جمع کر
کے لایا ہوں۔ تھوڑا تھوڑا ایں فتوے کی مسلۂ خفیف مسئلہ نہیں لیا۔ ہور جواب
سوال طرح طرح سے لایا ہوں ہور حدیث اور دلیل یا معنی لایا ہوں ہور
نصیحتاں لایا ہوں کہ سب لوگوں کون سمجھ ہوئی نین تو عربی فارسی پر کسی کون
سمجھ نین ہوتی تو اس واسطے دکھنی کیا کہ تمام لوگ سمجھ کر اللہ تعالیٰ کا حالت کری۔
ہور شریعت کا حکم بجانی۔ ہور کدو کسی کی دل میں مسئلہ کا شک آیا تو اس کتابوں
میں دیکھو۔ نام اس کتابوں کے یہ ہیں :

۱۔ قرآن شریف ۲۔ وشاہین ۳۔ کنز ۴۔ .... ۵۔ مفتاح الصلوٰۃ
و ۶۔ احکام و ۷۔ ترغیب الصلوٰۃ و ۸۔ کفایت المومنین و
۹۔ کتابت العباد و ۱۰۔ تحفتہ الجواہر۔

اس طرح ان کتابوں کے ناموں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جن سے مصنف نے استفادہ کیا۔ آگے چل کر علم دین کی اہمیت اور اس کے سیکھنے کی ضرورت کے بارے میں مصنف لکھتا ہے :

ہور مومن مسلمان پر فرض ہے جو علم دین کا سیکھے جیسا کہ حدیث نبوی
طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ اس کا معنی طلب کرنا
فرض ہے مسلمانوں پر ہور مسلمان کی عورتوں پر پھر دوسرا ڈھونڈو (ڈھونڈو)
علم کون کدو باگ (باگ) کے مان تی (ماتھے) پر ہین تو بھی۔
میں درنا سیک نیکون۔ دوسرا معنی اُطْلُبُ الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ فِی
فَمِ الْبَہَائِمِ یعنی ڈھونڈو علم کون کدو چارپانوکی جانور کے موں میں تو بھی

بھی یعنی او علم والے کا فعل حیوان سریکی تو بھی اس کی علم کون لیو فعل کون مت دیکھو۔ دوسرا حدیث طلب العلم و لوکان بالصین۔ اس کا معنا طلب کرو علم کا کہ چین میں ہے تو یعنی اتنا دور ہوا تو بھی جانا ہو رسکنا :۔

حدیثوں کی سند کے ساتھ تفصیل وضو نماز بیع وشرا۔ نکاح اور میت وغیرہ کے اصول سمجھائے گئے ہیں۔ ابتدا میں انسان کی تخلیق کے متعلق احادیث اور ترجمے درج ہیں پھر ارکان دین اس کے بعد زجر و توبیخ وغیرہ کے مسئلے بیان کیے گیے ہیں۔

حدود اور تو حد کو ذیل کے اقتباس میں یوں سمجھایا گیا ہے :۔

:۔ باب الحدود۔ تو حد کے معنی اصل میں منع ہیں۔ اسی واسطے بواب یعنے دربانکون حداد کہتیک اندر جانیکون منع کرتا ہے ہور بہار آنے کون ...

ہور جو حد کے شرع میں ہیں سو وسکے معنی یہ ہے کہ منع کرتا نہ کون کہ بندی ہور کیند کر بجہ میں آتا ہور محارم یعنے بھی حدود اللہ ہوتا ہی جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے۔

حدیث عربی تلک حدود اللہ خلد نقر بو ھا جیسا کہ تلک حدود اللہ خلد تعتد ھا باتی اوپر بول چکا ہوں ؎ :۔

عبد الصمد اس دور میں مسایل شرع اور تصوف کے علاوہ فقہ، حدیث اور تفسیر کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ "تفسیر وہابی" تفسیر قرآن پر لکھی ہوئی بسیط کتاب ہے جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ اس کے مصنف عبد الصمد بن نواب شکوہ الملک نصیر الدولہ عبد الوہاب نصرت جنگ ہیں۔ جو حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔

سورہ الحمد کی تفسیر کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

:۔ اللہ تعالی ایسا بڑا صاحب ہے کہ تمام آسمان اور زمین کا اور فرشتوں کا اور بہشت کا اور دوزخ کا اور ان میں کی چیزوں کا اور تمام عالم کا پیدا کرنے ہارا وہی اللہ تعالی ہے اور ایسا اللہ تعالی ہے کہ فضل کرنے ہارا اور

گناہوں کا بخشنے ہارا آخرت میں اور پالنے ہارا اور دینے ہارا رزق کا مال کا اور ملک کا اور آبرو کا اور فتح کا بندوں کو اور دعا کا قبول کرنے ہارا۔ "

محمد شریف

محمد شریف بارھویں صدی ہجری کے اوایل کے ایک بزرگ تھے جن کی ایک تصنیف "گنج مخفی" کا پتہ چل سکا ہے۔ "گنج مخفی" کے نام سے کئی تصانیف تصوف پر ملتی ہیں۔ چنانچہ شاہ برہان الدین جانم نے بھی ایک رسالہ اسی نام سے لکھا تھا۔ محمد شریف نے بھی اس نام سے ایک رسالہ لکھا۔ مصنف کے بیان سے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ "گنج مخفی" اصل میں فارسی تصنیف تھی جس کا انھوں نے ترجمہ کیا ہے۔ غالباً ان کی یہی ایک تصنیف ہے۔ زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ کتاب اردو نثر کی ترقی کی ایک اور منزل کا پتہ دیتی ہے۔ مصنف نے وجہ تصنیف کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب انھوں نے اپنی ایک دوست احمد خان خویشگی کی فرمایش پر لکھی تھی :۔

" عاجز خفیف فقیر الحقیر محمد شریف کتاب گنج فارسی دونوں جہان کی آرسی بولیا عبادت پاک کتے۔ الفاظ وحدانیت کے رسالے سوں ہور الفاظ وحدانیت کے رسالے برموزوں محب ہمدم ہور مخلص ہم قدم احمد خان خویشگی فصیح زبان ہور ملیح بیان سوں جمع کی۔ راست پر کرنا ہے انوکی دل ہور روح کوں یوں بھایا کہ جیوں پیاسے نے خشک جنگل میں آبِ حیات پایا ہور صورت پاکی خوش لقا وحدانیت کا عین بہ عین اس آئینہ مبارک میں سوانوکی دل بھی...... انکھیاں کو ظاہر باہر نظر آیا تو اس عاجز کوں بھوت منت سوں بولے کہ "گنج مخفی" کو دکھنی زبان کی کلام کی نسر (نثر) مدون بولوں۔ اس آئینہ جمال کا فارسی غلاف کھولوں۔ "

"گنج مخفی" کی تشریح پیر و مرید کے سوال و جواب کی صورت میں اس طرح کی ہے :

" پیر دستگیر کوں سوال پوچھے کہ ای قبلہ حاجات و کعبہ مراوات گنج مخفی کسے بولتے ہیں پیر جواب باصواب فرمائی کہ گنج مخفی برگزیدہ یزدانی وجود انسانی کوں بولتے ہیں۔

مزید سوال کیے کہ بعضے خلق اللہ بولتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ کو مکان نہیں ہور
بعضی بولتے ہیں کہ حق جل و علی مکان ہے ؛

کتاب کے اختتام پر مصنف نے کتاب کی تصنیف کا سال ۱۱۱۱ھ بتایا ہے۔ اور کتاب کے اختتام
پر خدا کی بارگاہ میں شکر ادا کیا ہے ؛

؛ لاکھ شکر بلک بیحد بے نہایت شکر۔ اس لطیف بے کیف کون جینتان میں
کا سید المہینا رمضان المبارک کے گیارھویں تاریخ ہور گیارھویں تاس ہور ایک
ہزار ایک سو گیارہ برس کی ہجرت نبوی ۱۱۱۱ھ میں دکھنی زبان سون پنجشنبہ
کے روز شروع ہور مرتب کیا یو کتاب ؛

حبیب اللہ قادری پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کے کتب خانہ کی ایک بیاض میں
حبیب اللہ قادری کے ایک رسالے ؛ تحفتہ المرسلہ ؛ کا ایک تفصیلی
نوٹ مجھے ملا ہے۔ یہ نوٹ ؛ تحفتہ المرسلہ ؛ کے مخطوطے مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ پر مبنی
ہے۔ رسالہ تصوف کے موضوع پر ہے۔ اس کے آغاز کی عبارت حسب ذیل ہے ؛

؛ ثنا بہوتہ ہور صفت بے گنت ثابت ہے پروردگار کے تین الیسا پروردگان
کے اپنے الہام ربانی سون روشنیاں ہو انوران کی باغستان کی ہور اللہ نزاں باطنی
رازاں کی اپنی عارفاں کی سران پر ہور ضیران پر کھولیا ؛

حالات زندگی حبیب اللہ قادری[1] کا سلسلہ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے
وہ شاہ مرتضیٰ قادری کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بارہ برس تک جنگل اور صحرا میں
ریاضت کرتے رہے پھر گلبرگہ میں قیام کیا۔ عالمگیر کے حملہ کے بعد جب مرہٹوں نے گلبرگہ پر یلغار کی تو
شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اس وقت شاہ حسین صاحب سجادہ درگاہ سید محمد حسینی نے ان کو کہلا
بھیجا کہ آپ کا مکان مستحکم اور محفوظ نہیں غنیم کی آمد ہے اگر آپ خانقاہ میں تشریف لے آئیں تو مناسب ہے

---

[1] تذکرہ اولیائے دکن صفحہ ۲۶۴

آپ نے فرمایا حضرت ذکریا نے درخت کی پناہ لی تھی ان کے سر پر آرے چلائے گئے میں حفظ الٰہی کے سوا کسی چیز کو پسند نہیں کرتا۔

مشہور ہے کہ جس وقت حملہ آور آئے وہ عبادت و ریاضت میں مشغول تھے۔ انھیں اس حال میں دیکھ کر حملہ آور واپس جانے لگے تو انھوں نے خود بلا کر مال و متاع ان کے حوالے کر دی۔ اس کے کچھ دن بعد وہ گلبرگہ سے حیدرآباد آگئے اور محلہ مستعد پورہ میں مقیم ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۱۴۲ھ میں ہوا۔

ان کے بیٹے ولی اللہ قادری بھی مشہور بزرگ گذرے ہیں جن کی تصنیف "معرفت السلوک" قدیم ادب کی ایک گراں بہا کتاب ہے۔ شاہ حبیب اللہ کے سترہ فرزند تھے جن میں شاہ ولی اللہ سب سے بڑے تھے اور وہی ان کے خلیفہ ہوئے۔

ولی اللہ قادری

حبیب اللہ قادری کے خلف اکبر تھے۔ "معرفت السلوک": انھوں نے اپنے والد کی فرمایش پر لکھی جیسا کہ خود کتاب کے متن میں لکھتے ہیں:-

"بولتا ہے کمترین مرید ہور واپس ترین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی بارگاہ ابالی عاجز فقیر الحقیر محمد ولی اللہ حکم کیے مجکون حضرت شاہباز ولایت معدن ہدایت آفتاب عالمتاب بزرگ اولیا کے برّی اتقیا کے ہور صدر نشین محمد مصطفیٰ کے صاحب شریعت ہور طریقت کے دریا حقیقت ہور معرفت کے وارث محمد رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری باقی رکھے۔ اللہ تعالیٰ انو کون"

یہ کتاب جیسا کہ اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے۔ انھوں نے والد کی زندگی میں ختم کی اور واجب الوجود، نفس امارہ، نفس لوامہ، توحید افعالی، توحید وجودی پر تفصیلی بحثیں لکھی ہیں۔

"معرفت السلوک" کے دو مخطوطے[1] کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے کے جو محرکات تھے اس کا ذکر بھی مصنف نے کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

---

[1] تصوف نمبر (۶۸۰)

:. کتیک ایسے طالبان حق کی ہیں جو نا عربی جانتے ہیں ہور نا فارسی پچھانتے ہین ولیکن اپنے مطلوب کی طلب میں سچے ہیں ہور ظاہری عالم کی نظر میں کم پڑین۔ ہور اپنے معشوق کے عشق مین جلتی ہیں۔ ہور اپنے محبوب کی بے نیازی دیکھو مہتاب کی ضرب کلتی ہیں۔ ہور حق کی باتاں کی پیاسے ہوکر حیران اور سرگردان (سرگردان) پھرتے ہیں۔ لیکن خضر کہاں ہیں جو اس مانی کی پانی کون ان سمجھی لفظاں کی ظلمات تے نیکال کر سمجھی زبان کی کونڈی میں بھرکر اس پیاسیان کی حلق کون ترکری ہور ابد کی زندگی بخشتے تا اوسے دعا خیر سون یاد کرین تو تجکون لازم ہے جو اس معانی کی عروس کون فارسی ہور عربی کی خلوت فانی کی باہیر کھار کو ہندی زبان کی تخت پر بیلا جو تا ہر عاشق اپنی معشوق کی جمال کا شراب اپنی انکھیان کی پیالیاں میں مالامال بھر کر اپنی جیو کی حلق کون پہونچاوی ہور ابد کا بے ہوش ہو جاوی۔ تو اس حکم کون غنیمت جان کر جیو سون قبول کیا میں ہور معانی کی محبوبان کی چہری تی حجاب ہور نقاب ان سبی لفظاں کا دور کیا میں ہور آیتہ ہور حدیث کی خوبان کی جمال کون ترجمہ کی زراین سون آراستہ کیا میں تا دلبر ہور دلدار ہر عاشق کا ہووے ہور نُورٌ عَلیٰ نُور نظر میں آوی :.

مصنف شاہ محمود، شاہ میران جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین کا مرید جن کے مرشد شاہ جمال الدین مغربی جمال الدین کے مرشد شاہ کمال الدین تھے۔ شاہ کمال الدین خواجہ صدرالدین ابوالفتح گیسو دراز کے مرید تھے۔

پانچ وجود یعنی واجب ممکن ممتنع عارف اور واحد کی تشریح کی ہے :

اس کے یو پانچ ابواب ہیں۔ پہلے باب میں واجب الوجود کی حقیقت سمجھائی ہے۔ دوسرے میں ممتنع الوجود۔ ممکن الوجود۔ چوتھے میں عارف الوجد۔ پانچویں میں واحد الوجود۔

۱۔ واجب الوجود۔ اس میں بتاتے ہیں کہ یہ وجود اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جو قایم ہے۔ ابدالابد

اپنی ذات سوں جو اسکوں انتقسیر اور تبدیل نہیں ہور فنا اس پر روا نہیں و
ہوالحی القیوم ہے یعنی ہمیشہ زندہ ہے ہور ہمیشہ قایم ہے۔ ہور وجود تمام
موجودات کا اس سوں قایم ہے۔

مصرع: مایا او قایم او قایم بخود

چونکہ شاہ برہان الدین نے انسان کا وجود واجب ملنا ہے یعنی بغیر اس کے
روح کا وجود نہیں۔ جیسا کہ حدیث میں خَلَقَ الاَرواحَ مِن قَبلِ الاَجسَادِ
.... یعنی پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے روحاں کو جسماں تے انکھیں پیدا کیں
لیکن وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ اس واسطے حضرت آدم علیہ السلام
کے جسم کوں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے بنا کیا ہور میثاق کی روح کوں اس میں آنا یا
تو جس وقت روح ہور جسم نے ملاپ پائی تو اسی دونوں وجوداں کی ملاپ تھی
ایسا ایک وجود حقیقی ظاہر ہوا جو انہی کے ذاتی ہور صفاتی تجلی کے قابل ہوا اس
وجود خاکی کی خاصیت میکائیل کی ہے یعنی فعل اور صفت میکائیل کی ہے۔
چونکہ فرشتہ میکائیل پانی پر موکل ہے ہور تمام عالم کو فیض بخشتا ہے یعنی اس پانی
تی کسی جن کی جھاڑاں زمین تے نکلتے ہیں۔ اسے روئیش بعض عناصر بھی بوجہ
پانی سے فیض لیتے ہیں۔ وَجَعَلنَا مِنَ المَاءِ کُلَّ شَیءٍ یعنی کہ ہمیں ہر
یک شی کو پانی تی جیوتا کیا واسطا کہ خاکی وجود پانی سوں خمیر کیا ہے تمثیل
اگر کوئی چاہے کا ماٹی تی کوزہ یا پیالہ کرے تو ہر گز نہ کر سکے گا۔ تب تلک کہ
پانی سوں ترکیب نہ دی جاوے۔ پچھیں پانی مرکبات میں دوسر عناصراں
پر فضیلت رکھتا ہے۔ اس کے بعد روح نامیہ اور قلب مضغہ کا بیان ہے۔
پھر نفس امارہ کی تشریح ہے۔ پھر تجرید اور تفرید کا بیان ہے۔ تجرید یعنی جس
وقت مومن اللہ تعالیٰ کوں اپنی پر تحقیق کیا تو سودہ بچتا ہے جو قدیم حادث تے
جو ہی صفتاں ہیں مجرد ہو دی ہور اپنی منہ پھراوے تفریدہ ہے۔ سب تعلقاں

کو چھوڑ کر سکیلا ہو۔ پھر ذکر جلی اور عارف کا بیان ہے۔ اس کے بموجب خراوشی
عاشق کا لازمہ ہے۔ منزل ناسوت یعنی ذکر جلی کی بعد از حاصل ہوتی ہے۔ اس
روش سوں کہ سالک جس وقت ذکر جلی میں اللہ کی اسم سوں رہتا ذوق لیتا ہے
ہور لذت پاتا ہے۔

ممکن الوجود: اس کی تعریف مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے :

ممکن الوجود اسکوں بولتی ہیں جو اپنی سوں اپیں قایم نچھے کدہیں ہے ہور کدہیں ہیں
حق سبحانہ کی امر میں ہور او سو تمام عالم کا وجود ہے جسم تی روح تک ہور عرش سے
فرش تک ہور اس ممکن الوجود کا قایم ہونا حق سبحانہ کی ذات سوں ہے۔ ہور حق تعالیٰ
اپنی واجب الوجود سوں اپنی ذات سوں اپے قایم ہے نہ اس کی ذات کغیر ہور
تبدیل ہے۔ ہور نہ اس کی صفتاں میں پس اے یار حضرت پیر اپنی قرار داد میں
روحانی وجہ کا ناوں ممکن الوجود رکھے ہیں۔ اس کا موکل اسرافیل ہے۔ یعنی مہتر
اسرافیل باری کا ہے جو باریکوں چلاتا ہے۔ اسی روش ممکن الوجود کو بھی یو نپچہ یک
خاصیت ہور یک صفت ہے۔ جو اس وجود کو باری کی طرف چلاتی ہیں۔ ہور یو
وجود ایسا سیر رکھتا ہے جو یک لحظہ میں شرق تے مغرب تلک باری تے بھی زیادہ
سیر کرتا ہے۔ ہور عرش سے فرش تلک اترتا ہے۔ ہور یو سیر اس وقت حاصل ہوا جو
آدم علیہ السلام کی جسم میں روح کوں بھیجتے۔ اس کے بعد روح متحرکہ قلب مجیب
نفس لوامہ فہم وہم کا ذکر ہے۔ اس میں بھی تجرید و تفرید ہے۔ ذکر جلی کے بجائے
ذکر قلبی اور مراقبہ ہے۔ اور منزل ملکوت ہے۔

اس کے بعد صوفیا کے مختلف اشغال کا ذکر کرتے ہیں :

ممکن الوجود کا شغل یہ ہے : ق ۔ ف ۔ غین ۔ عین ۔ ظ ۔ ط ۔ ض

(ق ۔ ف ۔ غ ۔ ع ۔ ظ ۔ ط ۔ ض)

پہلا شغل ق حرف سے کلام میں قدسی کلامنا یا اللہ یعنی اے بار خدایا پاک ہماری کلام کون

تیری حمد میں یعنی اس زبان سے دوسری زبان بخش تا لایق تیری کلام کے ہووے۔
ف۔ ف۔ کے حرف سون دماغ میں ختم فرحنا ری انک یعنی یا اللہ ای بار خدایا راحتمند
کرہمنا تیری رحمت کے خوشبوی سون۔ تا مرحوم اپچھین ہمیں تیری رحمت سون۔
غ۔ کے حرف سون بصر میں غلمتنا علی لقا یك یا اللہ یعنی اے بار خدایا
ہماری انکھیان کو غنیمت اپنی دیدار کا بخش تا تیری دیدار کے لایق اچھوں میں۔
ع۔ کے حرف سون سمع میں علمنا القرآن فی سمعنا یا اللہ۔ یعنی اے بار
خدایا۔ قرآن جو کلام اللہ ہے اس کو ہمارے کان میں تعلیم کرتا تیری معرفت حاصل
ہووی۔
ظ۔ کے حرف سون عقل میں ظرانا بجوھرك یا اللہ یعنی اے بار خدایا روشن کر
ہماری عقل کون تیری جوہر سون۔
ط۔ کے حرف سون طبنا شمامتك یا اللہ۔ یعنے اے بار خدایا خوشی ہور
خواف ہور ذوق تمام بخش تیری خوشبوی سون۔
ض۔ کے حرف سون ضیا میں ضونا بضو یك یا اللہ۔ یعنی اے بار خدایا
روشن کر ہماری وجود کو اپنی ذاتی نور سون۔

ممتنع الوجود : سو یوں ہے کہ ازل لا ازال میں حق تعالیٰ کی ذات بغیر کسی شئے کون وجود نہ تھا یعنی خدائے تعالیٰ کی ذات تھی۔ ہور یوں اس کا موکل عزرائیل ہے۔ یعنی اس کی خاصیت عزرائیل کی ہے۔ جو قبض روحان کون کرتا ہے پچھین اسے۔ بخش سالک تمام خطریاں کون قبض کرلی ہور اپنی میں برقرار رہے۔ عزرائیل کے مانند جو تمام روحان کون قبض کرتا ہے۔ حیوانی ہور جنی ہور انسانی ہور ملکوتی تا جبرئیل ہور میکائیل ہور اسرافیل کے روح کون بھی یو بچہ قبض کرے گا۔

عارف الوجود : اسے بولتے ہیں کہ دانا اپچھے وجود پر یعنی ایسی ہستی ہے جو اپنی دانائی ہے۔ ہور یو ہستی ذاتی ہور منزہ ہے۔ سب ہستیاں سے ہور اپنی ہستی سون قیام رکھتا ہے۔

واحد الوجود : حق سبحانہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ ہور یہ دایرہ مرکز ہور محیط سب دائریاں کا ہے۔
ہور رجوع ہونا سب دایریاں کا اسی طرف ہے۔ کیا واسطا کہ واجب الوجود
ممکن الوجود سوں قایم ہے۔

مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں میں سے آخری دور کے سب سے اہم مصنف سید شاہ میر ہیں۔ جن کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کے اوایل کا زمانہ ہے۔ تاہم موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ان کے کارنامے مذہبی تصنیفات کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سید شاہ میر کی زندگی کے حالات پر ایک تفصیلی مضمون مولوی سخاوت مرزا صاحب نے نوائے ادب[1] بمبئی میں شائع کیا ہے۔ میری معلومات کا ماخذ یہی مضمون ہے۔

شاہ میر رانچوٹی ۱۰۸۱ھ تا ۱۱۸۷ھ

سید شاہ میر اپنی جائے ولادت کے تعلق سے "شاہ میر رائے چوٹی" مشہور ہیں۔ یہ ۱۰۸۱ھ میں رانچوٹی میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ذیل کے قطعہ سے ظاہر ہے :

صاحب کمال حضرت شہ میر قطب الدین
مخدوم رہ نمائے و سر تاج عارفین
آمد ندا از غیب بتاریخ شانِ عجب
سلطانِ اصفیا و شہنشاہ واصلین (۱۰۸۲ھ)

ان کا نام سید محمد حسینی اور لقب شاہ میر تھا۔ والد کا نام شاہ جمال الدین تھا جو حضرت مخدوم جہانیانِ جہان گشت کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے آبا و اجداد سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں ملتان سے گجرات اور گجرات سے بیجاپور آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ سلطنت عادل شاہیہ بیجاپور کے خاتمہ کے بعد شاہ میر کے جد امجد شاہ کمال الدین نے بیجاپور کی اقامت ترک کردی اور شاہ نور میں رہنے لگے۔ شاہ میر کے والد شاہ جمال الدین شاہ نور سے رانچوٹی

---

[1] : نوائے ادب، بمبئی، جلد ۴، شمارہ ۳ (جولائی ۱۹۵۳ء)

اگر آباد ہوگیے اور وہیں اپنی بقیہ زندگی گزاری ان کا انتقال ۱۱۸۰ھ میں ہوا۔ ان کے سنہ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ تذکرہ اولیائے دکن میں ان کی عمر ۱۰۵ اور سنہ وفات ۱۱۸۷ھ درج ہے لیکن مطبوعہ انتباہ الطالبین کے خاتمہ پر یہ قطعہ وفات لکھا ہے۔

معدنِ توحید کانِ معرفت
حضرت شاہ میر پیر نیک خو
بہر تاریخ اش ندا آمد زغیب
ہست جنّت بالیقین ماوِ رائے

(جس سے ۱۱۸۷ھ برآمد ہوتا ہے)

شاہ میر نے اپنے والد ماجد کے سایہ عاطفت میں تعلیم پائی۔ انھیں علم حدیث۔ فقہ۔ تفسیر منطق اور فلسفہ پر کافی عبور تھا۔ اس دور کے لکھنے والے بزرگوں میں سید شاہ میر کی اوّلیت یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی حقایق کو فلسفیانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ سخاوت مرزا نے تمکین کاظمی صاحب کے ایک بیان کی کہ اُردو میں فلسفہ اور نفسیات پر سب سے پہلے مرزا رسوا اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے کتابیں لکھیں تردید کی ہے۔ کیونکہ شاہ میر نے اس سے بہت پہلے ان موضوعات پر لکھنا شروع کیا تھا۔ شاہ میر نے جس طرح فلسفیانہ اور منطقی بنیادوں پر وجود ذات باری تعالیٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس دور کے ادب میں اولیات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ منطق اور فلسفے کی کئی اصطلاحوں کے ترجمے بھی انھوں نے کیے ہیں۔ اُردو زبان کو جو ابھی اپنے نشو و نما کے ابتدائی مرحلے میں تھی ایسے مضامین کے لیے استعمال کرنا شاہ میر کا بڑا قابل قدر کارنامہ ہے۔ شاہ میر نے بھی شاہ میران اور شاہ بُرہان کی طرح نہ صرف زبان اور قلم سے اُردو زبان کی خدمت کی بلکہ اپنے پیچھے اُردو لکھنے والوں کا ایک بڑا گروہ چھوڑ گیے۔ دسویں صدی کے اواخر اور گیارھویں صدی کے اوائل میں شاہ میر اور ان کے تلامذہ نے سلسلہ تصانیف کو جاری رکھا۔

لے : انتباہ الطالبین :

ان کی تصانیف مندرجہ ذیل مشہور ہیں :

۱۔ اسرار توحید ۲۔ انتباہ الطالبین ۳۔ رسالہ عینیت وغیریت

۴۔ رسائل قادریہ ۵۔ عقاید صوفیہ ۶۔ دیوان میر

اسرار التوحید | اس دور کے لکھنے والوں میں اس کتاب کا ذکر اردوے قدیم میں حکیم شمس اللہ قادری نے سرسری طور پر کیا ہے اور صرف یہ لکھا ہے کہ سید شاہ میر نے بھی ایک رسالہ مسایل توحید کے موضوع پر لکھا تھا[1]۔ اس کا مخطوطہ یہاں کتب خانہ آصفیہ میں دستیاب ہوا ہے۔ اس رسالہ میں خدا کی ذات و صفات پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے اور رسول اللہ کی ذات کو وجہ تخلیف کائنات ثابت کیا ہے۔ آخر میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے کسی مرشد کامل سے فیض حاصل کرنا ضروری ہے۔ مخاطب کو شاہ میر کا اندازِ تخاطب بھی اچھے بزرگوں کا سا ہے چنانچہ وہ پڑھنے والے کو: اے عزیز: سے مخاطب کرتے ہیں۔ شاہ میر نے بعض موقعوں پر شاہ برہان الدین کے اشعار کو بہ طور تائید استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں حاشیہ پر بھی شاہ برہان الدین کے حسب ذیل دس شعر نقل کیے ہیں جس کی سرخی یہ ہے:

: من کلام حضرت شاہ برہان صاحب قدس اللہ سرہٗ :

اس کے ابتدائی چند شعر حسب ذیل ہیں :

دیکھ وجود کے بر تن	او مر کر چھوڑے تن
سب کاموں ہووے اُداس	تب دسے پنچ پلاس
جی باندے پنچ حوس	تو ہووے وہی نفس

وجود کے اوضاع سے متعلق جو بحث کی ہے اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :

: اے عزیز وجود دو صنع کا ہے ایک واجب الوجود دوسرا ممکن الوجود واجب الوجود اسے بولتے ہیں جو خود بخود آپ سوں آپ قایم ہے۔ ہمیشہ تھا ہور ہمیشہ رہے گا۔

---

[1] فہرست اُردو مخطوطات از حامد اللہ ندوی مطبوعہ رسالہ : نوائے ادب :

ہور وہ وجود حق تعالی کا ہے یعنی خدا کی ذات ہور صفات کو واجب الوجود
کہتے ہیں۔ ہور وہ قدیم ہے ہور غیر مخلوق ہور باقی ہے۔ ہور دایم ہے ممکن الوجود
دو بھانت ہے۔ ایک جوہر دوسرا عرض جوہر قایم بنفس خود کوں کہتے ہیں ہور
عرض قایم بالغیر کوں کہتے ہیں۔ ہور جوہر پانچ وضع کا ہے اول عقل دوسرا
نفس تیسرا جسم چوتھا ہیولا پانچواں صورت عقل مجرد تنہا مادے سے اپنی ذات
میں اور فعل میں لیکن نفس واسطے کہ محتاج ہے تصرف و تدبیر کے بیچ مادے کا اور
ہیولا جاگا ہے جسم کی صورت کا اور جسم مرکب ہے۔ ہیولا اور صورت سے
ہور صورت ایک جوہر ہے۔ اترنے والا ہیولا میں عرض نو قسم کا ہے۔ اول کم
یعنی گی جو دکھنی کتا پنا بولتے ہیں اور کم دو وضع کا ہے متصل ہور منفصل متصل
وہ ہے۔ درمیانے اس کے اجزاء کے حد مشترک ہے۔ مشترک اسے بولتے
ہیں جو نہایت اول جزو کا اور بدایت دوسرے جز کا ہے۔ جیسا کہ خط میں لکیر اور
منفصل وہ ہے کہ اس کے اجزا میں حد مشترک اچھے جیسا کہ عدد یعنی گنت دوسرا
کیف یعنی چگونگی جو دکھنی میں کیا پنا بولتے ہیں۔ کیف چار وضع کا ہوتا ہے۔
اول کیف جسمانی اوسے بولتے ہیں جو ظاہر کے حواس ہیں اوے جیسا کہ باس ہور
لذت دوسرا کیف نفسانی جو حیوان اور جاندار کو ہوتا ہے جیسا کہ علم اور حیات۔
تیسرا کیف مخصوص عجل جیسا کہ ڈول ہور رنگ چوتھا کیف استعدادی جو شے
اس سے کمال اپنا حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ تلوار کی تیزی یعنی کاٹ۔ تیسرا اضافت
ہے جو ایک شے کو دوسری شے سے نسبت حاصل کرنے میں دونوں شے کو حاصل
ہوتا ہے۔ جیسا کہ پدری اور پسری یعنی باپ پنا ہور بیٹا پنا۔ چوتھا این وہ
ہے جو شے مکان حاصل کرتے ہیں حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب کے نین
مشرف حاصل ہوتا ہے۔ حمل کے برج میں اترنے سوں اور بعض کہتے ہیں جو
این مکان میں داخل ہوتا ہے۔ پانچواں متی وہ ہے جو شے وقت تے آتے سو

شئے کے تین حاصل ہوتا ہے جیسا کہ چاند کو گرہن اس کے ہور سور کے درمیان زمین
آڑے ہوتے وقت حاصل ہوتا ہے۔

یہ کتاب: اسرار التوحید: ۱۳۳۱ھ میں مطبع عزیز حیدرآباد طبع ہو چکی ہے۔

انتباہ الطالبین یہ شاہ میر کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل بحثیں شامل ہیں۔ پہلے تمہید ہے جو گویا بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر ہے۔ اس کے بعد اصل متن شروع ہوتا ہے۔

مباحث کے عنوان حسب ذیل ہیں:

۱۔	ذکر پیری و مریدی	۸۔	ذکر سلوک
۲۔	ذکر چہار پیر و چہار خانوادہ	۹۔	ذکر توبہ و اقسام آن
۳۔	ذکر معرفت عقلی	۱۰۔	ذکر توکّل و انواع آن
۴۔	ذکر معرفت علمی	۱۱۔	ذکر قناعت و اقسام آن
۵۔	ذکر معرفت کشفی	۱۲۔	ذکر حقیقت
۶۔	مقولہ علما ظاہر	۱۳۔	ذکر خلوت
۷۔	مقولہ فقرا باطن		اسی طرح ۴۴ ابواب ہو سکتے ہیں۔

ذیل کے اقتباس میں باری تعالیٰ کے ناموں کے ہر نام سے اس کے موسوم ہونے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بنام آن کہ او نامی نہ دارد
بہر نامے کہ خوانی سر برآرد

جس نام سوں تو اسے بلاوے گا سر اٹھاوے گا یعنی جواب دیوے گا
ہور حاضر ہوئے گا اے طالب مصداق بی وجود ہے۔ اسے ایک نام نین بلکہ
اسکے نام بیحد ہور بے عدد ہیں ہور عدم کو سوائے ایک نام کے دوسرا نام نین اس
سبب سوں کہ اسم بے مسمیٰ ہے۔ یعنی لاشئے ہور وجود شئے ہے ایسا کہ بہوت

کمالات رکھتا ہے ہر ایک کمال کے سبب سوں اسے ایک نام علٰحدہ رکھتے ہیں۔
اہلِ توحید کی اصطلاح میں وجود ہست کون بولتے ہین۔ ہور ہست حقیقی حق تعالےٰ
ہے کہ اول بے ہے ہور آخر بے ہے ہور درمیانی بے ہے یعنی نین تھے تب بھی
تھا، ہور ہمین نا ہوینگے تب بے رہے گا۔[1]

اس رسالہ میں مزید حسب ذیل بحثیں شامل ہیں۔ :

۱۔ ممکن کو نہ ذات نہ صفات نہ افعال نہ انا

۲۔ دلایل اختراض بیعت طریقت

۳۔ قال صحیح

۴۔ سلوک حقیقی وہ ہیں جو عموماً مروج ہے۔

۵۔ مقامات عشرہ سلوک بشرح معانی حسب شریعت۔ حقیقت

۶۔ حق اور عالم میں عینیت حقیقی اصطلاحی اور غیریت حقیقی اصطلاحی مطابق شرع شریف

۷۔ توحید تعطیل اور تشریک کے مسایل

نو بطون

یہ رسالہ بھی شاہ میر سے منسوب کیا جاتا ہے[2] اس ایک مخطوطہ کتب خانہ جامعہ مسجد بمبئی اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ یہ دراصل ایک فارسی رسالے : نہ بطون : (مصنفہ سید اسد اللہ) کا ترجمہ ہے[3]۔

اس میں تصوف کے بعض اسرار اور رموز کی تشریح کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ان نو بطون سے کائنات کا ظہور ہوتا ہے۔ رسالہ کی ابتدا سے پہلے نو بطون کی تفصیل۔

---

[1] مطبع عزیزی حیدرآباد

[2] جامعہ بمبئی کے اردو مخطوطات

[3] حامد اللہ ندوی " نوائے ادب بمبئی "۔

ہستی مفصل	ہستی مجمل	ہستی مطلق
۱۔ روح جاری	۱۔ روح مقیم	۱۔ امین دیکھ
۲۔ من نور	۲۔ انا نور	۲۔ امین شاہد
۳۔ واجب الوجود	۳۔ ممکن الوجود	۳۔ امین نور

رسالہ کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے :

"ظاہر کا دیکھ روح جاری اس پر کی شاہدی من نور۔ ظاہر کا وجود واجب یہ تینوں مل کر بندہ ہوا اور باطن کا وجود ممکن اس کا دیکھ روح مقیم اس پر کی شاہدی انا نور یہ تینوں مل کر محمد ہوا ذات کا دیکھ امین دیکھ ذات کا شاہد امین شاہد اور ذات کا وجود امین نور یہ تینوں مل کر خدا ایسچہ نو مرتبہ (نو بطون) بولتے ہیں۔"

رسالہ قادریہ : رسالہ قادریہ بھی شاہ میر کی تصنیف بتائی گئی ہے لیکن کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کی : فہرست اُردو مخطوطات : میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری اپنے شبہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"عبارت سے صرف اس قدر پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رسالہ سید محمد شاہ میر کے ارشادات سے ہے۔ چونکہ بعض رسالے اس قسم کے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں مرشدین کے اقوال و ارشادات کو مریدین نے اپنے طور پر ترتیب دیا ہے۔ اس لیے یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رسالہ خود حضرت سید محمد شاہ میر کا مرتبہ ہے یا ان کے مریدین میں سے کسی ایک کا۔"[1]

لیکن پروفیسر سروری صاحب کا مذکورہ بالا شبہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ شاہ میر کی دیگر تصانیف اور رسالے کی زبان میں کوئی فرق نہیں اور انداز بیان بھی یکساں ہے۔ ان اندرونی

---

[1] فہرست اُردو مخطوطات، جامعہ عثمانیہ صفحہ ۷۹

شواہد کی بنا پر مجھے خیال ہے کہ یہ رسالہ شاہ میر ہی کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے اس کے سرورق پر درج ہے :

: یہ رسالہ قادریہ حضرت دادا مرشد سید محمد شاہ میر قدس سرہٗ بیان میں تنزلات کے جو موافق بعض اصطلاح قادریہ فرماتے ہیں :

اس بیان کی موجودگی میں شبہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ رسالہ یوں شروع ہوتا ہے :

: ثنا اور شکر سزاوار اس خدا کو جو انسان کو اپنی ذات وصفات کی معرفت سے مشرف کیا اور اپنی توحید اور یگانگی کی خلعت عطا کیا :

اصل بحث کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

: اول فرض بندہ مکلف پر ایمان ہے اور ایمان کلمہ سے حاصل ہوتا ہے یعنی کلمہ میں بیان خدا کا وحدانیت کا اور محمد رسول اللہ کی رسالت کا ہے :

: رسالہ قادریہ : کے ساتھ مزید تین رسالے منسلک ہیں[1] جن کا ذکر پروفیسر سروری صاحب نے فہرست : اُردو مخطوطات : جامعہ عثمانیہ میں کر دیا ہے۔

مدح میراں یہ منظوم رسالہ ہے جس میں شاہ میر نے شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح لکھی ہے مقطع میں شاعر نے صاف طور پر اپنا نام شاہ میر لکھا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کے وزیر اور محمد قلی قطب شاہ کے خسر کا نام بھی شاہ میر تھا۔ اسی بناء پر پہلے ڈاکٹر زور کو یہ شبہ ہوا تھا کہ یہ آخر الذکر کی تصنیف ہوگی لیکن بعد میں انھوں نے اس کی تردید کر دی[2]۔

دیوان میر شاہ میر غزل بھی خوب لکھتے تھے چنانچہ ان کی غزلوں کا ایک دیوان مرتب کیا گیا ہے۔ کلام زیادہ تر متصوفانہ ہے۔ لیکن عاشقانہ رنگ کے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ شاہ میر کے بھائی شاہ کمال تھے جو ان کے خلیفہ بھی تھے۔ شاہ کمال بھی صاحب دیوان

---

[1] فہرست اُردو مخطوطات، جامعہ عثمانیہ صفحہ ۸۰
[2] " " " ادارۂ ادبیات اُردو صفحہ ۱۵۱

شاعر ہوئے ہیں جن کا دیوان : گنج عرفان[1] : کے نام سے طبع ہو چکا ہے ۔

شاہ اعظم شاہ میر کے صاحبزادے سید محی الدین کے مرید شاہ اعظم بھی ایک کتاب : تلاوۃ الوجود : کے مصنف ہیں جس کا ایک مخطوطہ عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے ۔ یہ رسالہ : انتباہ الطالبین : کے ساتھ ایک ہی جلد میں منسلک ہے[2] ۔

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ کئی ایسی کتابیں بھی ملتی ہیں جن کے مصنفین کا سراغ نہیں مل سکا ۔ یہ تمام تصانیف مذہبی ہیں ۔ ان میں مذہب کی ہر صنف جیسے حدیث ۔ فقہ ۔ تفسیر اور تصوف وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں ۔ ذیل میں ان کتابوں کی تفصیل درج کی جا رہی ہے :

مفتاح الخیرات ۔ مجموعہ المسایل ۔ ترجمہ چہل حدیث ۔ عرفان العشاق ۔
رسالہ اخلاق ۔ ہدایت المومنین ۔ گوشہ عافیت ۔ تفسیر اذاجاء ۔ سوال
جواب موسیٰ ۔ ایلین نامہ ۔ رسالہ شریعت ۔ فقہ ۔ ہزار مسلۂ ۔ وصایائے نبی
آمدنامہ ۔ وحدالوجود ۔ پنج تن ۔ حجۃ الاسلام ۔ مشکواۃ وغیرہ ۔

ان میں بعض کافی اہم ہیں جیسے عوارف المعارف ۔

عوارف المعارف : عوارف المعارف : مصنفہ شہاب الدین سہروردی فارسی زبان میں تصوف پر بے مثل کتاب ہے ۔ : عوارف المعارف : کے ترجمہ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب بندہ نواز کی تصنیف : آداب المریدین : کی طرح صوفیوں کی خصلتوں اور اخلاق کے بیان میں ہے مثلاً غم و مسرت میں نفس کو قابو میں رکھنا ۔ خوش اخلاقی ۔ شرم و حیا وغیرہ صفات پر زور دیا گیا ہے ۔ اس کا نمونہ درج ذیل ہے :

: صوفی لوگ اللہ کے پیغامبر صلے اللہ وسلم کی راہ پر چلتے ہیں سب لوگوں

---

[1] : گنج عرفان : نامی شاہ میراں جی کی ایک مثنوی بھی چھپی ہے ۔
[2] : نوائے ادب : بمبئی اپریل ۱۹۵۳ء ؛
: مضمون سید محمد حسینی الملقب بہ شاہ میر رائے چوٹی : نوشتہ محمد سخاوت مرزا

سے زیادہ حصہ پانے والے ہیں اور سب سے بڑھ کر اس بات کے لائق ہیں
کہ آپ کے طریق زندہ کریں اور اللہ کے پیغامبر صلی اللہ کے خصلتوں
موافق پکڑنا اچھی طرح آپ کی راہ پر چلتے ہیں۔ اور آپ کے طریق کو زندہ
کرنے میں داخل ہے۔ جیسا کہ ہم کو خبر دیئے اُستاد عالم ضیاء الدین مسلمانوں
کے استاد ابو احمد عبدالوہاب نے بو علی کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو
خبر دیئے ابو الفتح عبدالملک نے جو ابو القاسم کے بیٹے ہیں کہا کہ ہم کو خبر
دیئے ابو نصر عبدالعزیز تریاقی نے جو محمد کے بیٹے ہیں ہم کو خبر دیئے ابو محمد
عبدالجبار نے۔ محمد کے بیٹے کہا کہ ہم کو خبر دیئے ابو العباس محمد نے جو احمد
کے بیٹے۔ کہا کہ ہم کو خبر دیئے ابو عیسی محمد نے جو ترمذ کے رہنے والے بیٹے عیسی
کے وہ بیٹے سورہ کے کہا کہ ہم سے کہا مسلم انصاری نے جو قایم کے بیٹے بصرہ
کے رہنے والے۔ کہا کہ ہم سے بیان کیا محمد انصاری نے جو عبداللہ کے بیٹے
وہ روایت کرتے ہیں۔ اپنے باپ سے وہ علی سے جو زید کے بیٹے و سعید سے
.... انھوں نے کہا کہ انس نے مالک کے بیٹے ان ہیں۔ اللہ
ان سے راضی ہو کہ مجھ سے فرمایا اللہ کے پیغامبر نے اے میرے بیٹے اگر
تجھ سے ہو سکے تو صبح کرے۔ اور شام کرے۔ اس حالت میں کہ تیرے
دل میں کسی کا کینہ نہ ہو تو یہ بات کر کے فرمایا اے میری بیٹو اور میرے یہ
طریق میں سے ہے جس نے میرے طریق کو زندہ کیا تو اس نے مجھ کو زندہ
کیا۔ وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔ یعنی پھر صوفیوں نے زندہ کیا۔
طریق اللہ کے پیغمبر کا۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے شروع میں آپ کی فرمائی ہوئی
باتوں پر قایم رہے اور اپنی حالت کے بیچ میں آپ کے کاموں کی پیروی
کیے تو اس سے ان کو پھل یہ ملا کہ وہ اپنی آخر کی حالتوں میں آپکی خصلتوں
پر ثابت ہو گیے۔ او خصلتوں میں درست کرنا نہیں ہو سکتا۔ مگر نفس کے

پاک کرنے کے بعد اور پاک کرنے کا طریق یہ ہے کہ شریعت کے بندوبست کی تابعداری کرے اللہ نے اپنی نبی سے فرمایا کہ بیشک تو بڑے خلق پر ہے جبکہ آپ سب سے بڑھ کر عمدہ اور سب سے بڑھ کر نفس میں پاک تھے تو سب سے بڑھ کر خصلت میں اچھے تھے۔ حضرت عائشہ سے پوچھے کیا اس کی پیغامبر کے خصلت کا احوال۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ کی خصلت قرآن ہے۔ قتادہ نے فرمایا وہ باتیں ہیں جو آپ عمل کرتے تھے اللہ کے حکموں پر اور باز رہتے تھے ان چیزوں سے جن سے اللہ نے منع فرمایا :

اس کتاب کے چالیس باب ہیں۔ چند اہم ابواب کے اقتباس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

۱۔ تیسواں باب : جدا جدا بیان میں صوفیوں کی خصلتوں میں جیسے صوفیوں کی بہت اچھی خصلتوں میں سے عاجزی ہے اور نہیں پہنتا ہے بندہ کوئی لباس بہتر عاجزی سے اور جس شخص کو مل گیا خزانہ عاجزی کا اور حکمت کا وہ قایم رکھتا ہے اسی نفس کو نزدیک ہدایت ؂

ایک اور اہم باب کا اقتباس درج ذیل ہے :

۲۔ : اکتیسواں باب : الباب المادی وثلاثون۔ روایت کیا گیا رسول اللہ سے کہ اپنی فرمایا ادب سکھلایا مجھ کو رب میرے نے پس خوب طرح ادب سکھایا مجھ کو۔ پس ادب صاف کرتا ہے ظاہر و باطن کا۔ پس جس وقت ظاہر صاف ہو ظاہر بندہ اور باطن اس کا ہو گیا صوفی ادب والا ؂ [1]

تبصرہ اس دور کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مذہبی ہے۔ کیونکہ اس کے لکھنے والے سنّت اور صوفیا تھے۔ اور ان کی مخاطبت عوام سے تھی۔ اسی لیے مذہبی تحریریں بھی عوامی زبان ہی میں لکھی گئیں۔ گو اس وقت نظم و نسق اور درباروں کی زبان فارسی

---

[1] شرح عوارف المعارف : مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ تصوف صفحہ ۶۴۰

تھی۔ لیکن عوام اُردو بولتے تھے جو : ہندوستانی : یا ہندوی : یا : دکھنی : کے نام سے موسوم تھی اور یہ زبان قریب قریب تمام ملک میں رائج تھی چنانچہ اس دور میں گجرات کے مصنفین کے کارنامے بھی ملتے ہیں اور پنجاب و دکن کے مصنفین کے بھی وہیں کچھ کارنامے بنگال کے بھی ہیں۔ مذہبی دور کے تقریباً ساری تصانیف فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اُردو کے علاوہ اودھی اور برج بھاشا بھی فارسی رسم الخط ہی میں لکھی گئی۔ اسی طرح دیوناگری رسم الخط میں خالص اُردو یا : کھڑی بولی : میں لکھی ہوئی تصانیف بھی ملتی ہیں۔ اس خصوص میں ملک محمد جائسی کی تصنیف : پدماوت : کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جائسی نے اودھی اور راجستانی بولی کو فارسی رسم الخط میں لکھا ہے۔ اسی طرح اُردو یا : کھڑی بولی : کے ادیب اور شاعروں نے اس کے لیے دیوناگری رسم الخط بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ کبیرؔ اور نانک کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ رسم الخط کے بارے میں اس آزادی کے باوجود اس دور کے ادب کی سب سے خاص بات یہی ہے کہ چاہے وہ کبیرؔ کے دوہے ہوں یا میراںؔ جی اور یحییٰ منیری کے کہ مندرے ان سب پر مذہب کی چھاپ ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے لکھنے والوں نے محض طریقت یا حرف شریعت کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ یعنے مذہب کے صرف نظری یا صرف عملی پہلو ہی کو نہیں لیا بلکہ نقلی اور عقلی دونوں طرح کے علوم میں اپنے کارنامے چھوڑے ہیں۔ چنانچہ جہاں ما بعد ما بعد الطبیعاتی مسایل پر تصنیفات ملتی ہیں وہیں وضو کے طریقے نماز کے مسایل۔ میراث اور شوہر اور بیوی کے حقوق وغیرہ جیسے مسایل پر بھی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں مصنفین نے جہاں اونچے دھنی طبقے کے لوگوں کے لیے مذہب کے دقیق مسایل بیان کیے ہیں وہیں ان پڑھ عورتوں کے لیے : چکی نامہ : وغیرہ کے روپ میں مذہبی احکام سمجھانے اور سکھلانے کی کوشش بھی کی ہے

اس دور کی تصانیف کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بعض مصنفین نے مذہب کے خشک مسئلوں اور ٹھوس اصولوں کو بھی ادبی رنگینیاں عطا کر کے شگفتہ اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس خصوص میں میراںؔ جی شمس العشاق کی نظم : خوش نامہ : اور شاہ برہان کی تصنیف

: وجودیہ : کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جن میں طرح طرح کی خیال انگیز تشبیہوں اور چست استعاروں سے خدا اور بندے کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے اور ان سے صرف تفہیم کا کام نہیں لیا گیا بلکہ قاری کا انہماک اور دلچسپی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور یہی چیز ! ادب : کے ارتقاء میں پہلے قدم کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لیے اس دور کے ادب کی اہمیت گھٹائی نہیں جاسکتی۔

چوتھی خصوصیت جو اس دور کی اکثر تصانیف میں نظر آتی ہے وہ ہے ہندوستانی ماحول اس دور کے ادیبوں اور شاعروں نے جذبات کی عکاسی میں ہندوستانی مزاج اور ماحول کا خیال رکھنے کی خاص کوشش کی ہے چنانچہ اکثر تشبیہیں اور استعارے ہندوستانی سماجی زندگی ہی سے لیے گئے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مقامی رنگ پیدا کیا جاسکے۔ مثلاً شاہ برہان نے اس شعر میں :

تماری بانس نت جو بانسری ہے ؛ ہماری بانسری یہ سانسری ہے

نہ صرف ہندوستان کے دیہی سماج سے استعارہ لیا ہے۔ بلکہ اسی استعارے کی مدد سے ہندوستان کی قدیم ترین تہذیبی روایات کو بھی اپنا لیا ہے۔ اسی طرح : چکی نامہ : وغیرہ کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں۔

اسی دور کی تصانیف کی پانچویں اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان تصانیف نے ہندوستانی عوام کی ذہنی اور باطنی اصلاح میں بہت بڑا حصہ لیا۔ اور ایک طرح سے ارسطو کے کتھارسس (Cathareis) یعنے تزکیہ نفس کا کام کیا۔ سعدی کی گلستان کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ سعدی نے اخلاق کی اچھائیوں کی تلقین کی تھی۔ اس دور کے مصنفین نے بھی بیش بہا اخلاقی درس دیئے اور انسان کو انسانیت کا پیغام دیا۔ مل جل کر رہنے کی تلقین کی۔ عربی۔ فارسی اور سنسکرت کے علاوہ ہندوستان کی دوسری بولیوں کے ادب سے بھی ان ساری روایات کو لیا جو ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوسکتی تھیں۔ انھوں نے انسان کو اعلیٰ اقدار کی طرف مایل کرنے کی کوشش کی۔ یعنی مادیت کی بجائے اعلیٰ روحانیت کا سبق پڑھایا۔

اس کے باوجود یہ سبق اس ایرانی تصوف کی طرح کی افیون نہ تھی جس نے بقول علامہ اقبال ایرانی قوم کی قوت عمل مفلوج کردی تھی۔ ان کے ہندوستانی ادب نے عوام میں نئی امنگیں اور نئے

اثرات پیدا کیے اور ایک نئے معاشرے کو جنم دیا جس میں ہندوستانی مزاج کے ساتھ عرب۔ ایران ترکستان اور افغانستان کے عناصر بھی گھل مل کر ایک وحدت بنانے لگے تھے۔

اس نوخیز زبان میں جو "ہندی" :۔ "ہندوی" "یا" "دکھنی" کہلاتی تھی۔ ہندو مسلم دونوں مزاجوں کی خصوصیات جذب ہو رہی تھیں۔ مثلاً

۱۔ جہاں اس میں رومی اور غزالی کا "حرکی فلسفہ" شامل ہو گیا تھا وہیں گوتم بدھ اور شنکر آچاریہ کی "سکونیت" کا پرتو بھی باقی رہا۔

۲۔ ابتداء میں نظم میں ظاہری طور پر بیان کا تکنیکی پہلو یا بیان کے سانچے بھی خالص ہندوستانی تھے کیونکہ ابتدائی دور میں اکثر نظمیں ہندوستانی بحروں ہی میں لکھی گئیں۔ تاہم فارسی بحروں کی وجہ سے ایک مترنم امتزاج کا آغاز ہو چکا تھا۔

۳۔ سنسکرت ویدانت کے الفاظ بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کیے گئے۔ جیسے آکار نراکار وغیرہ۔

۴۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان مصنفین کے ہاں الفاظ کے اوزان۔ صوتی اثرات پر رکھے گیے۔ الفاظ کے تلفظ میں عوامی بول چال کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے جس کا اس دور کے مصنفین نے خاص طور پر خیال رکھا۔ مثلاً نفع۔ کو نفا۔ وضع کو وزا وغیرہ جو آوازیں ان کے تلفظ اور املا میں چھوڑ دی گئی ہیں وہ وہی ہیں جنہیں ہندوستانی صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔

۵۔ اسالیب میں بھی بڑی حد تک "ہندوستانیت" تھی مثلاً عورت کی طرف سے اظہار عشق۔ تصوف کے مسائل کو عورت کا میکہ اور سسرال کی اصطلاحوں میں سمجھانا جو "بھکتی۔ ویدانت" طور (BHAKTI-CUM-VEDANTA ATTITUDE) ہے نیز "استری بھاؤ" یا عورتوں کی جذبات نگاری اختیار کی گئی جو خالص ہندوستانی طریقہ ہے۔

۶۔ اس کے علاوہ تشبیہوں۔ استعاروں اور تلمیحوں میں بھی "ہندلمانی" تہذیب کا گہرا امتزاج نظر آتا ہے۔

اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم مذہبی "ادب" اپنے دامن میں بہت سے جواہر لیے

ہوئے ہے۔ جن پر اہل تحقیق کی نظریں نہ پڑسکی تھیں۔ ان مجتہدین کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اُردو نثر کو اس نہج پر لا ڈالا جس کے نتیجے کے طور پر اس میں ہر قسم کے مضامین کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہو سکی۔

ان بزرگوں نے اپنی تحریروں میں فنی اور جمالیاتی قدروں سے زیادہ اخلاقی تلقینی قدروں کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا۔ یہ سچ ہے کہ کوئی آرٹ اس وقت تک انسانی روح کی تسکین نہیں کر سکتا جب تک وہ اخلاقی عناصر کا حامل نہ ہو۔ : طالسطائی : اپنی ۱۸۹۶ء کی ڈایری میں لکھتا ہے۔ :

: انتہائی جمالیاتی کیف ہمیں کبھی پوری پوری تسکین نہیں بخشتا۔ انسان اس کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے وہ مکمل تسکین صرف اس چیز سے پاتا ہے جو اخلاقی حیثیت سے اچھی ہو اور یہ خصوصیت اس دَور کی سب ہی تصنیفوں میں پائی جاتی ہے :

(۸)
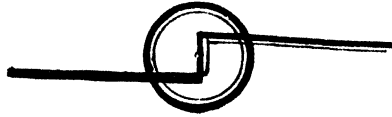
قدیم نثر کا شاہکار

(سب رس)

ادب کے ارتقا کے لیے ساز گار فضا۔ نثری قصوں
کی ابتدا۔ پہلا نثری قصہ۔ "سب رس" وجہی
کے حالاتِ زندگی۔ تصانیف "قطب مشتری"
اور اس کا ادبی پایہ۔ "سب رس" ایک ادبی
کارنامہ۔ زمانہ۔ "سب رس" نام کے مضمرات۔
"سب رس" کے ماخذ اور مماثلات۔ مقاماتِ تصوف۔
تمثیلوں سے مقابلہ۔ "سب رس" عشقِ حقیقی
کی تمثیل۔ "سب رس" عشقِ مجازی کی تمثیل۔
کردار حُسن۔ دل۔ معاشرت پر تنقید۔ اسلوب۔
مقفیٰ مسجع طرز۔ عربی فارسی الفاظ کہاوتوں
کا استعمال۔ ادبی خوبیاں۔

(۸)

قدیم نثر کا شاہکار

(سب رس)

گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) اُردو زبان اور ادب کی ارتقا کے لیے بڑی سازگار رہی۔ کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان طوایف الملوکی اور خانہ جنگی کے چنگل سے آزاد ہو کر امن وچین کے عہد میں داخل ہوا۔ شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کی بنیادیں استوار ہوئیں تو دکن میں عادل شاہیہ اور قطب شاہیہ سلطنتوں کو استحکام نصیب ہوا۔ ادب اور فنون لطیفہ کے پروان چڑھنے کی یہی رت ہوتی ہے۔ ہندی ادب میں بھی یہ دور "رتی کال" یعنی خوش حال کا دور کہلاتا ہے۔ اس سے پہلے کا دور جو اُردو ادب میں صوفیائے کرام کے کارناموں کا دور ہے ہندی میں بھی "بھگتی کال" یعنی سنت اور صوفیوں کے ادب کا دور تھا۔ ہندوستان کے عوام نے اگلے دور کے سیاسی لسانی اور تہذیبی انتشار سے گھبرا کر مذہب کے دامن میں ڈھونڈلی تھی۔ دو تہذیبوں کی آویزش کے بعد یہ زمانہ سکون اور اطمینان کا زمانہ تھا سچ تو یہ ہے کہ اسی دور میں ہندوستان کے مصنفین اور شعرا نے ادب کے ذریعے ہم آہنگی یکجہتی اور انسانیت کا بڑا اعلیٰ آدرش پیش کیا۔ ایسا آدرش جو اب بھی مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ابھی تک ادب صرف مذہب کا ترجمان تھا جب سیاسی اور تہذیبی شکست و ریخت سے مہلت ملی تو ذہنی عیش کوشی کے جذبات پرورش پانے لگے اور ادب جذبات انسانی کا مفسر اور اظہار کی لطافتوں کا مظہر بھی بنے گا۔ یہیں سے قصے کہانیوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ مذہب کے خشک موضوع سے ہٹ کر قصے کہانیوں کی دلچسپیوں نے شعرا اور مصنفین کے دامن دل کو کھینچا

اور اظہار کے سانچوں میں فنی پہلو اجاگر ہونے لگے۔ شعر اور قصّے کو جوڑ کر منظوم داستانیں تیار کرنے کا آغاز اس صدی کی ابتداء سے ہو چکا تھا۔ گیارھویں صدی کے ربع اول کے بعد سے نثر میں بھی قصے اور داستانیں لکھی جانے لگیں۔

منظوم قصوں میں جو اس وقت لکھے جا چکے تھے: سیف الملوک بدیع الجمال؛ اور: طوطی نامہ؛ کو کافی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ ان قصص میں طبع زاد بہت کم تھے۔ زیادہ تر فارسی عربی اور سنسکرت کے ترجمے یا چربے تھے۔ اس دور میں فارسی کے ترجمے بہت زیادہ ہوئے اور کوشش کی جانے لگی کہ اُردو فارسی کے مدمقابل بن جائے۔ اس کے پس پردہ سیاسی مضمرات بھی کام کر رہے تھے۔ شمال میں فارسی سرکاری زبان تھی۔ دکن کی سلطنتوں نے دیسی یا نوزائیدہ زبان کی سرپرستی کی۔ یہاں تک کہ عادل شاہیہ اور قطب شاہیہ درباروں نے اُردو کو درباری زبان کے رتبہ تک ترقی دے دی [1]۔ چنانچہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں وجہی۔ نصرتی۔ غواصی اور ابن نشاطی کی قدر افزائی اس کی دلیل ہے۔

نثری قصوں میں وجہی سے پہلے لکھے ہوئے نثری قصے اب نایاب ہیں لیکن وجہی کا نشوونما پایا ہوا آرٹ اور اس کی زبان شہادت دیتی ہے کہ یہ نقشِ اول نہیں ہو سکتا۔ وجہی کے قصے کتاب دل کی تفسیریں ہیں نظم اور نثر دونوں میں۔

نظموں میں وجہی کی، قطب مشتری؛ پہلی طبعزاد نظم ہے جس میں مصنف نے اپنے ہی دور کے ایک عظیم عشقیہ واقعہ کی ترجمانی کی ہے۔ اس قصہ میں دوسری زبانوں کی دریوزہ گری نہیں کی گئی ہے۔ نثر میں اس کی تصنیف؛ سب رس؛ مواد اور ہیئت ہر اعتبار سے قدیم اُردو ادب کا شاہکار ہے۔

---

[1] : تاریخ فرشتہ؛ (جلد دوم) صفحہ ۲۰ میں لکھا ہے۔ :

: ابراہیم عادل شاہ دفتر فارسی کہ بجائے دفتر ہندی جدید پیدا و قرار داده بودند برطرف نموده۔ بدستور سابق ہندوی مقرر نمود :

خافی خان (: منتخب اللباب؛ جلد سوم صفحہ ۳۰۰) اور ابراہیم زبیری نے (بساطین السلاطین صفحہ ۴۹) بھی اس کی توثیق کی ہے۔

حالاتِ زندگی

وجہی کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ قدیم ادب کے اب تک جتنے بھی تذکرے یا تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کی زندگی کے حالات درج نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اتنا بڑا شاعر تھا کہ اسے کوئی تذکرہ نگار فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وجہی کی شخصیت قدیم دور کے شعرا میں سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف اچھا شاعر تھا بلکہ اپنے زمانے کا اور شاید سارے زمانوں کا بہترین نثر نگار بھی۔ اس نے جہاں طویل نظم میں "قطب مشتری" جیسا کہ طبعزاد کارنامہ چھوڑا وہیں اس کی شاعری کے پائے کا بہ حیثیت مجموعی اندازہ لگاتے ہوئے اس کی ان غزلوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو "قطب مشتری" میں اور اس کے نثری شاہکار میں جابجا بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ اسی طرح اس کی رباعیاں اور قصیدے بھی اُردو ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ نثر میں تو اس کا کارنامہ مواد اور ہیئت ہر لحاظ سے کم سے کم قدیم دور کے نثری کارناموں میں سب سے "قد آور" نظر آتا ہے۔

بعض تذکروں اور تاریخوں میں وجہی کے جو حالات درج کیے گیے ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سب سے عجیب بات اس سلسلہ میں قابل ذکر یہ ہے کہ حکیم شمس اللہ قادری نے "اُردوئے قدیم" کے پہلے ایڈیشن میں سرے سے وجہی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس عرصہ میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے اس کی "قطب مشتری" اور "سب رس" کے شائع ہونے کے بعد حکیم صاحب نے "اُردوئے قدیم" کے تیسرے ایڈیشن میں وجہی کا کچھ حال شامل کر دیا وہ لکھتے ہیں :

> "وجہی بھی اسی عہد میں گزرا ہے۔ اس نے محمد قلی کی وفات سے دو سال قبل ۱۰۱۸ھ کے حدود میں ایک مثنوی لکھی ہے اور اس میں مشتری کے ساتھ خود بادشاہ کے عشق و محبت کے حکایات بیان کیے ہیں۔" [۲]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے "اردو شہ پارے" میں وجہی کے جو حالات لکھے ہیں ان کا ماخذ زیادہ تر خود وجہی کی تصنیفات ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے

---

[۱] اُردو شہ پارے صفحہ ۹۶

[۲] اُردوئے قدیم (طبع سوم) صفحہ ۶۳

کہ اس کی مثنوی سے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے ۔ ؎۱

حکیم شمس اللہ قادری ، مولوی عبدالحق اور نصیرالدین ہاشمی سب نے وجہی کے ساتھ "ملا" کا احترامی لقب بھی لگا دیا ہے اور اس کا ماخذ غالباً نظام الدین کی تصنیف "حدیقۃ السلاطین" ہے جس میں وجہی اور غواصی کے معرکوں کا ذکر کرتے ہوئے وجہی کے ساتھ "ملا" کا لفظ احتراماً استعمال کیا گیا ہے ۔ یہ اس زمانے کے اکثر علماء کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا تھا چنانچہ ظہوری جو وجہی سے قریبی زمانے میں دکن میں موجود تھا اس کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مورخین نے اسے بھی ملا کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ یہ لفظ احترام کا اظہار کرنے کے لیے مخصوص معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم وجہی کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں اور خاص طور پر "سب رس" میں عربی اور فارسی کے علاوہ حدیث اور قرآن کی معلومات میں جس مہارت کا اظہار کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہیں تو وجہی کو ملا کے لفظ سے متصف کرنا کچھ غلط بھی نہیں معلوم ہوتا ۔

وجہی کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی صاحب نے لکھا ہے :

"ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے اس کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے" ؎۲

اگر یہ تحقیق صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وجہی کی شاعری ابراہیم کی وفات ۹۸۸ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ۹۸۸ھ میں وجہی کی عمر پندرہ یا بیس سال کی تھی تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی پیدائش ۹۶۰ھ یا ۹۶۵ھ کے لگ بھگ ہوئی اس نے "قطب مشتری" ۱۰۱۸ھ میں یعنی محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے انتقال سے دو سال قبل لکھی ۔ وجہی کے بارے میں اکثر تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے زمانے تک زندہ رہا ۔ اور اس واقعہ کی شہادت خود اس کے نثری کارنامہ "سب رس" سے بھی ملتی ہے جو ۱۰۴۵ھ میں لکھا گیا تھا ۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وجہی کا انتقال

؎۱ : یورپ میں دکھنی مخطوطات ، صفحہ ۲۷

؎۲ : دکن میں اردو ، (طبع چہارم) صفحہ ۴

: سب رس : کی تکمیل کے فوراً بعد ہی ہوگیا تو ان سنین کے حساب سے انتقال کے وقت اس کی عمر ۸۰ یا ۸۵ برس کی ہوتی ہے۔

: قطب مشتری : کی تصنیف کا ۱۰۱۸ھ مسلمہ سنہ ہے۔ یہ عہد محمد قلی کی حکومت کا تھا۔ : قطب مشتری : میں ابراہیم قطب شاہ کی مدح کے بارے میں یہ کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ وہ بادشاہ وقت کی مدح ہوگی۔ لہٰذا یا تو : قطب مشتری : کے سن کو غلط ماننا پڑے گا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابراہیم قطب شاہ کی مدح جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے : قصہ کے تعلق سے ہے نہ کہ شاہ وقت ہونے کے لحاظ سے[۱] : لیکن : قطب مشتری : کی تصنیف کے سنہ کے بارے میں سب سے زیادہ مستند بیان خود مصنف کا ہو سکتا ہے اور وجہی نے ایک شعر میں اس کی تصنیف کا سنہ ۱۰۱۸ھ بتایا ہے۔ شعر حسب ذیل ہے :۔

: تمام کیا دیس بارا منے سنہ ایک ہزار ہور اٹھارا منے : [۲]

غرض بجز اس کے کہ مطبوعہ نسخہ کے خاتمہ کے اشعار کو الحاق تصور کیا جائے ہم ۱۰۱۸ھ کو : قطب مشتری : کی تصنیف کا زمانہ ماننے پر مجبور ہیں۔

ہاشمی صاحب کا بیان اس صورت میں بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ : قطب مشتری : کی تصنیف کے وقت وجہی کی عمر تیس سال کی ہوگی تو اس کی ولادت کا سنہ ۹۸۸ھ ہوتا ہے جو ابراہیم کی وفات کا سنہ ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص پیدا ہوتے ہی شعر کہنے نہیں لگتا۔

وجہی کے سنہ پیدائش اور اس کی شاعری کے آغاز کے زمانے کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں ہو سکتی ہیں لیکن ایک بات یقینی ہے کہ محمد قلی کے تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی اس کی قسمت کا ستارا چمکا۔ محمد قلی کے تخت نشین ہونے کے تیس سال بعد اس نے : قطب مشتری : لکھی لیکن اس مثنوی کے پورے واقعات کو تخیل کے ذریعہ زندہ کرنے والا ذہن بڑا ہی پیچیدہ اور فنکار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو محمد قلی کی بادشاہت کے زمانے میں اس کو

---

[۱]

[۲] : قطب مشتری : صفحہ ۱۰۹

شہزادے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ اس وقت حکمران رہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :

: ابراہیم قطب شاہ راجہ دھیراج
شہنشاہِ شاہاں میں اچھتے ہیں آج :

بادشاہ کی مدح لکھنے کا یہ انداز شاید فارسی اور اُردو کی شاہ وقت کی مدح نگاری کی رسم کے بالکل خلاف اور اپنی آپ نظیر ہے۔

وجہی کے علم و فضل اور ذوقِ شعر و ادب پر اس کی مثنوی اور اس کے نثری کارنامے سے بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ وہ عربی سے واقف تھا۔ فارسی میں دستگاہ رکھتا تھا۔ اور شاعری میں تو اس کا وہی انداز تھا۔ جو میر کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا   مستند ہے میرا فرمایا ہوا

وجہی نے : قطب مشتری : میں شرح شعر کے عنوان سے شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ شاید قدیم ادب میں ایک انوکھی چیز ہے۔ اس پائے کی کوئی چیز حالی کے مقدمہ سے پہلے مشکل سے دستیاب ہوگی۔ اس کی شرح شعر میں تنقید شعر کے بعض ایسے پہلو نکلتے ہیں جو ہر زمانے کے لیے نصب العین کا کام دے سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتا ہے :

: جو بے ربط بولے تو ن بیتاں پچیس ÷ بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس :

پھر وہ کہتا ہے :

: سلاست نہیں جس کیرے بات میں ÷ پڑیا جائے کیوں جرنے کرہات میں :

ملٹن نے اچھے شعر کی تین خصوصیات بتائی ہیں۔ صداقت، سادگی، اور تاثر یا جوش وجہی کی شرح شعر کے لحاظ سے سلاست۔ معنی کی بلندی۔ اثر منتخب لفظوں کا استعمال اچھے شعر کے ضروری لوازم ہیں۔

وجہی کی قدر و منزلت نہ صرف دربار میں بلکہ دربار سے باہر عوام میں بھی کافی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے روّیے میں : ادبی امارت : (Literary Aris-tocracy-)

کی وہ خوبی پیدا ہوگئی تھی جس کا اظہار وہ نظم و نثر دونوں میں کرتا ہے۔ بعض وقت اس کو اپنے فن پر اتنا ناز ہوتا تھا کہ وہ ادب میں کسی کو اپنا ثانی ماننے کے لیے تیار نہیں نظر آتا۔ وجہی کا اپنے کلام کی قدر دانی کے لیے گزرے ہوئے شاعروں میں فیروز اور محمود کو یاد کرنا اس کی اس پیچیدہ نفسی کیفیت پر روشنی ڈالتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے صاحبانِ فن میں سے کسی کو اپنے فن کی قدر دانی کر سکنے کا اہل ہی نہیں سمجھتا تھا۔

اِس ذہنیت کا آدمی کبھی اپنے زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ یہی چیز ہم کو وجہی کے کلام سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً آخری زمانے میں جب محمد قلی کے جانشین محمد قطب شاہ نے غواصی کی قدر افزائی کی تو وجہی کو بہت برا لگا۔ چنانچہ وہ اپنے زمانے کے شعرا میں خاص طور سے غواصی کو اپنے زہر میں بجھے تیروں کا ہدف بنانے کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔

لیکن جس انداز میں اس نے غواصی پر ایراد کیے ہیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح غالب کو : استاد شہ سے پرخاش : کا خیال نہیں آسکتا تھا اسی طرح محمد قطب شاہ کے منظورِ نظر شاعر پر کھلے طور پر چوٹیں چلنے کی وجہی میں تاب و طاقت نہ تھی۔ جس کی وہ ذو معنی اشعار میں تعریفیں لکھتا ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوگا۔

اگر غوطے یک برس غواصی کھائے ۔۔۔ تو یک گوہر اس دھات امولک نہ پائے
یو موتی نین وہ جو غواص پائیں ۔۔۔ یو موتی نین وہ جو کسی ہات آئیں

عبداللہ قطب شاہ جب تخت نشین ہوا تو وجہی کی ڈوبتی ہوئی شہرت کو کچھ عرصہ کیلیے افاقہ سا نصیب ہوا۔ عبداللہ غواصی کو جو اس کے پیش رو کے عہد میں دربار میں اہمیت حاصل کر چکا تھا نظر انداز تو نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے پرانے شاعر وجہی کو بھی نہیں بھلایا۔ چنانچہ تخت نشین ہونے کے بعد چھ برس بعد جب اس کے گھر لڑکا تولد ہوا تو غواصی اور وجہی دونوں نے تاریخ ولادت نکالنے کی کوشش کی۔ غواصی نے جیسی مختصر مفید مگر نثری انداز میں تاریخ "محفوظ باد" نکالی تھی۔ اس سے اس کے دربار میں اپنے اثر کے بارے میں ایقان کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں وجہی نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نکالنے میں اپنی ساری فنکارانہ صلاحیتوں

کو بازی پر لگا دیا جب کہیں جاکر "آفتاب از آفتاب آمد پدید" جیسی بے مثل تاریخ اس کے ہاتھ آئی۔

یہ سنہ ۱۰۴۱ھ کا واقعہ تھا۔ یہ تاریخ دراصل وجہی کی فنی صلاحیتوں کے اپنے معراج کی طرف ترقی کی رفتار کی غمازی کرتی ہے چنانچہ اس کے تین سال بعد اس نے "سب رس" لکھی ایک سہانی صبح عبداللہ قطب شاہ کا حکم اس کے پاس پہنچا۔ اس کی تفصیل خود اسی کی زبان سے زیادہ لطف دے گی۔ وہ کہتا ہے "

"صباح کے وقت بیٹھے تخت بیکایک غیب تے کچھ امنر پاکر دل میں اپنے کچھ لیا کر وجہی نادامن کون دریا دل گوہر سخن کون حضور بلائے پان دیئے ہور بہت مان دیئے۔ ہور فرمائے کہ انسان کے وجود بیچ میں کچھ عشق کا بیان کرنا اپنا ناون عیان کرنا۔ کچھ نشان دھرنا وجہی بھوگنی گن بھریا۔ تسلیم کر کر سر پر ہات دھریا۔ بہوت بڑا کام اندیشا بہوت بڑی فکر کریا۔ بلند ہمتی کے بادل تی دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا قدرت کے اسراران برسایا۔ بادشاہ کے فرمانے پر چپتیانوی تقطیع بیتا۔ کہ آنگے کہ آن ہمارے ہمین بھی کچھ تھے کر سمجھیں "

وجہی کو اپنے فن کی عظمت کا جتنا احساس تھا اتنا ہی اپنی شہرت کو اسی بلندی پر برقرار رکھنے کا بھی اسے بڑا خیال تھا۔ اور یہ احساس اس کے سارے کارناموں میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔

سنہ ۴۴ھ کے بعد وجہی کا کہیں نام نہیں سنائی دیتا۔ طبعی طور پر اگر وہ مرا بھی نہ ہو تو ادبی حیثیت سے وہ دنیا کے لیے مر چکا تھا۔

تصانیف

ابھی تک وجہی کی صرف دو تصانیف کا حال معلوم ہو سکا ہے ان میں سے "قطب مشتری" منظوم داستان ہے اور "سب رس" اس کا نثری شاہکار۔ لیکن گارساں دتاسی نے وجہی کی ایک تیسری تصنیف "قصہ ماہ سیما و پری رخ" کا ذکر بھی

اپنے خطبات میں کیا ہے وہ لکھتا ہے :

: علاوہ ان منظوم فسانوں کے جو مقبول عام قصّوں سے لیے گیے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے ہیرو غیر معروف ہیں ہندوستانی میں ایسے قصّے بکثرت ہیں۔ اور اکثر مشہور ہیں۔ جن میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں۔ قصّہ بلند اختر جو میر خان نے لکھا ہے۔ "اخوان شاہ" میں اس کے دو نسخوں سے واقف ہوں۔ ایک تو : چندر بدن ماہ یار : جس کے کئی نسخوں کا مجھے علم ہے اور دوسرا : دل آرام اور دلربا : جس کے مولفوں میں ایک منتی رام ہے۔ : پری رخ وماہ سیما : جس پر وجہی نے ایک مثنوی لکھی ہے : ؎۱

پروفیسر سید ضامن علی نے : جائزہ زبان اُردو : میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ محمد حفیظ صاحب الہ آبادی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

تاج الحقایق

ان تین کے علاوہ مولوی عبدالحق نے وجہی ہی کی تصانیف میں : تاج الحقایق : کو بھی شمار کیا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

: وجہی قدیم دکھنی اُردو کا بہت بڑا ادیب گزرا ہے۔ اسے نثر اور نظم دونوں پر بڑی قدرت تھی۔ اب تک اس کی تین کتابیں دریافت ہوئی ہیں ایک : سب رس : جو اس سے قبل انجمن کی طرف سے شایع ہو چکی ہے ایک دوسری کتاب : تاج الحقایق : ہے اور وہ بھی نثر میں ہے تیسری یہ مثنوی جو : قطب مشتری : کے نام سے موسوم ہے : ؎۲

تاج الحقایق پر بحث پیچھے صفحات میں گزر چکی ہے۔

قطب مشتری

وجہی کا منظوم کارنامہ ہے تاہم اس کے مطالعے سے وجہی کے اندازِ فکر کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ پروفیسر سروری : اُردو مثنوی کے ارتقاء

؎۱ : خطبات گارساں دتاسی : صفحہ ۱۵۹
؎۲ : مقدمہ قطب مشتری :

میں لکھتے ہیں :

وجہی کی انشا پردازی کی طرح اس کی شاعرانہ قابلیت بھی بے مثل تھی ۔ ؎۱

اور اس بیان کی کچھ دلیلیں بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس مثنوی کو پڑھ کر وجہی کی غالب جیسی؛ جدت فکر؛ اور میر جیسی خود اعتمادی کا احساس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ؛ قطب مشتری ؛ کو اپنے ہم عصر کارناموں میں خاص مقام حاصل ہے۔ چنانچہ وجہی خود بھی اپنے کمال سے باخبر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے یہ شعر محض تعلی کی خاطر نہیں لکھے تھے۔

؛ تیرا شعر سن جی پگھلتا ہے یوں
کہ پانی تے ابلوج گلتا ہے یوں
تو وجہی کہیا شعر کئی دھات کا
ہوا نیا ست تجہ تے مزا بات کا ؛

میر کی طرح جس نے کہا تھا :

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووئے گا
درد انگیز انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ روئے گا

وجہی کو بھی اپنی انفرادیت کا احساس ہے۔ دوسرے شعراکی طرح چبائے ہوئے نوالے کھانا اسے ناگوار تھا۔ دوسرے شعرا کے کارنامے وجہی کی طرح طبعزاد نہیں مستعار ہیں۔ مثلاً غواصی نے ؛سیف الملوک و بدیع الجمال؛ میں ؛ الف لیلیٰ ؛ کے ایک افسانے کو منظوم کیا ہے۔ ابن نشاطی نے فارسی مثنوی ؛ بساتین ؛ کو ؛ پھول بن ؛ کا جامہ پہنایا۔ لیکن ان کے برخلاف وجہی نے ایک نئی چیز پیش کی۔ اس نے ؛ قطب مشتری ؛ میں ؛ درشرح شعر ؛ کے عنوان سے اچھے شعر کی پرکھ اور شعر گوئی کے چند اصول بھی بتائے ہیں۔ اس کے خیال میں شعر کی سب سے بڑی خوبی ؛ جدت ادا ؛ ہے اس خصوص میں اس کی ذہنیت غالب سے ملتی جلتی ہے۔ ؛ قطب مشتری ؛ کئی حیثیتوں سے

؎۱ : اُردو مثنوی کا ارتقاء صفحہ ۶۵

اہمیت رکھتی ہے۔

۱۔ اس کے بیان میں درد واثر ہے جو اسے دوسری مثنویوں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ اثر اس کی حقیقت نگاری کا نتیجہ ہے۔ دوسری مثنویوں جیسے : لیلیٰ مجنوں : ، سیف الملوک بدیع الجمال : وغیرہ کی طرح اس کے کردار خیالی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے جن کی تصویر کشی میں تخئیل ہی تخئیل ہو۔ قصہ کو بڑھانے اس کے سامنے جیتے جاگتے کردار محمد قلی اور بھاگ متی کے موجود تھے اور جیسا کہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ ان ہی کی داستانِ محبت کی اس نے شاعرانہ ترجمانی کی ہے۔ [1]

۲۔ : قطب مشتری : کی زبان بہ نسبت اگلے شعرا کے سلیس اور صاف ہے اسمیں جگہ جگہ شاعر کی قدرتِ بیان کے نمونے نظر آتے ہیں۔ مثنوی میں اکثر مقامات پر جذبات کی ترجمانی اس نے نفیس غزلوں کے ذریعہ کی ہے۔ یہ غزلیں زبان کی گھلاوٹ کے سبب عمدہ گیت بن گئے ہیں۔

۳۔ وجہی کو منظر کشی میں بھی بڑی دستگاہ تھی جس کا ثبوت جگہ جگہ ملتا ہے مثلاً جہاں : عطارد : کے : مشتری : کے محل کو آراستہ کرنے کا بیان ہے وجہی نے اس آرائش کی تفصیل میں پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نقاشی کی تصویر ہمارے سامنے موجود ہے۔ مثلاً :۔

کہیں بن بیابان کہیں سمدر پہاڑ — کہیں مرغ ماہی کہیں پھول جھاڑ
کہیں شیر شرزا کہیں کج ترنگ — کہیں باز بحری کہیں یک کلنگ
کہیں بت بجانے ہور بت پرست — کہیں نار ہور پرش یک ٹھا رمست
کہیں شاعران شعر کہتے رہیں — کہیں چشمے امرت کے بہتے رہیں [2]

یعنے عطارد نے محل کی دیواروں پر قسم قسم کے نقش بنائے کہیں جنگل بیابان کا منظر پیدا کیا ہے تو کہیں سمندر اور پرند چرند کی تصویریں بنائی ہیں۔ کس جگہ شاعروں کو شعر پڑھتے دیکھایا ہے تو کہیں چشمے بہتے بتائے۔

---

[1] دیباچہ قطب مشتری صفحہ ( )
[2] قطب مشتری صفحہ (۷۳)

۴۔ جذبات نگاری میں دورِ قدیم کے بہت کم شاعر وجہی کے پایہ کو پہنچ سکے ہیں خصوصاً نسوانی جذبات کو وہ خوب بے نقاب کرتا ہے۔ "قطب مشتری" میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں شہزادہ "مشتری" کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس وقت "مشتری" کی بے تابی اور بیقراری کو جس طرح وجہی نے بیان کیا ہے وہ ادب میں کمیاب ہے۔ کبھی تو وہ اپنی حالت زار بیان کرتی ہے۔ کبھی اندیشہ مند ہے کہ قطب کسی دوسری عورت کے جال میں نہ پھنس گیا ہو یہ انگ ہندی یا ہندوستانی شاعری کا مخصوص موضوع ہے۔ فارسی میں اس طرح کے نمونے نہیں ملتے۔ وجہی کا انداز ایسے موقعوں پر ٹھیٹھ ہندوستانی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی عورت محبت کے آگے بڑی سے بڑی چیز کی پرواہ نہیں کرتی حتی کہ جان تک دیدینے تیار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سے بھی اسی قربانی کی متوقع رہتی ہے۔ اسے محبوب کے صفات سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ صرف ذات کی طلب گار ہوتی ہے یہ بے لوث محبت کی انتہا ہے۔ کیونکہ صفات سے محبت ہو تو صفات کے زوال کے بعد محبت کے زوال کا بھی احتمال رہتا ہے۔ برخلاف اس کے ذات سے محبت ہو تو محبوب کا ہر روپ "سروپ" معلوم ہوتا ہے۔ "مشتری" بھی "قطب" سے اس وجہ سے محبت نہیں کرتی کہ وہ شہزادہ ہے چنانچہ ایک موقع پر وہ شہزادے پر طعن کرتی ہے۔

محبت میں جو نیا ست سو نیا ست ہے
کہی بات میں راست ہور راست ہے

(یعنے محبت میں جو بڑا ہے وہی دراصل بڑا ہے۔ میں نے یہ سچی بات کہی اور یہ سچ ہے)

۵۔ "قطب مشتری" میں کئی مقام ایسے آتے ہیں جو اسے اپنے عصر کی دوسری مثنویوں میں ممتاز کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اس مثنوی کی عظمت کے زیادہ معترف نظر نہیں آتے۔ تاہم وہ بھی یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے کہ "اس میں بعض باتیں بڑی خوبی کی ہیں"۔ [1]

سب رس

وجہی کی "قطب مشتری" کے ادبی پایہ کے بارے میں ممکن ہے۔ اختلاف رائے کی گنجایش ہو لیکن اس کا نثری کارنامہ "سب رس" قدیم ادب کا مسلمہ شاہکار ہے۔

---

[1] دیباچہ "قطب مشتری" صفحہ ( )

، مثالیہ قصہ ، (Allegory) کی پیچیدہ تکنیک اور اسلوب بیان ہر اعتبار سے یہ کارنامہ اس سے پہلے کے سارے نثری کارناموں پر اور شاید بعد کے بہت سے کارناموں پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ، سب رس ، کی طرح کے بلند پایہ ادبی کارنامے دفعتاً نہیں پیدا ہو جاتے بیان اور اسلوب کو اس درجہ تک ترقی کرنے کے لیے بہت سی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ ، سب رس ، کے اسلوب کی شروعات ، تاج الحقایق ، میں کسی حد تک نظر آتی ہیں لیکن اس اسلوب کا کمال ، سب رس ، میں دکھائی دیتا ہے اور ، ٹھیٹ ادب ، (Belles-Lettres) کی حیثیت سے یہ تصنیف قدیم اُردو کے ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

وجہی کی تصانیف میں ، سب رس ، آخری کتاب ہے۔ اس کی تصنیف تک وہ دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اور تلخ و شیریں تجربات کا مزا لے چکا تھا۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کا فن اپنے شباب پر تھا۔ فن کار کی زندگی کی دوپہر ڈھل چکی تھی لیکن اس کے فن کا آفتاب ، نصف النہار ، پر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کونسی بات کیسے کہی جا سکتی ہے اس نے اس تصنیف کے لیے نام بھی خوب تجویز کیا ــ ، سب رس ،

"سب رس" نام کے مضمرات

، رس ، ہندی میں جذبات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فراق صاحب اپنی رباعیوں کے مجموعہ ، روپ ، کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

، جذبات کی مختلف کیفیتوں کو سنسکرت میں ، رس ، کہتے ہیں [۱] ،

یہ رس مختلف ہیں۔ سنگار رس۔ ہاسیہ رس۔ ونود رس وغیرہ ، سب رس ، ان ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی اس میں زندگی کے تمام رس سموئے ہوئے ہیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر ڈی۔ سیتا راما نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں ، رس ، کی حسب ذیل تشریح کی ہے :۔

---

[۱] دیباچہ ، روپ ، فراق گورکھپوری

" رس (ذوق) وہ جوہر ہے جس سے ہم صناعت کے کسی نمونے کو جانچتے پرکھتے اور محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ لذت ذہنی (   ) ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو جذبات اور تناسبات کی ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں وہ اپنے گرد و پیش کے مادی مناظر سے بے خبر ہو کر روحانی تلذذ حاصل کرتا ہے۔ جو کشش نفس مطمئنہ سے مشابہ ہے۔ تعینات سے گزر کر اس کی ہستی فرد کی حیثیت سے ختم ہو جاتی ہے۔ وہ محسوسات کے مطالعہ میں ایسا کھو جاتا ہے کہ ان کا دایرہ وسیع وسیع ہوتے ان آفاقی حقایق کا احاطہ کر لیتا ہے جو خود اس کی ہستی کے بنیادی عناصر ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے وہ خود بھی جملہ حیات اور تمام کائینات کا ایک جز بن جاتا ہے "۔ [1]

ان دونوں تشریحوں کی رعایت "سب رس" میں موجود ہے۔ جہاں اس میں زندگی کے تمام رس مسرت غم رشک مسابقت موجود ہیں وہیں یہ کتاب کچھ دیر کے لیے انسان کو دنیا اور مافیہا سے بے خبر بھی کر دیتی ہے اور انسان محسوسات کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے جس کو وجہی نے "مجسم کردار" بنا دیا ہے۔

ماخذ لیکن ان مجرد تصورات کو کرداروں کا روپ عطا کرنا وجہی کی اپج نہیں جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق نے تفصیل سے لکھا ہے وجہی سے قبل ایک فارسی شاعر ابن سیبک فتاحی سنہ ۸۵۲ھ نے ایک مثنوی "دستور عشاق" [2] کے نام سے لکھی تھی جس کے پانچ ہزار اشعار تھے۔ پھر اس قصّے کو مصنف نے "شبستانِ خیال" اور "حسن و دل" کے نام سے الگ الگ بھی لکھا ہے۔

"حسن و دل" نثر میں دستور عشاق کا خلاصہ ہے جو مسجع اور مقفیٰ طرز میں لکھا گیا۔

---

[1] بحوالہ "جہاں بین" از جعفر علی خان اثر صفحہ ۲۹۲

[2] اس مثنوی کو آر۔ ایس۔ گرین شیلڈس (آئی۔ اے۔ ایس) نے اصل فارسی نسخہ میں سنہ ۱۹۲۶ء میں شایع کیا تھا۔

صنایع بدایع اس میں خوب استعمال کیے گیے ہیں ؎۱۔ ڈاکٹر عبدالحق کے بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مثنوی "دستور عشاق" کا یہ نثری خلاصہ یورپ میں تین بار ترجمہ کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ اس کے دو ترجمے علی الترتیب آرتھر براؤن "اور ولیم پرائس نے کیے۔ تیسری مرتبہ جرمن ڈاکٹر روڈالف دوراک نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے مع اپنے عالمانہ مقدمہ اور تنقیدی حواشی کے شایع کیا۔ یوروپ کی زبانوں کے علاوہ ترکی میں بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کا خیال ہے کہ "وجہی" نے "سب رس" میں اسی نثری قصے "حسن و دل" کا چربہ اڑایا ہے۔ یہ نتیجہ انھوں نے اس طرح اخذ کیا کہ وہ مقامات جن کے نثری قصے میں تشریح نہیں وجہی کی "سب رس" میں بھی وہ تفصیلات مفقود ہیں۔

۱۔ مثلاً جب "حسن" و "دل" کی شادی ہوتی ہے تو مثنوی "دستور عشاق" میں فتاحی نے آلات موسیقی کے بڑے پُر لطف اور دلچسپ مناظر پیش کیے ہیں۔ اس کے برخلاف نثر کی کتاب میں یہ نہیں پائے جاتے ہیں۔ وجہی نے بھی ان حصوں کو اپنے نثری کارنامہ میں اڑا دیا۔

۲۔ وجہی نے اسلوب میں بھی نثری قصے کی پیروی کی ہے۔ یعنی مسجع و مقفیٰ عبارت کا التزام رکھا ہے۔

لیکن پروفیسر عزیز احمد کا خیال ہے کہ وجہی نے عمداً اس مثالیہ عشق (Allegory of Love) کو متصوفانہ توجیہہ سے بے نیاز رکھنے کی خاطر بعض حصے ارادےً مثلاً وہ حصہ جہاں "فقر" کا بیان ہے اور قصے کو قصہ ہی رہنے دیا ہے۔ اس کا سبب مصنف (وجہی) کی "دستور عشاق" سے ناواقفیت نہیں۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"ملا وجہی نے "سب رس" میں یہ ہوشیاری کی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان کی تشریحات کو حذف کر دیا ہے۔ اور مثالیہ کو مثالیہ رہنے دیا۔ علامت بندی اور رمز نگاری میں تحلیل نہیں کیا۔" ؎۲

؎۱ دیباچہ "سب رس" صفحہ ۸

؎۲ "سب رس" ماخذ اور مماثلات اردو۔ اپریل ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۴۳

چنانچہ انھوں نے اپنے دعوی کی تائید میں "سب رس" کے خاتمہ سے ایک اقتباس بھی دیا ہے:

" پچھیں یک دیس دل ہور ہمت ہور نظر تینوں شراب پیئے تینو مست بے خبر تماشا دیکھتے دیکھتے رخسار کے گلزار میں آئے۔ دہن آب حیات کا چشمہ پائے۔ وہاں دیکھتے ہیں ایک پیر سبز پوش کلام زنار بنا گوش صاحب ہوش۔ اس چشمے پر کھڑا اداتا ہے۔ جو کوئی اسے دیکھیا وہ بہلتا ہے دو پیر سو مکڑی کا پلچ۔ بہت خوب داج واج۔ بہت آلا چاروں طرف ہڑے نور کا اجالا۔ دیکھتیچ جیو جاتا بھی آتا۔ یو دیکھنا عاشق کو بہت بھاتا۔ اگر یو آب حیات یوں جیوتا کرے گا تو ایک بار کیا کہ عاشق ہر روز ہزار بار مریگا۔ آب حیات کا مدد ہر دم آتا ل عاشق کون مرنے کا کیا غم۔ ہو سال سون مرنے آتا۔ ہزار ہزار کچھ فکران کرنے آتا۔ ہمت بولیا دل کون کہ اے دل یہاں کچھ چت دہر۔ اس پیر سون روشن ضمیر سون قدمبوسی کر۔ کہ یو پیر خضر پیغمبر ہے۔ آب حیات کے چشمے ہے دل نے جون ہمت بولیا تھا۔ تیونچہ دوڑ کر اس پیر کی قدم بوسی کیا۔ ادب سون نزدیک بیٹھیا۔ اس پیر کی دعا لیا جو دل کے دل میں راز کا خیال آیا۔ خضر نے بھی انکھیاں سون اونچہ اشارت دکھلایا۔ دل ہور انکھیاں سون بات ہوئی دلے وو بات دونوں کے سات ہوئی۔ خضر تے فیض دل کون انپڑیا کہ اپنی مراد کی منزل کون انپڑیا۔ دل نے خاطر قرار کیا گھر دار کیا روزگار کیا۔ دل کو فرزندان ہوئے، فرزندان خردمندان ہوئے۔ اس فرزندان مین کا بڑا فرزند سو یو کتاب لائق قابل مستفید ہر باب۔"

اور اتنا کہہ کر ملا وجہی نے حضرت خضر کی تشریح کو ٹال دیا ہے۔ [1]

عزیز احمد صاحب کی توجیہہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ اس سے وجہی کی جدت اور اپج

---

[1] "سب رس" ماخذ اور مماثلات اردو۔ اپریل ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۰۴

کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ گو اس نے چربہ فتاحی سے اڑایا لیکن نقل کو اصل سے بڑھا دیا۔ یہی وجہ ہے اس کی داستان فتاحی سے بڑھ گئی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں جتنے بھی قصہ لکھے گیے وہ اس بے مثل تصنیف یعنی "سب رس" ہی کے ترجمہ یا اس سے منقول تھے۔

اس قسم کے قصّے۔ نظم اور نثر دونوں میں لکھے گیے ہیں۔ اس کے منظوم ترجمے حسب ذیل ہیں۔:

۱۔ شاہ بیر اللہ مجرمی کی "گلشن حسن و دل" سنہ ۱۰۸۶ھ [1]

۲۔ شاہ حسین ذوقی کی "وصال العاشقین" سنہ ۱۱۰۹ھ

"سب رس" لکھے جانے کے پچاس سال بعد عہد عالمگیر میں محمد بیدل نے سنہ ۱۰۹۵ھ میں قصہ کو پر تکلف فارسی نثر میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے جدت یہ کی کہ قصے کے اشخاص کو خطابات بھی عطا فرمائے ہیں جس سے تمثیل کا سارا لطف جاتا رہا۔ وجہی کا کمال ہی یہ ہے کہ اس نے تمثیل کو تمثیل رہنے دیا۔ جیسا کہ پروفیسر عزیز احمد نے لکھا ہے:

"تمثالیہ کا اُردو میں بڑا نادر نمونہ "سب رس" ہے اس کے بعد اور نمونے ملتے ہیں مگر وہ اس صنف ادب کا انحطاط ظاہر کرتے ہیں" [2]

کسی ادبی شاہکار کے مطالعہ کے دو پہلو ہوتے ہیں:

۱۔ اس کا مواد ۲۔ اسلوب

مواد۔ مُقامات تصوّف

"سب رس" میں تصوّف کے مراحل اور عشق کی واردات کو تمثیل کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے یعنے اس میں حکایت یا بیان بیک وقت دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ ایک تو ادنیٰ سطح جس کے ذریعہ عام قاری کی توجہ حاصل کی جاتی ہے اور عشقِ مجازی کے بیان سے اس کی دلچسپی برقرار رکھی جاتی ہے۔

---

[1] اس کے سنہ تصنیف میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق دیباچہ "سب رس" میں سنہ ۱۰۸۶ھ اور ڈاکٹر زور "اُردو شہ پارے" میں سنہ ۱۱۱۴ھ بتلاتے ہیں۔

[2] "سب رس" ماخذ اور مماثلات: رسالہ اُردو (کراچی) جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

اور دوسرے اعلیٰ سطح جس کے ذریعہ فکر و نظر کی گہرائیوں کو ناپا جاتا اور تصوف کے مقامات و مراحل کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس کے مخاطب اہل بصیرت ہوتے ہیں عام قاری نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آریائی زبانوں میں ایسے قصے کہانیوں کی کمی نہ تھی جن میں بیان دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ خود ہندوستان کی دیگر زبانوں بالخصوص سنسکرت میں حکایات: کلیلہ و دمنہ (پنچ تنتر): سکاشپ تتی وغیرہ جیسے قصے بہت سے تھے جن سے دوسری زبانوں میں قصہ گوئی کا آغاز ہوا۔ لیکن اُردو میں: سب رس: سے پیشتر اس قسم کے کسی قصے کا سراغ نہیں ملتا۔

ایک اور امتیاز: سب رس: اور دوسری تمثیلوں میں یہ بھی ہے کہ ان تمثیلوں (پنچ تنتر: کلیلہ دمنہ: کے کردار حیوانات ہوتے تھے۔ ہر حیوان کسی انسانی خصوصیت یا صفت کا مظہر ہوتا تھا۔ اس کے بعد مثالیہ نے اور ترقی کی اور بجائے حیوانی کرداروں کے انسانی کرداروں کو مثالیہ میں استعمال کیا جانے لگا جیسے: پدماوت: وغیرہ۔ پدماوت میں رتن سین اور پدماوتی۔ علاء الدین۔ ناگ متی وغیرہ کردار ہیں لیکن ان کے معنے کچھ اور ہیں شاعر نے: رمز: کے طور پر ان کو استعمال کیا ہے [۱]۔: چتوڑ: جسم ہے۔: راجہ رتن سین:: دل: پدماوتی: عرفان سے مراد ہے۔: طوطا: رہبر اور مرشد اس کے بغیر خدا تک رسائی نہیں ہوسکتی: ناگمتی: قصہ میں رتن سین کی دوسری رانی ہے جو دراصل دنیا اور اس کے کاروبار ہیں جس نے اس سے دل لگایا وہ بچ نہ سکا۔: راگھو سین: شیطان ہے اور سلطان علاء الدین ماسواء اللہ۔ اس طرح عرفانی تعلیم ایک کہانی کے ذریعے دی گئی ہے۔ [۲]

اس کے برخلاف: سب رس: میں یہ جدت ہے کہ اس کے کردار نہ حیوان ہیں نہ انسان اور نہ ہی اس میں تاریخ کا سہارا لیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے کردار مجرد صفات جیسے حسن۔ عشق۔ دل وغیرہ ہیں۔ ان کے ذریعے مصنف انسانی جذبات کی فلسفیانہ تاویل کرتا جاتا ہے

---

[۱]: ملک محمد جائسی: از راجیندر ناتھ شیدا مضمون مطبوعہ آج کل دہلی

[۲]: انگریزی میں آرتھر اور گول میز کے امراء کی کہانیاں بھی اسی قسم کی ہیں۔

بظاہر ایک دلچسپ تمثیل بھی ہے۔ عشق اور عقل کی کش مکش حیاتِ انسانی کی سب سے دلچسپ کش مکش ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گی ؛ سب رس ؛ میں مصنف نے انھیں دو حریف بادشاہوں کے روپ میں پیش کیا ہے جس میں جیت عشق کی ہوتی ہے۔ لیکن عقل کو پھر بھی شکست نہیں ہونے پاتی بلکہ ایک طرح سے جیت عقل کی ہے وہ یوں کہ ؛ عقل ؛ کا بیٹا ؛ دل ؛ ؛ عشق ؛ کی بیٹی ؛ حسن ؛ سے شادی کر کے اسے مفتوح کر لیتا ہے۔

سچ پوچھیے تو جیسا کہ پروفیسر عزیز احمد اور ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے یہ سلوک و معرفت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کرنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ جو بہت ہی دلچسپ ہے : دل ؛ جو اس داستان کا ہیرو ؛ ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں ؛ قلب[1] ؛ ہے۔ ؛ آب حیات ؛ جس کی تلاش میں ؛ دل ؛ جاتا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد کے خیال میں ؛ عین شریعت ؛ یا ؛ سخن ؛ ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ صوفیا کی اصطلاح میں ؛ بقا ؛ کا مرتبہ ہے جب بندہ خدا کو بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھ سکتا ہے جب مادہ کی دیوار آڑ نہیں آتی ؛ حسن ؛ کا مفہوم ؛ جلوہ خداوندی ؛ یعنے ؛ حسنِ کامل ؛ ہے جس کی تلاش دل (سالک) کو ہے۔ پروفیسر عزیز احمد نے اس کی تاویل ؛ حسنِ اخلاق ؛ سے کی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ؛ حسنِ کامل ؛ ذات باری تعالیٰ ہے۔ ؛ غیر ؛ ابلیس ؛ ہے۔ جو سالک کو معرفت کی راہ سے بھٹکاتا ہے۔ ؛ عشق ؛ حسن کا باپ ہے۔ یعنے وہ جس سے ؛ عرفانِ الٰہی ؛ حاصل ہوتا ہے۔ صوفیا کے پاس ؛ عشق ؛ کی خاص اصطلاح ہے۔ وہ خدا کو محبت یا عشق ہی سمجھتے ہیں۔ ؛ شہر دیدار ؛ صوفیا کی اصطلاح میں ؛ شہود حضرت ؛ یا ؛ دیدارِ الٰہی ؛ ہے۔ جب بندہ اپنی خودی کو فنا کر کے خدا میں گم ہو جاتا ہے۔ قصّہ میں بھی ؛ دل ؛ ؛ شہر دیدار ؛ ہے۔ جہاں ؛ حسن ؛ رہتی ہے دل وہاں جا کر وہاں کے نظاروں میں گم ہو جاتا ہے اس میں ؛ دل ؛ کے چند مددگار اور ؛ حسن ؛ کی چند سہیلیاں ہیں جو ؛ قامت ؛ ؛ خال ؛ ؛ وہم ؛ ؛ غمزہ ؛ ؛ نظر ؛ وغیرہ سے موسوم کیے گیے ہیں۔ ؛ دل ؛ کے مددگار ؛ قامت ؛

---

[1] ملاحظہ کیجیے ؛ اسٹڈیز ان تصوف ؛ کا تتمہ ؛ ٹیکنیکل ٹرمس ان تصوف صفحہ ۱۷۷

: ہمت : : غمزہ : ہیں۔ : قامت : اصل میں : طریق اعتدال : ہے اور : ہمت : فیض ۔ : غمزہ : عین لطف حق ہے جس سے سالک کو عرفان حاصل ہوتا ہے۔ منفی صفات : وہم : : رقیب : ہیں جو دل : کے مخالف ہیں یعنی سالک کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ : وہم : : نفس وحشت افزا : اور رقیب : نفس دون : ہے۔ اس طرح : حسن : کی سہیلیاں : زلف : : خال : : مہر : ہیں۔ : زلف : دراصل : حبل اللہ : سے استعارہ ہے۔ : خال : سے : سواد الوجود : مراد ہے : مہر : : مہر الٰہی : ہے۔ اسی طرح ساری تمثیل میں صوفیا کے عرفان الٰہی کو پانے کے مدارج قصے کے پیرایے میں بیان کیے گیے ہیں۔

لیکن : سب رس : صرف عشقِ حقیقی ہی کی اچھی تمثیل نہیں جیسا کہ پروفیسر عزیز احمد نے بھی لکھا ہے۔ : عشق مجازی : کا بھی بیان ہے جس میں بقول ان کے :۔

: عاشق معشوق کے خصائص اور علامت لیکر
انہیں مثالی کرداروں میں ڈھالا گیا ہے :

اور جیسا کہ خود : فتاحی : نے جو اس داستان کا مصنف ہے اور جس سے وجہی نے قصہ اخذ کیا ہے اپنے دیباچہ : دستور عشاق : میں لکھا ہے۔

: مطلع و مقطعش حل دقایق عشق بازی می نماید :

: عشق شایستہ : یعنی (courtly love) کے یہ بیانات بقول پروفیسر عزیز احمد : قرون وسطی کے یوروپی ادب میں بھی عام تھے : اس کی مثال انھوں نے قصہ : رومانِ گل : (Roman Hela Rose) سے دی ہے۔ ان کے خیال میں : سب رس : اور : رومان گل : میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں۔

پہلے تو یہ کہ دونوں میں آداب : مراحل عشق کا بیان ہے اور دونوں نے اس بیان کے لیے مثالیہ قصہ کی ٹیکنیک استعمال کی ہے۔ دونوں داستانوں کا مقصد کھوج یعنی ایک خاص قسم کی تلاش ہے۔ : سب رس : میں یہ : تلاش : : آب حیوان : کی ہے آخر میں : آب حیوان : کو وجہی نے : کلام : یا : سخن : کا رمز بنادیا جو انسان کو : حیاتِ جاوید : عطا کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں یہ "عشقِ مجازی" کا بھی بڑا اچھا مثالیہ ہے۔ "محبت" "رشک" "فراق" "وصال" کے بڑے اچھے مرقعے اس میں ملتے ہیں۔ عام عشقیہ واقعات اور افسانوں کی طرح اس میں محبت کا "ابدی" "مثلث" ( ) بتایا گیا ہے۔ یعنے ہیرو، ہیروین اور رقیب۔ بقیہ کردار ذیلی ہیں جو یا تو "ہیرو" اور "ہیروین" کے معاون ہیں یا مخالف۔ مثبت صفات دوستوں کے روپ میں بیان کیے گیے ہیں اور منفی صفات مخالفین کے۔

مجازی معنوں میں دیکھا جائے تو "سب رس" کا ہیرو "دل" ہے اور ہیروین "حسن"۔ "دل" "حسن" کو پانے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ بالآخر اس کی رسائی "حسن" تک ہو جاتی ہے۔ اور پھر "حسن" و "دل" عارضی طور پر مل جاتے ہیں۔ پھر "غیر" ان میں پھوٹ ڈال دیتی ہے لیکن یہ جدائی عارضی ہوتی ہے اور دوستوں کی مدد سے "حسن" و "دل" پھر مل جاتے ہیں۔ ان دوستوں میں "حسن" کی سہیلیاں "وفا" اور "ناز" پیش پیش ہیں۔ "وفا" سپہ سالار "مہر" کی بیٹی ہے اور وہی "دل" کو دارو بے ہوشی پلا کر چھپے یعنی "قصرِ وصال" پر لاتی ہے۔ "دل" بے خودی میں بے تکلفی کا خوب لطف اٹھاتا ہے۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد اس کی حالت مجنوں کی سی ہو جاتی ہے۔ اس اثناء میں "حسن" کی مصاحب "غیر" کو "دل" کا حال معلوم ہوتا ہے۔ قصہ میں "غیر" "رقیب" کی بیٹی ہے وہ "حسن" کا بھیس بدلکر "دل" کو اپنے پاس بلواتی ہے۔ "خیال" اس کیفیت کی اطلاع "حسن" کو دیتا ہے۔ "حسن" فرطِ غضب میں "دل" کو اس کی بے وفائی کی سزا کے طور پر "ہجران" کے "کوٹ" میں قید کر دیتی ہے۔ یہاں سے فراق کی منزل شروع ہوتی ہے جو اکثر عشقیہ داستانوں میں عام ہے۔ چنانچہ اس کے مانند دوسرے مثالیہ "رومانِ گل" میں بھی وصالِ عارضی کا مقام وہ ہے جہاں "زہرہ" (وینس) کی مدد سے "عاشق" "گلاب" کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد فراق کی واردات شروع ہو جاتی ہیں۔ "زبانِ خلق" اور "رشک" "خطرہ" ( ) کو ملامت کرتے ہیں کہ اس نے ادائی فرض میں کوتاہی کی وہ بہت سخت سخت گیر ہو جاتا ہے اور "گلاب" کے گرد ایک سخت حصار بنا دیا جاتا ہے۔ جس کے ایک برج

میں (   ) " خیال مہر " کو قید کر دیا جاتا ہے اور عاشق عالم فراق میں
یاس اور اضطراب کے شکنجوں میں جکڑا جاتا ہے " سب رس " میں " دل " کے گوٹ
ہجران میں قید ہو جانے کے بعد " غیر " اپنی حرکت پر پشیمان ہو کر " حسن " کو ایک خط لکھتی ہے
جس سے " حسن " پر " دل " کی بے گناہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ " حسن " " دل " کو ایک خط
لکھتی ہے جس کا " دل " جواب دیتا ہے۔ اس دوران میں " عشق " و " عقل " میں لڑائی
چھڑ جاتی ہے " ہمت " ہر طرح سے صلح کی تدبیریں کرتا ہے۔ آخر ان دونوں میں صلح ہو جاتی
ہے اور " عقل " اپنے بیٹے " دل " کی " عشق " کی بیٹی " حسن " سے شادی کر دیتا ہے۔
" رومان گل " میں بھی " عاشق " کو گلاب مل جاتی ہے۔ گویا دونوں مثالیوں میں تلاش
بالآخر کامیاب رہتی ہے۔ ان مثالیوں میں قصے کی رفتار کے مدارج یوں ہیں۔ (ا) طلب۔
(ب) وصال عارضی (ج) فراق (د) وصال حقیقی۔

کردار وجہی نے کرداروں کی پیشکشی میں نفسیاتی کیفیات کو بھی بہت اچھی طرح پیش کیا
ہے۔ اس کے ثبوت میں " حسن " اور " دل " کے کردار پیش کیے جا سکتے ہیں پہلے
" حسن " کی ظاہری صفات اس کے " عاشق " " دل " کی زبانی یوں کہلوائے ہیں۔ " حسن "
کی " خوبی " " محبوبی " کا ذکر تو بعد میں آئے گا۔ ظاہری حالت یہ ہے :

" مکھ مقبول ہے۔ متوالی آنکھ ہے۔ قبول صورت ناک ہے۔ نازک نرم
لعل ہونٹاں ہیں۔ مہندی رنگے ہاتاں ہیں۔ نباتاں جیسے دانتاں ہیں۔
ابلوج (مصری) جیسی باتاں ہیں۔ شرزی جیسی کمر ہے۔ گھونگروالے بال ہیں "۔ [1]

صفات " حسن " میں نسوانی صفت۔ یعنی " رشک " بہت ہے وہ " دل " کو غیر کے
ساتھ دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ ساتھ ہی عقلمند بھی ہے۔ " خوش طبع
اور خوش فام ہے [2] " چتر چوسار " خوش گفتار اور خوش رفتار ہے [3] شعر شاعری سے لگاؤ ہے [4]

---

[1] " سب رس " صفحہ ۲۷۸   [2] " سب رس " صفحہ ۹۰
[3] " سب رس " صفحہ ۸۵   [4] " سب رس " صفحہ ۹۲۔ شعر گفتن حسن از فرق دل

لکھ پڑھ سکتی ہے۔ ؎۱

دل : صاحب صورت صاحب جمال ہے۔ صاحب ہنر صاحب کمال ہے : ؎۲۔ آفتاب جیسا مون ہے۔ بادل جیسے باللن ہیں۔ چاند جیسے "گالان" ہیں :۔ شجاع اور بلند ہمت ہے۔ آب حیات نام سن کر وہ گھر کا عیش آرام چھوڑ کر تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ مشکلات سے نہیں ڈرتا۔ آخر اپنا مطلب حاصل کر لیتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں : مرد : کی فطرت کی کمزوری بھی موجود ہے یعنی وہ دھوکہ ہی میں سہی : غیر : کے دام میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اسے : حسن : سے بیحد محبت ہے۔

اس طرح وجہی کے ہاں مرد و عورت کے صحیح یا : حقیقی : کردار ملتے ہیں۔ جنھوں نے بعد میں : شعر : اور داستان میں اپنی ہیئت بالکل بدل دی ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے وجہی کی ہیروین : حسن : میں جہاں شرم وحیا ہے وہیں بیباکی اور جرات بھی ہے۔ اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نہیں کمزوریاں بھی ہیں مثلاً جب وہ : غیر : کو : دل : کے ساتھ دیکھتی ہے تو برداشت نہیں کر سکتی۔

اس کے علاوہ وجہی نے بہت سے معاشرتی پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ نہ صرف نظر ڈالی بلکہ ان خامیوں کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ مثلاً کثیر ازدواجی : کو وہ معاشرہ کی خرابی کا بڑا سبب سمجھتا ہے۔ دو شادیوں کی برائی اس سے سنیئے۔ :

: نہ من کا سواد نہ تن کا سواد سینہ جلتا دل میں تڑپھڑی۔ بیچ میں آئی ہے جاکر دوزخ میں پڑی کیا جانے کیا گناہ کی تھی۔ اول زمانہ میں جو جن آکر پڑی اس عذاب میں لانے سوکن جیو پر اٹھے سوکن جیو لیوے سوکن نے محبت میں فتنوی اٹھے۔ سوکن نے جڑیا دل ٹٹے سوکن آئی دکھ سے سینہ بٹھیا۔ سوکن آئی محبت کا اٹھیا۔ دایم جھگڑنتیاں۔ جلن بلیان

؎۱ سب رس صفحہ ۲۷۶ - "مکتوب حسن بہ دل" ؎۲ سب رس صفحہ ۲۲۱

لڑتیاں ادھر تے سالے ادھر تے سالیاں چاروں طرف تے برستیاں گالیاں۔
کوئی کنواں گرنی کوی بائین۔ گھر میں کھیلتیاں چائیں مائیں۔
سوکن کون دیکھنے کا کسے تاب جی گھر میں سوکن آئی وو گھر خراب سوکن
ادیکھی نپیج کی تقسیم داریوں جل کون سوے توبہ استغفار جن نے آسودگی کون
دسری عورت کیا۔ ان نے تیری اپس کون عذاب میں دیا۔ کیتی جاگا آپس
کون بانٹ بھاوے۔ یک دل دو جاگا کیوں لاوے۔ ایک سون توڑنا تو دسرے
سون جوڑنا جل تے دونوں سینا چاک یو بچارہ میانے میان ہلاک ایک
بولے دل ہور کہے ایک بار سک جیو کون لگائے تھا دو ٹھار ؎

اس کے علاوہ ؛ سب رس ؛ کی دوسری بڑی خصوصیت مصنف نے مجلسی تعلقات درباری آداب۔ اچھی زندگی کے لوازم۔ حیاتِ عشق کی تفسیریں سب کا بیان نہایت خوبی سے کیا ہے۔

عورت کا کردار

عورت کا کردار اس سے سنیئے :۔

عورت اسے کہتے ہیں جو مرد کے دل کون بہلاوے :۔
نہ مرد کا دل عورت نے واز ہو جائے پیار آتا ہے سوبی نہ آوے کھساٹیاں کا ناز
توبہ استغفر اللہ ایسے نازاں تھے جیو واز عورت نے مرد کا جیو پکڑے تو آسودگی
نہ دیکھیا اپنے تن کی خاطر رکھنا مرد کے من کی عورت میں مہر و محبت پیار اچھا۔
عورت چتر۔ چونسار اچھنا۔ عورت میں گفتار اچھنا۔ سواد سمجھن ہاری عورت
کان ہے۔ سب کن میں ساری عورت کان ہے۔

گو وجہی کے خیالات مرد اور عورت کے بارے میں رجعت پسندانہ ہیں لیکن ان میں بڑی صداقت ہے :

مرد کی حالت

اب سنیے کہ وجہی مرد کے بارے میں کیا کہتا ہے :

مرد کون کوئی سنبھال رک سکیلا ہے مرد آتش بھاقا مرد :۔

اپس تا موئیں عورت کی قید میں رہتا ہے۔ مرد ہزار جاگا جائے گا اسے کان کا
جھل اچھیگا۔ یوں جھل کھاتے پھرے تو لوگاں دیوانے کیتیں گے۔

شادی بیاہ کے طریقے

وجہی نے سماجی رسم و رواج کی بھی اچھی تصویر کشی کی ہے چنانچہ
شادی بیاہ کے بارے میں وہ کہتا ہے :

:- ڈیرے ٹھاریں ٹھار دیے۔ گھر سنوارے جاگا جا گا نقش نگارے۔ صدر
بچھائے۔ پاچے۔ رنبھا۔ ابی میکا پاتران آ کر ناچے۔ ٹھاریں ٹھار آرائش
کیے۔ دل سورج کا حسن چاند سوں جلوہ دے۔ ناز غمزہ اغوا۔ لطافت مہر چھند یو
یو چھندیاں مایاں۔ اس سورج پر اس چاند پر تارے وایاں۔ عالم سب ہور سات
دیس تے روشن ہوئی رات۔ مشتری تماشا دیکھنے آئی۔ زہرہ نے جلوہ گائی۔
:حسن : ہور : دل : کا عقد کیے۔ سب اہل مبارکباد دیئے سہلاں سوہلن
سیج سنوارے .... :-

عشق کی تفسیر

عشق کی تفسیر بہتوں نے کی۔ کسی نے زندگی کا لطف بتایا تو کسی نے سب
سے بڑا غم اس کی لذت وجہی سے سنیے۔

:- عاشقی حیران ہونے کی خاطر کرتے ہیں۔ عاشقی پریشان ہونے کی خاطر
کرتے ہیں۔ ہسنے ترسنے خاطر کرتے ہیں۔ عاشقی انکھیاں میں تے انجھواں
برسنے خاطر کرتے ہیں۔ فارسی میں ایک کون کنے پوچھیا کہ عشق کیا ہے کچھ مار
دم۔ ان نے کہیا سوختم۔ سوختم۔ سوختم۔

عاشق ہے تو عاشقیت پچھان ہزار جمعیت اس عشق کی پریشانی پر
قربان اگر عشق کی لذت کسے یاد ہے تو ایک ساعت کے رونے میں عالم عالم
کا سواد ہے۔ کس آرام میں اس بے تابی کا راحت ہے۔ کس آسودگی میں اس
محنت کا فراغت ہے۔ تنہا ترسنا لگیا سواد۔ تانا دل پکڑیا مجنوں۔
عشق عاجز۔ عشق توانا۔ عشق دلنا۔ عشق دیوانا۔ عشق اپنے رنگ میں

آپی گھلنا۔ عشق اپس پر آپ جلنا۔ عشق کے چالے کون نبھائے۔ عشق چند
عشق بھان۔ عشق دین۔ عشق ایمان۔ عشق حاکم۔ عشق سلطان۔

بعض اور امور پر بھی یہ کتاب بالواسطہ روشنی ڈالتی ہے۔ مثلاً اس نے پہلی مرتبہ اُردو اور برج بھاشا کا فرق واضح کیا۔ اُردو کو وہ ہندی یا زبان ہندوستان کہتا ہے۔ اور برج کو گوالیاری یعنی ایک مخصوص خطہ کی زبان سمجھتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مغلیہ عہد کے مصنفین ابو الفضل عبد الحمید لاہوری۔ محمد صالح بلکہ خان آرزو تک برج کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔ وجہی ان دونوں زبانوں سے دوہرے اور کہاوتیں نقل کرتا ہے ایک جگہ وجہی نے خسرو مندرجہ ذیل دوہرا بھی لکھا ہے۔

پنکھا ہو کر مین ڈلی ساتی تیرا چاؤ
منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ [۱]

اسلوب مواد سے قطع نظر اسلوب پر نظر ڈالیے تو "کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است" کے مصداق ہے۔ "سب رس" اور "قصہ حسن و دل" (جہاں سے اس نے قصہ مستعار لیا) کے تتبع میں اس نے مسجع و مقفیٰ عبارت میں پورا قصہ لکھا ہے۔ روانی میں کہیں فرق آنے پاتا۔ عموماً مقفیٰ اور مسجع طرز کی خامی یہ ہوتی ہے کہ اس میں "آمد" نہیں ہوتی۔ آورد کی وجہ سے تکلف پایا جاتا ہے۔ وجہی کے اسلوب یہ عیب مفقود ہے۔ اس کے مسجع و مقفیٰ جملوں میں "آمد" ہے۔ ملاحظہ ہو:

"عشق میں بدنامی جوں کھانے میں نمک۔ جوں دیوے میں جھمک جوں محبوب میں ٹھمک۔ عشق کا یہی ہے نشان بچارا جیتا پنہاں کرتے جاوے اتنا ہووے آشکار سب کا حال ظاہر ہو آیا کون عاشق وہ جو عشق کو چھپایا"۔

وجہی کی دوسری خصوصیت بقول پروفیسر سروری [۲] "وہ فقروں میں مستزاد کا جوڑ لگاتا ہے"

---

[۱] سب رس، صفحہ ۲۱۸

[۲] تقریر: "قدیم کلاسیکی ادب کا ایک بے مثل نمونہ" نشر گاہ حیدر آباد۔

مثلاً : اس نور کی خبر کسے معلوم نیں۔ مفہوم نیں۔ جو کوئی مومن مسلمان ہے اس بات تے اس کا دل شاد ہے۔ یو دانایاں کون ارشاد ہے۔ انسان کون صورت ہے نیں۔ تحقیق جانتا ایک اپے رب العالمین :

مناظر کی بھی وجہی کے ہاں بڑی اچھی تفصیلات ملتی ہیں مثلاً : سب رس : میں : دل : کی شادی کا سین [1]۔ ایک موقع پر صبح کا منظر اس طرح کھینچتا ہے :

: القصہ کتیک وقت کون سورج نے سر کاڈیا آسمان کا پردا پھاڑیا اجالا سنچریا اٹھاریں ٹھار۔ روشن ہوا سب سنسار۔ اجھوں دیس چڑیا نیں پا دگھڑی جو صباح پڑی اس قلعہ کے دیدبان نے دیکھیا :۔ [2]

وجہی کی اسلوب کی ایک اور خصوصیت الفاظ کا برموقع استعمال ہے۔ اس کا یہ رنگ دورِ حاضر میں صرف نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار کے ہاں ملتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ فقروں کے پرے کے پرے جماتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً

: ناموس بادشاہ انو کون دیکھتیچ مال ملک سب چھوڑیا کچھ لوڑیا۔ قلندر ہوا سمندر ہوا۔ فقیر ہوا بے تدبیر ہوا۔ اسیر ہوا۔ غم کے ہات میں سنپڑیا۔ ناموس نے عشق میں ناموس گنوایا۔ لکھیا تھا سو انپڑیا :۔ [3]

مصنف کی دوسری زبانوں کے ادب سے واقفیت اور عام زندگی کے تجربہ نے اس کو اس بات کا اہل بنا دیا ہے کہ زندگی کے اخلاقی و معاشی مسایل فضایل و رذایل۔ معائب اور اوصاف پر خاص طریقہ سے رائے زنی کر سکے۔ اس تعلق میں وہ آیات کلام پاک احادیث و اقوال اساتذہ کے اشعار اور دیگر مختلف زبانوں کے امثال کے برمحل استعمال سے کتاب کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی طرف سے بھی پاکیزہ خیالات اور چست فقرات کا اضافہ کرتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو مقالہ ہذا صفحہ ( )

[2] " سب رس " صفحہ (۱۷۵)

[3] " سب رس " صفحہ (۱۷۷)

عربی اقوال کا استعمال ملاحظہ ہو :

۱۔ دانایاں ہیں یو چلی ہے بات : العقل نصف الکرامات :
۲۔ مرتضیٰ فرماتے ہیں جنو کی بات دایم قایم : عرفت ربی بہ فسخ العزایم :
۳۔ صبوری تے دنیا صبوری تے دین مصحف کی آیت ہے : ان اللہ مع الصابرین :
۴۔ بڑن رقعہ دیا جیو کے ہات : کتابت کتے آدھا ملاقات : المکتوب نصف ملاقات : [1]

وہ فارسی ضرب المثال بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے ۔ :

۱۔ مردی و نامردی ایک قدم ہے : مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد [2]
۲۔ اس بات پر یو بات آئی کہ علت جاتی ولے عادت نین جاتی۔
: علت می رود ولے عادت نمی رود : [3]
۳۔ جس نے لہوا ہات پکڑیا اس کی دایم پیش بازی۔
: ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند : [4]

وجہی نے بعض جگہ حسب ضرورت مصادر فارسی سے ڈھالے ہیں جیسے تلاشیدن سے تلاشنا، فہمیدن سے فامنا مثلاً

: یو بات دانش کا معما اس بات کون فمنا کون : [5]
نگاریدن سے نگارنا اور اندیشیدن سے اندیشنا بھی قابل ذکر ہے ۔
: یو کام اندیشنے ہیں سو کرنا گھر سنوارے جاگا جاگا نقش نگارے : [6]

---

[1] : سب رس : صفحہ ۲۷۶
[2] : سب رس : صفحہ ۱۷
[3] : سب رس : صفحہ ۴۵
[4] : سب رس : صفحہ ۱۵۴
[5] : سب رس : صفحہ ۱۵۰
[6] : سب رس : صفحہ ۱۹۶

اس طرح ؛ مواد ؛ اور ؛ اسلوب ؛ ہر اعتبار سے ؛ سب رس ؛ دورِ قدیم کا بے مثل کارنامہ ہے وجہی نے تمثیل کے پیرایے میں جو ؛ کتاب سب رس ؛ کو ؛ دل ؛ کا بیٹا بنا کر اپنے وقت کا لقمان و افلاطون اپنے وقت کا ؛ خسرو ؛ اور فرہاد و مجنوں بنایا وہ چنداں غلط نہیں تھا۔

وجہی کی قادر الکلامی اور اس کے کارنامے بعد لکھنے والوں کے لیے آدرش بن گیے تھے۔ مثال کے لیے طبعی کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس نے ۱۰۸۱ھ میں اپنی مثنوی ؛ بہرام و گل اندام ؛ لکھی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وجہی اپنے پیشرو اساتذہ فیروز۔ محمود [۱] وغیرہ کا ذکر اپنے نصب العینی شاعروں کے طور پر کرتا ہے۔ طبعی نے بھی وجہی کو وہی درجہ دیا ہے۔ طبعی کے اشعار حسب ذیل ہیں :

؛ لگیا میں جو یو مثنوی بولنے — یو موتیاں نجل ڈھال یو رولنے
یو وجہی میرے خواب میں آئے کر — مکھ اپنا سونا دکھلائے کر
سراسر سنیا جو میری مثنوی — کیا بات طبعی ہے میری نوی
ہو خوش حال یو سنکر باتاں میرے — آپس کے لیے ہاتان میں ہاتاں میرے ؛ [۲]

---

[۱] وجہی نے اپنی مثنوی ؛ قطب مشتری ؛ میں فیروز اور محمود کا ذکر کیا تھا کہ انھوں نے اس کے خواب میں آکر اسے بشارت دی تھی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگریزی ادب میں بھی کم و بیش اسی زمانے میں اکثر شاعروں نے اپنے رزمیہ نظموں میں اپنے پیشرو شاعروں کے خواب میں آنے کا تذکرہ کیا ہے۔

[۲] دیباچہ ؛ بہرام و گل اندام ؛ منقول از اُردو شہ پارے ؛ صفحہ (۸۸)

قدیم زبانوں کے ترجمے

مشرق میں قصہ گوئی ۔ قصوں کی ماخذ سنسکرت زبان ۔ طوطی نامہ: (شکا ست تتی)۔ : طوطی نامہ: کے فارسی خلاصے نخشبی ابوالفضل علامی ۔ سید محمد قادری ۔ مختلف اردو ترجمے :طوطی نامہ ابوالفضل: کے مترجم کے بارے میں غلط فہمیاں ابن نشاطی کا ترجمہ ۔ ملا سید محمد قادری کا طوطی نامہ ــــ عبارت کے نمونے طوطی نامہ اور اس کی تکنک ۔ سنگھاسن بتیسی: ملک زمان و کلام کندلا ۔: کام ردپ و کام لتا: : قصۂ جنگ امیر حمزہ : طلسم ہوشربا : گل ہرمز انارانی: :نوطرز مرصع :۔ : نو طرزِ مرصع کا اسلوب :۔ :بہار دانش: :نگار دانش : اور :مفرح القلوب :۔: دلبر و مہر افروز :۔ : چار چمن :ــــ :گلستاں:

۹
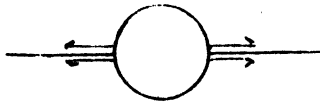
قدیم زبانوں کے ترجمے

قدیم دور میں مشرق داستان طرازی اور تخیل کی فلک پیمائیوں میں مغرب سے بہت آگے رہا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب : دنیائے افسانہ : میں لکھتے ہیں :

: مغرب نے مشرق سے قصہ نویسی کا فن سیکھا : [۱]

اس حقیقت کا اعتراف اکثر مغربی مصنفین اور مولفین نے کیا ہے۔ ڈاکٹر مس آمنہ پوپ اپنے مقالہ : انڈیا اِن پورچگیز لٹریچر : میں لکھتی ہیں۔ :

: (Mofina Mendis) پرتگال کی ایک مقبول داستان ہے یہ دراصل سنسکرت کی : پنج تنتر : یعنے : حکایات کلیلہ و دمنہ : سے متاثر ہے۔ اس میں : انوارِ سہیلی : والی تکنک یعنے قصہ در قصہ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے دیگر یوروپین زبانوں میں بھی یہ طرز مقبول ہوا : [۲]

یہ ایک حقیقت ہے کہ عربی۔ فارسی۔ اور سنسکرت زبانوں میں ایسے عظیم الشان قصے لکھے گیے اور اتنے مقبول و محبوب ہوئے کہ آج وہ عالمی کلاسیکی ادب میں شامل ہیں۔ اور دنیا کی تمام مشہور زبانوں میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ عربی اور فارسی سے بھی زیادہ سنسکرت ادب اپنے قصوں کی نوعیت اور ان کی خصوصیات کے سبب دنیا کی اکثر زبانوں کے قصوں کے لیے محرک یا ماخذ کا کام دیتا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عربی اور فارسی کے مصنفین نے سنسکرت سے

---

[۱] : دنیا افسانہ : صفحہ ( )
[۲] : انڈیا اِن پورچگیز لٹریچر : صفحہ ( )

ماخوذ ان قصوں میں ایسی رنگا رنگی اور دل فریبی پیدا کردی کہ وہ ایک نئے روپ میں ڈھل گیے۔ عربی اور فارسی کے مصنفین نے ان قصوں کو اس طرح اپنایا کہ ان کی اصل عربی اور فارسی ہی سمجھی جانے لگی۔ اس کی نمایاں مثال: انوارِ سہیلی ؛ اور ؛ طوطی نامہ ؛ وغیرہ کی حکایات ہیں۔

قدیم کہانیوں اور قصوں میں مندرجہ ذیل بہت مشہور اور کم و بیش ؛ کلاسکی ادب ؛ کا رتبہ حاصل کر چکے ہیں ؛

۱۔ ؛ انوارِ سہیلی ؛ (پنچ تنتر) ۲۔ ؛ طوطی نامہ ؛ (شک سپ تتی) ۔

۳۔ ؛ سنگھاسن بتیسی ؛ ۴۔ ؛ الف لیلیٰ ؛ ۵۔ ؛ گلستان ؛۔

۶۔ ؛ عشقیہ افسانے جیسے ؛ لیلیٰ مجنوں ؛ ؛ شیریں فرہاد ؛ ؛ یوسف زلیخا ؛ وغیرہ۔

اُردو کے قدیم دور میں ان قصوں میں سے بعض کے ترجمے کیے گیے۔ ابھی تک عام خیال یہ تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل کا زمانہ نثری ادب کے اعتبار سے زیادہ زرخیز نہیں رہا۔ لیکن میری دسترس جس مواد تک ہو سکی ہے اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قیاس صحیح نہیں تھا۔ قدیم اُردو میں نہ صرف قصوں کے ترجمے ہی کیے گیے بلکہ طبع زاد قصے بھی لکھے گیے ہیں۔ مترجم افسانوں میں ؛ طوطی نامہ ؛ کا نام اہم ہے جس کے بعد میں بھی کئی ترجمے اور خلاصے کیے گیے۔

طوطی نامہ

؛ طوطی نامہ ؛ کا ماخذ سنسکرت زبان کی کتاب ؛ شک سپ تتی ؛ (یعنے طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں) ہے۔ یہ قدیم زمانے کی ایک مقبول اور مشہور داستان تھی۔ اُردو میں اس کی کہانیاں کئی دفعہ لکھی گئیں نظم میں بھی اور نثر میں بھی نظم میں غواصی کا ؛ طوطی نامہ ؛ مشہور ہے اور نثر میں حیدر بخش حیدری کی ؛ طوطا کہانی ؛ کے بارے میں ہماری معلومات مکمل ہیں لیکن اس کے علاوہ اس کے تین اور نثری ترجمے ملتے ہیں۔ جن میں سے ایک ترجمہ[۱] سنہ ۱۲۱۴ ہجری کے بعد کا ہے۔ اور اس مقالے کے موضوع سے خارج ہے اس سے پہلے کے دو نثری ترجموں میں سے ایک کا مخطوطہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ[۲] میں محفوظ ہے۔ اور دوسرا

---

[۱] : تذکرہ اُردو مخطوطات ، جلد اول صفحہ ( )

[۲] : فہرست اُردو مخطوطات ؛ جامعہ عثمانیہ صفحہ ( )

برٹش میوزیم[1] میں لیکن جس طرح سنسکرت کے "طوطی نامہ" کے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح موخرالذکر دونوں نثری ترجموں کے لکھنے والوں کا پتہ نہیں چلتا۔ اصل سنسکرت تصنیف کے بارے میں پروفیسر وی۔ وارد ھاچاری اپنی کتاب "سنسکرت ادب کی تاریخ" میں لکھتے ہیں :

"یہ تصنیف جس کے مصنف اور تاریخ تصنیف کا پتہ نہ چل سکا۔ طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیوں پر مشتمل ہے جو وہ اپنی مالکہ کو بدراہ ہونے سے بچانے کی خاطر ہر رات کہتا جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ آٹھویں صدی ہجری یعنے چودھویں صدی عیسوی میں فارسی میں بھی ہوا۔"

مشہور جینی عالم ہیم چندر کے عہد تک یہ کتاب تصنیف ہو چکی تھی کیونکہ اس نے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وہ ۱۰۰۰ء کے قبل کی تصنیف ہے"۔[2]

فارسی میں بھی "طوطا کہانی" کو کئی مصنفین نے لکھا۔ ان میں ایک ضیاالدین نخشبی[3] کا ترجمہ بھی ہے جس کے بارے میں حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں :

"مولانا ضیاءالدین نخشبی نے ان ستر کہانیوں میں سے باون کہانیوں کا انتخاب کر کے فارسی میں ان کا ترجمہ کیا ہے یہ ترجمہ ۷۳۰ھ میں تمام ہوا"۔[4]

ضیاءالدین نخشبی کی زبان مشکل تھی۔ اس وجہ سے فارسی میں اس کے متعدد خلاصے لکھے گیے۔ شیخ ابوالفضل علامی نے اکبر کے حکم سے دسویں صدی ہجری کے وسط میں اس کا سلیس اور آسان فارسی میں خلاصہ کیا۔ ابوالفضل کے خلاصہ کا ترجمہ اردو میں بھی کیا گیا تھا جو

---

[1] کیٹلاگ مرتبہ بلوم ہارٹ نمبر (۱۰۵۸۹) نیز "یوروپ میں دکنی مخطوطات"
[2] "ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" از وی۔ وارد ھاچاری صفحہ ۱۲۶
[3] رسالہ "مخزن" بابتہ جولائی ۱۹۰۱ء
[4] "اردوئے قدیم" صفحہ ۱۲۴۔

اصل خلاصہ کے ساتھ لکھا ہوا مخطوطے کی شکل میں برٹش میوزیم[1] میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ اس مقالے کے تعلق سے بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس پر آگے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ابوالفضل کے بعد ملّا سیّد محمد قادری نے مولانا نخشبی کی باون حکایات میں سے پینتیس ۳۵ کا انتخاب کر کے گیارہویں صدی ہجری میں فارسی روزمرہ میں لکھا۔ یہ خلاصہ بھی "طوطی نامہ" کے نام سے مشہور ہے اور عام طور پر ملتا ہے۔ لیکن ابوالفضل علامی کا خلاصہ اب کمیاب ہے۔

اُردو میں نخشبی اور سیّد محمد قادری کی کتابوں کے ترجمے نظم اور نثر دونوں میں ہوئے۔ دکھنی نظم میں غواصی کا "طوطی نامہ" مشہور ہے۔ برٹش میوزیم اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں مخزونہ ترجمے فورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے نسخے پر "قدیم دکھنی اُردو" لکھا ہوا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے :

"دکھنی ترجمہ آج سے دو سو سال پہلے کی اُردو کا نمونہ ہے۔ مولانا آزاد نے نثر اُردو میں سب سے پہلے ۱۱۴۵ھ کی تحریر کردہ فضلی کی "دہ مجلس" بتائی ہے۔ یہ ترجمہ "دہ مجلس" سے پہلے کا ہے۔ یعنی ۱۱۴۲ھ کا۔"

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کا یہ مخطوطہ سیّد محمد قادری کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

برٹش میوزیم کے مخطوطے پر کوئی سنہ درج نہیں لیکن جیسا کہ کیٹیلاگ کے مرتب کے وضاحتی نوٹ سے پتہ چلتا ہے۔ یہ قدیم دکھنی اُردو میں لکھا ہوا ہے۔ مرتب کیٹیلاگ بلوم ہارٹ نے لکھا ہے :

"طوطی نامہ" یا طوطے کی کہانی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے۔ اصل مخطوطہ ابوالفضل کا اختصار ہے۔ جو نخشبی کے "طوطی نامہ" سے کیا گیا تھا۔ دکھنی ترجمہ پوری کتاب کا نہیں ہے۔ بلکہ سو صفحات تک چھتیسویں حکایت تک ہوا ہے۔ اس دکھنی مترجم کا نام نہیں معلوم ہوتا۔ ایک اور دکھنی ترجمہ غواصی نے کیا ہے"۔[1]

---

[1] کیٹیلاگ برٹش میوزیم مخطوطہ (۱۰۵۸۹)

برٹش میوزیم کے "طوطی نامہ" کی زبان بھی گیارھویں صدی ہجری کی زبان سے بہت قریب اور ملتی جلتی ہے۔ اس طرح ان دونوں نثری ترجموں کے زمانہ کا تعین ہو جانے کے بعد ایک اور مسئلہ مترجم کا حل طلب رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں میرے خیال میں مندرجہ ذیل چند امور غور طلب ہیں:

گارساں دتاسی[1]۔ اسٹیوارٹ[2]۔ اور حکیم شمس اللہ قادری[3] نے لکھا ہے کہ ابن نشاطی نے "طوطی نامہ" کے نام سے بھی ایک مثنوی لکھی تھی لیکن ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری کو اس بیان سے اتفاق نہیں۔ چنانچہ "اُردو شہ پارے" میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"عام طور پر مشہور ہے کہ ابن نشاطی ایک اور منظوم "طوطی نامہ" کا بھی مصنف ہے۔ مگر راقم الحروف کو اس کے ماننے میں تردد ہے اور کوئی ثبوت ایسا نہیں جس سے "طوطی نامہ" کو ابن نشاطی کی تصنیف تسلیم کر لیا جائے"[4]

پروفیسر سروری جنھوں نے ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کو ایک بسیط مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شایع کیا ہے لکھتے ہیں:

"اگر ہم دی تاسی کے قیاس کے بموجب ۱۰۶۹ھ کے "طوطی نامہ" کو ابن نشاطی کی تصنیف مان لیں تو خود ابن نشاطی کے اس بیان کی تکذیب ہوتی ہے جو اس نے "پھول بن" کے خاتمہ کے اشعار میں دیا ہے کہ میں نے اس سے پہلے کوئی نظم نہیں لکھی۔ دنیا پر اپنا جوہر طبع ظاہر کرنے کے خیال سے ایک نمونہ پیش کیا ہے"[5]

---

[1]: ہسٹری دی لٹریچر ہندوستانی: جلد اول صفحہ ۲۵۶
[2]: فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان: مطبوعہ سنہ ۱۸۰۲ء صفحہ (۱۸۰)
[3]: اُردوئے قدیم: صفحہ (۶۹) [4]: اُردو شہ پارے: صفحہ (۱۰۹)
[5]: مثنوی "پھول بن" سلسلہ یوسفیہ شمارہ (۳)

اس کی تائید "پھول بن" کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے جن میں ابن نشاطی نے صاف طور پر بتایا ہے کہ اسے شاعری سے زیادہ رغبت نہیں اور صرف ایک نمونہ اپنے کمال فن کا دکھانے کے لیے یہ مثنوی لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے :

منجے گر شعر پر رغبت جو اچھتا
ہزاراں سونچ بیتاں لکھ کو اچھتا

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم بات، وہ یہ بھی لکھتا ہے اس کو ہمیشہ انشا سے رغبت رہی۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوگا :

ہے انشا پو میرا میل دایم
طبیعت کون مری ہے خط ملایم

مندرجہ بالا بیانات سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔

۱۔ "پھول بن" جو ۱۰۶۹ھ کی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے ابن نشاطی نے کوئی نظم نہیں لکھی۔

۱۰۴۹ھ کا "طوطی نامہ" جو نظم میں ہے اس کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی انشا پردازی کے کارناموں کا کیا حشر ہوا۔ اس سلسلے میں شاید گارساں دتاسی۔ اور اسٹیوآرٹ کے بیانات سے ہماری رہبری ہو سکتی ہے۔ کیا یہ "طوطی نامہ" جس کا ذکر مذکورہ بالا دونوں علماء نے کیا ہے۔ برٹش میوزیم کا محولہ بالا نثری "طوطی نامہ" تو نہیں ہے؟ جسے دتاسی اور اسٹیوآرٹ نے غواصی کے منظوم "طوطی نامہ" کے اشتباہ سے منظوم لکھ دیا۔

گارساں دتاسی اپنی تاریخ ادب اُردو میں لکھتا ہے :

"اسی مصنف (ابن نشاطی) کی ایک اور تصنیف بھی ہے۔ جس کا نام "طوطی نامہ" ہے۔ اس قسم کے قصے اہلِ ہند کو بہت مرغوب ہیں یہ مثنوی ۱۰۴۹ھ میں تصنیف کی گئی ہے"۔

لیکن آگے چل کر وہ لکھتا ہے :

دکھنی زبان میں نخشبی کی فارسی تصنیف کی، نقل، اتاری گئی ہے۔
۱۰۴۹ھ میں ابن نشاطی کے معاصر غواصی نے، طوطی نامہ، منظوم لکھا تھا۔ اسی لئے محققین کی رائے ہیں: طوطی نامہ، جو ابن نشاطی کے کارنامہ میں شمار کیا جاتا ہے ابن نشاطی کا نہیں غواصی کا ہے۔

میرا قیاس یہ ہے کہ غواصی نے، طوطی نامہ، کو منظوم کیا تھا اور ابن نشاطی نے اسے نثر میں لکھا تھا۔ ممکن ہے کتب خانہ ٹیپو سلطان کے مخطوطات کی فہرست کے مرتب اسٹیوارٹ کو نامو کی یکسانیت کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہو۔ اس قیاس کو دتاسی کے اس بیان سے اور تقویت ہوتی ہے کہ وہ ابن نشاطی کے، طوطی نامہ، کو نخشبی کے، طوطی نامہ، کی نقل، (IMITA-TION) کہتا ہے اور نخشبی کا، طوطی نامہ، نظم میں نہیں نثر میں ہے۔

ابن نشاطی نے، پھول بن، ۱۰۶۶ھ میں لکھی۔ گو اس کے صحیح سنہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ پروفیسر سروری نے اس کا ۱۰۷۶ھ بتایا ہے [۱]۔ تاہم ۱۰۶۶ھ ہو یا ۱۰۷۶ھ دونوں بھی: طوطی نامہ، کے سنہ تصنیف ۱۰۴۹ھ کے بعد کے نہیں ہیں اور ابن نشاطی نے، پھول بن، میں صاف طور پر بتایا ہے کہ، پھول بن، اس کا پہلا کارنامہ ہے اور اس سے پہلے وہ انشا پردازی کی طرف مائل رہا ہے۔

ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ ابن نشاطی کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا۔ اس کی مثنوی، پھول بن، بھی ایک فارسی تصنیف، بساتین، ہی کا ترجمہ ہے۔ ، پھول بن، میں اس نے اپنی فارسی میں مہارت اور ترجمہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

: تجھے ہے فارسی میں دستگاہ آج   نہ کر سے ترجمہ بھی کوئی تجہ باج
تجھے معلوم ہے سارے صنائع   نکو اوقات کر تو اپنا ضائع:

ابن نشاطی کی فارسی مہارت اس کے انشا پردازی کے ذوق، اور اسٹیوارٹ

---

[۱] یورپ میں دکھنی مخطوطات: صفحہ ۵۶۵ و ۵۶۶

اور گارساں دتاسی کے اشاروں سے شاید یہی مستنبط ہوتا ہے کہ ابوالفضل کے فارسی "طوطی نامہ" کا دکھنی نثر میں ترجمہ غالباً ابن نشاطی کا ہوگا۔ اسٹیوارٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن نشاطی کا "طوطی نامہ" اس کی مثنوی "پھول بن" کے ساتھ مجلد تھا۔ ذیل میں "طوطی نامہ" (زبرنشش نویم) سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔ :

: پچھے سین تعریف صاحب زمانہ کے اور زمین کے یعنی خدائے کے تعریف کے بعد از اور پچھے سین تعریف صاحب جان اور تن پیدا کرنے ہارے کے

جس سے آگے یہ مضمون ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالفضل کے خلاصہ کا ترجمہ ہے۔

: چلنے ہارے بہے راہ بندگی کو یعنے بندگی رکھنے ہارے کو وہ کون ابوالفضل بیٹا شیخ مبارک کا اوس کی تین پاک حکم بادشاہ جاری ہونے کے پایا۔ یعنی بادشاہ حکم فرمایا کہ یہ کتاب کتیں یعنے طوطے نامہ کو سات عبارت تازی کے سات روشن تھوری عبارت کے نقش ترتیب کا دیوے یعنی مختصر عبارت سین بناوئے ۔ [۱]

جیسا کہ ڈاکٹر زور نے "شہ پارے" میں لکھا ہے۔ اس کا رسم الخط بھی عجیب ہے یعنی "ڑ" اور "ڈ" کو ہمیشہ "ر" اور "د" ہی لکھا گیا ہے۔ ترجمہ تحت اللفظ ہے جس سے پیچیدگی بھی پیدا ہوگئی ہے چھٹی کہانی کا اقتباس دیکھیے :

: نقل چھٹی سنار اور برائی کی اور پرہیزگار اور درزی کی۔ اور صورت لکڑی کی اور عاشق ہونا سات عاشقاں کا اوپر اس صورت کے اور جانا ان سات عاشقاں پیکر چوب کا آگو جہار کے اور بے نصیب رہنا وہ سب عاشقاں کا۔
جب ستارا برا (یعنی آفتاب) طرف مغرب کے دوبیا اور اندھارا رات کا میدان جہان کے تین کالا کیا خجستہ واسطے طلب کرنے رخصت کے دوریا طوطی کے گی طوطی بولی کب تک عاشق کے نین بیچہ جلن کے

---

[۱] : یورپ میں دکھنی مخطوطات : صفحہ ۵۶۵ و ۵۶۶

چاہے گی تو ان دیکھنے جلا پا (یعنے ملاقات کر) ایسا نہ ہوئے کہ خبر مرد کو تیرے پہنچے۔ اور میرے تیں مانند جوڑ جھاڑ کے کاٹے۔ اور توں مانند سات یار کے محروم رہے۔ خجستہ پوچھی کیونکر تھی وہ نقل طوطی بولی ....

ڈاکٹر زور نے ؛ اُردو شہ پارے ؛ میں اس کا کچھ اور اقتباس دیا ہے۔ جو یہاں نقل کیا جاتا ہے :-

بڑائی اور سنار درزی پرہیز گاری مسافری کو نکلے اور ایک رات بیچ جنگل دہشت بھرے کے ہوئے کے پتا با گاں کا ڈر سین اس جنگل کے پانی ہوتا تھا۔ یکایک اپنا اس جاگا میں پڑیا (یعنی ہوا) وہ چاروں یار مصلحت کرے کہ ہم ہر ایک موافق باری کے یکایک پہر نگہبانی کرے اول بڑائی جاگتا تھا۔ لکڑی ایک بیچ نہایت بیتری کے چھلیا (یعنی اچھی صورت بنایا) اور پھر دو گھڑی سنار اس صورت کے تیں زیور سین سنواریا۔ تیسری پہری میں درزی اس کے تیں سات لباس کے زینت وار کیا۔ چوتھی پہری میں زاہد مون عاجزی کا طرف قبلہ کے لایا دعا کیا اور جان بدن بیچ اس کے پھوکے گیا ہوا۔ جب جاگا قبول کیا گیا تاریکی کا (یعنے آفتاب) آیکی میں تھا سوڈیرے سین کالی رات کے نکل کر سات قصد عالم روشن کرتے۔ منزل ناپنے ہارا آسمان کا ہوا۔ ہر ایک کوئی یعنی ان چاروں یار سین ہر ایک یار جنگل لڑائی کا بیچ دامن ایک ایک دوسرے کے مارے (یعنی ہر ہر شخص وہ عورت کوں اپنے لیوں گا بولتا تھا) بعد از لڑائی بہوت قرار پایا کہ اوپر سر راہ کے کھڑے رہیں انس (یعنی سب مل کر راستہ پو کھڑے رہنا) کوئی ایک کے اول پونچا اس سین فیصلہ قضیہ کا طلب کریں اد نو سات اس نیت کے اوپر سر راہ کے کھڑے رہے۔ مسافر ایک پونچیا او اوپر لڑائی کی کیفیت کے خبردار ہوا۔ جلدی جنگل دشمنی کا اور لڑائی بیچہ دامن ان چار یار کے ماریا کہ غیرت میری کے تیں تم چاروں ڈانکل پڑ کر (یعنی واہ نئی کر کر)

لے گیے ہیں۔ آگو کوتوال کے آو تو کیا انصاف بولتا ہے۔ آگو کوتوال کے گیے۔
کوتوال بھی عاشق اس صورت کا ہوا اور بولیا ہے عورت بھائی سین میری
ہے۔ (یعنی میرے بھائی کی عورت ہے) تمیں بیچ فلانی جاگا کے لوٹ
لے گیے ہیں۔ عورت کے تین پایا میں حال اس کے تین جواب بولو (یعنے
میرے بھائی کا مال دیو) وہ کوتوال آگو بادشاہ کے لیے گیا اور داد چاہا۔ بادشاہ
اس وقت باندے گیا زلف کے سر بچے اس ہوا (یعنی بادشاہ بھی عاشق اس
کا ہوا) عالم ایک واسطے تماشا کے جمع آوے۔ اور انصاف قضیہ کے تین بوڑے
ایک جہاں دیدہ سے چاہے وہ بوڑا بولیا چالیس کوس اس شہر سین جھاڑ حکم کرنے
ہارا کر کر نام جھاڑ ایک کا ہے۔ قضیہ نین فیصل ہونے ہارا اس جاگا فیصل پاتا ہے۔
اس جاگا جاؤ تمیں۔ تمام لوگ دعویٰ کرنے ہارے اس عورت کے نزدیک اس جھاڑ
کے پہونچے اور مدعا اپنا ظاہر کرے۔ انتظار سخن نادر غیب کا رکھے (یعنے نادر
بات غیب سے کیا آتی ہے سو انتظار کرے) پیچہ اس نیچے کے (یعنی بیسے میں پیڑ
جھاڑ کی چیرے گئی اور عورت بیچ جھاڑ کے اندر آئی اور دڑا ڈل گئی۔ اور پاتال
سین جھاڑ کے آواز یہ آیا کہ تمام چیز رجوع کرتی ہے طرف اصل اپنے یعنی وہ
تصویر لکڑی سین ہوئی تھیں آخر پھر لکڑی میں مل گئی، تمام دعویٰ کرنے ہارے
نا امید ہوئے اور پھر گئے۔ اے خجستہ تو بھی سات جلدی کے اس محبوب کے تین پا
خجستہ چاہی ویسا کرے یعنی جاوے۔ آفتاب نکل آیا قصد جانے کا اس کا
موقوف ہوا ::

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں مخزونہ: طوطی نامہ: کا ماخذ ابوالفضل علامی کا خلاصہ نہیں بلکہ سید
محمد قادری کا خلاصہ ہے۔ جو گیارھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ مترجم خود کہتا ہے۔ :

:: واسطے معلوم ہونے تمام لوگاں کو ان محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ
مرتبہ اوں کا بیچہ عبارت سلیس و آسان کے بلی ہوئی اور پر خطاں کی ہوے در روز محو

جواب وسوال کہ دولت مند انکتیں لایق ہوے لکھے ہیں۔ایک داستان وہ
داستان سے یو ہے ؛

اس مخطوطہ کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے :

: پچھے سین طرح طرح صفت وثنا پیدا کرنے زمین آسمان کے کیفیت
وحقیقت یو ہے کہ داستان قصہ ہا وحکایات حضرت نخشبی کہ بیچہ طوطی نامہ
کے عبارت سخت ودقیق کے لکھے ہیں سکیتیں مفصل وبیان واز واسطے
معلوم ہونے تمام لوکاں کوں محمد قادری نیک کرے مرتبہ اونو کا سینچہ عبارت
سلیس وآسان کے کہ ملی ہوئی اوپر عبارت خطاں کی ہو وی وہ روزمرہ جواب
وسوال کہ دولت مند انکتیں لایق ہوئی لکھے ہیں ایک داستان وداستان سے
یو ہے۔

قصۂ اول در پیدایش وعاشق شدن برجستہ

ایک دولت مند اگو کے احمد سلطان نام رکتا تھا۔بھوت مال ومتاع و
بھوت لشکر وکھوڑے ایک ہزار پانچ صد ہاتی وسوا وتنان بوجا اوٹھانے ہاری
اس کے نزدیک حاضر تھے لیکن اس کو اولیا دنین تھا۔وہ ہمیشہ خدمت میں
خدا پرستاں کے جاتا۔وصبح وشام واسطے اولیاد کے دعا منگتا اتا۔پچھے کتیک
روز کے اوس پادشاہ نین ایک لرکا خوبصورت وآفتاب چہرہ وہ ماہ جبین
اسکتیں بخشیا۔تب او پادشاہ اس خوشی سون شگفتہ دل ہوکر کتے ہزار روپیہ
درویشاں وفقیراں کو خیرات کیا اور تین مہینے تک وزیران وامیراں ودانایان
وفاضلان واستادان کوں اس شہر کے ضیافت کیا۔خلعتان بھاری قیمت
کے دیا جب لرکا سات برس کی عمر کا ہوا استاد کامل کے نزدیک پڑنے بہتایا۔
اولرکا تھوری روز میں الف وآمدن نامہ وانشاء ہرکرن۔وگلستان وبوستان
وجامع القوانین وانشاء ابوالفضل ویوسفی ورقعات جامی تحصیل کیا۔بلکہ

علم عربی و فارسی کچھ باقی نہیں رکھا۔ و قاعدہ نشست و برخاست مجلس
بادشاہی و قانون گفتار و رفتار بزم شاہنشاہی سکیا اور نظر میں بادشاہ
خاصہ گان درگاہ کے پسند آیا تب بادشاہ اس فرزند کا نام میمون رکھیا اور ایک
عورت ماہ بدن خورشید رخسار سے شادی کر دیا۔ نام اس عورت کا خجستہ تھا۔
درمیانے خجستہ و میمون کے دوستی زیادی ہوئی جیسا کہ ہر روز ہور صبح شام یکجا گا
رہتے و یکجا گا سوتے۔ یکجا کا بیٹھتے۔ میمون یک روز پالکی سوار ہوکر واسطے
تماشائے بازار کے گیا۔ اور وہاں دیکھیا کہ ایک شخص بازار میں طوطے کا پنجرا ہات
میں لیکر کھڑیا ہے میمون طوطا بیچنے ہارے کیتیں پوچھیا۔ اس طوطے کی قیمت
کیا ہے۔ طوطا بیچنے ہارا جواب دیا کہ اس کا مول ہزار ہون ہے۔ میمون سنکر کہا
کہ یک موٹھی پر و یک نوالہ ہی۔ کون اتیا مول دے گا۔ طوطا بیچ سے جواب دینے
نین سکیا اس وقت طوطا چلایا کہ دولت مند مجے مول نیں لیا تو بھوت قباحت
ہے۔ بعد ازاں طوطا جواب دیا کہ اے خوش جمال وای دولت مند صاحب کمال
اگرچہ میں تیری نظر میں موٹھی بھر دستا ہوں لیکن عقل و دانائی سون اوپر آسمان
کے اورتا ہوں۔ اور خوش گفتار شیرین سخنان میرے سنکر تعجب ہوتے ہیں اور
ادنی چیز میری سین یہ ہے کہ کام اگو کا ہونے ہارا خوب تے سمجھاتا ہوں ہیں۔ اب
کہ سوداگران کابل شہر کے آتے ہیں واسطے مول لینے تیل کے اور تو تمام تیل اس
شہر کا مول دے کر یکجا کا جمع کر رکھ۔ او سوداگران اے بعد ازاں کتیں بیچ کہ اس
سوداگری سون تجے بھوت فایدہ ہووے گا۔ میمون سخن طوطے کا سن کر نقد ایک
ہزار ہون مول دیکر اس طوطے کون لیکر اپنے گھر کون گیا۔ اور اپنے شہر کا تمام تیل
مول لیکر یکجا کا منگا کر اس کا مول پوچھیا۔ دوکان داران اس تیل کا مول دس ہزار
ہون بولے۔ اوس وقت نقد دس ہزار ہون اس کا مول دیکر اس تیل کو یکجا گا
سون رکھیا۔ سیوم روز طوطا بولے موافق سوداگران کابل شہر کے پونچے اور دوکانداران

سون مانگے۔ دوکان داران تمام کہے کہ تیل ہمارے نزدیک نہین ہے۔ تمام تیل ہمارے شہر کا میمون مول لیکر رکھیا ہے۔ بعدازان تمام سوداگران سمجھ کر آگو میمون کے آئے اور تمام تیل پچاس ہزار ہون کو مول لیکر اپنے شہر کون گیے۔ پیچھے میمون سخن پر طوطی کے بہوت خوش ہوکر شاروک تین مول لیکر نزدیک طوطے کے رکھیا۔ کس واسطے کہ وحشت تنہائی کا اس کے دل سون نکل جاوے اور طوطی اور شارک دونوں مل کر خوش رہیں۔ جیساکہ بزرگان فرماتے ہیں:

: کند ہم جنس با ہم جنس پرواز :

یک روز میمون خجستہ سون کہا کہ دل میرا چہتا ہے کہ سفر دریا اور مالکان اور بندران کا کرنا جس وقت تیرے تین کام ایک پیش اوی سوائے مصلحت طوطی اور شاروک مت کر۔ اسی طرح کے سخنان بول کے مسافرت گیا۔ میمون کے بعد خجستہ بہو غم کرنے لگی اور جدائی سون شوہر کے رات کون نین۔ اور کھانا نیں کھاتی۔ اس وقت طوطا کئی طرح قصے کہانیاں تیر بولکر خجستہ کے دل کون خوش کرتا۔ پیچھے چھ مہینے کے یک روز خجستہ نہا کر اپنے کتین سنوار کر جھاری پر سوار ہور دریچے جھاری کے تماشا کو چکا نکا کرتی تھی۔ یک بادشاہ زادہ دوسرے شہر کا واسطے سیر کے اس شہر کون آیا تھا۔ اونے خجستہ کا چہرہ دیکھ کر دیوانہ ہوا اور خجستہ بھی اس کون دیکھ کر عاشق ہوئی۔ اور بادشاہ زادہ ایک عورت کٹنی کو بلا کر اس کے ہات نزدیک خجستہ کے پیغام بھیجا کہ ایک رات میرے نزدیک آئے گی تو عوض میں اس کے لکھوتی لاک ہون کے جواہر تجھے دیونگا۔ اول سن کرنا منظور کیے۔ بعدازاں ورغلانے سے کٹنی کے راضی ہوکر جواب اس کا کہلائی کہ آدھی رات کے وقت تماری حضور میں آؤں گی آونگی میں۔ جب رات ہوئی خجستہ لباس بہتر پہن کر روبرو شارو کے آئی اور اوپر کر کے بیٹھ کر اندیشہ کی کہ میں عورت ہون۔ شارو بھی عورت ہے البتہ سخن پر آئیں گی۔ اور شاہزادے کے نزدیک جانے کون حکم دینگی۔

اس اندیشہ سوں تمام کیفیت روبرو شارو کے ظاہر کی۔ شارو سن کر تعجب کی
کہ ایسا کام نہ کرنا کہ تماری قوم میں سخت عیب ہے۔ اور شرم ہے اس واسطے
کہ عشق خجستہ پر غالب تھا منع کرنے سوں شاروک کے غصّہ بہوت آیا پنجرے
میں سے شاروکتیں باہر نکال کر دونوں پانواں کے ہات سوں مضبوط لیکر ایسا
اوپر زمین کے ماری کہ جان شاروک کا نکلیا۔ اور مرگئی بعد ازاں سان غصے کے
طوطے کے نزدیک آئی۔

لیکن طوطا عقلمند تھا اس نے سوچا کہ اگر میں روکوں تو یہ بگڑے گی۔
ساتھ ہی وہ اس کو جانے بھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ یہ اپنے آقا سے نمک حرامی
تھی اس لیے اس نے ایک کہانی کا حوالہ دیا کہ میں بھی اس طوطے کی طرح عمل
کروں تو میرا بھی حشر فرخ نیک کے طوطے کا سا ہو گا۔ خجستہ نے پوچھا اس طوطے
نے کیا کیا۔ اس پر طوطے نے کہانی سنانی شروع کی اور رات ختم ہوگئی۔ اسی
طرح ہر رات جب خجستہ اجازت لینے آتی طوطا ایک نئی کہانی چھیڑ دیتا
اس طرح اس نے کہانیاں (۳۴) راتوں تک بیان کیں۔ پینتیسویں دن میموں
سفر سے واپس آگیا اور شاروک کا حال پوچھا۔ طوطے نے تمام قصہ اون تا آخر
کہہ سنایا۔ میموں کو بھوت غصہ آیا اور اس نے خجستہ کو مار ڈالا۔

یہ حکایتیں بڑی دلچسپ ہیں اور زیادہ تر عورتوں کی بیوفائی سے متعلق ہیں۔ چند
کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

۱۔ : حکایت طوطے کی :

۲۔ : حکایت پاسبان کی وفاداری کی :

۳۔ : حکایت سنار اور بڑھئی کی :

۴۔ : حکایت زن لشکری و امیر زادہ :

۵۔ : حکایت سنار بڑھئی درزی اور زاہد کی :

۶۔ : حکایت رائے رایان ودختر رائے فنوج :

۷۔ : حکایت طوطا اور کاروشاہ :

۸۔ : حکایت عورت سوداگر زبان دراز :

۹۔ : حکایت عورت دہقاں :

۱۰۔ : حکایت دختر سوداگر :

۱۱۔ : حکایت برہمن :

۱۲۔ : حکایت شیر باگ کی :

۱۳۔ : حکایت شاہ پور مینڈک کی :

۱۴۔ : حکایت شیاہ گوش :

: طوطی نامہ : کی تکنک

اس کی تکنک میں بھی دور قدیم کے اکثر افسانوں کی طرح قصہ در قصہ کا سہارا لیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک مختصر افسانہ طویل داستان بن جاتا ہے۔ چونکہ ابھی لکھنے والوں میں اتنی مہارت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ایک پلاٹ کو پھیلا کر ایک ہی قصہ کی شکل میں لکھ سکیں اسی لیے وہ اس طرح کی تکنک اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ اصل داستان محض تمہید کے طور پر بیان کی جاتی تھی جو دوسری تمام داستانوں کو مربوط کرنے کا کام بھی دیتی تھی۔ اس طرح ایک ادب پارے میں : تنوع میں وحدت :۔ (unity in variety) برقرار رہ سکتی تھی۔ جو کولرج کے نزدیک اعلیٰ ادب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

: طوطی نامہ : میں بھی اصل داستان جو خجستہ کی امکانی بے وفائی کا قصہ ہے بہت مختصر ہے لیکن یہی قصہ ایک ایسی ڈوری ہے جس میں دوسری تمام کہانیوں کے منکے پروئے گیے اور اس طرح ایک خوبصورت مالا تیار کی گئی ہے۔ اس میں ہر قصہ اپنی جگہ مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے قصہ کی تمہید کا کام بھی دیتا ہے۔

یہ قصے دراصل ایک خاص تھیم یا موضوع (Theme) پر لکھے گیے ہیں۔ ان میں پلاٹ (Plot)

زیادہ اجاگر نہیں ہونے پاتا اسی لیے کئی قصوں کے اس طرح یکجا کر دیئے جانے کے باوجود کسی قسم کا سقم پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ قصہ کی جاذبیت اور بڑھ جاتی ہے۔

خود قصہ میں کہانی کی جاذبیت اور اس کے اثر کے جادو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کہانی کی دلکشی کے سامنے دوسرے تمام جذبات اور خواہشات ماند پڑ جاتے ہیں یہاں تک کہ "محبوب" سے ملنے کی خواہش پر بھی کہانی سننے کی خواہش غالب آجاتی ہے۔ مشرقی داستانوں میں کہانی کے اثر کو مبالغہ سے پیش کیا گیا ہے چنانچہ "الف لیلیٰ" میں ملکہ شہرزاد بادشاہ کو اپنے قتل سے محض کہانی کے ذریعہ ہی روکے رکھتی ہے۔

نہ صرف مشرقی ادب میں بلکہ دیگر آریائی زبانوں مثلاً لاطینی۔ انگریزی وغیرہ میں بھی اس قسم کی کہانیاں ملتی ہیں۔ اس خصوص میں بکاچیو (Boccaccio) کی "ڈی کیمرون" اور چاسر کی "کنٹربری ٹیلز" (Canterbury Tales) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جن میں اسی طرح کے مختلف قصے یکجا کیے گیے ہیں۔ لیکن "طوطی نامہ" کی تکنک ایک طرح سے اپنے مغربی مماثلات پر فوقیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس میں اصل کہانی کا ایک ہی کردار کہی جانے والی دوسری کہانیوں کا "داستان گو" (Narrator) ہے۔ حالانکہ مغربی داستانوں میں چند اتفاقاً یکجا ہو جانے والے شخص اپنی اپنی کہانیاں سنانے لگتے ہیں جن کا مقصد وقت گزاری کے سواء اور کچھ نہیں یہ کہانیاں "چار لوگوں کی چار باتیں" ہیں۔ مگر طوطی نامہ کی کہانیاں ایک مخصوص موضوع کے دائرے میں حرکت کرتی ہیں۔

سنگھاسن بتیسی

"طوطی نامہ" کے بعد دوسرا مقبول عام قصہ "سنگھاسن بتیسی" ہے جس کا ماخذ سنسکرت ہی کا ایک قصہ ہے سنسکرت میں بھی اس کے مصنف کا نام نہ معلوم ہوسکا۔ پروفیسر وردھا چاری لکھتے ہیں[1] کہ یہ قصہ بکرماجیت سے متعلق قصوں میں سے ہے۔ یہ بتیس۳۲ کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے بکرماجیت کے دربار کی پتلیاں

---

[1] اے ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" از ڈی۔ وردھا چاری صفحہ ۱۲۰

بیان کرتی ہیں۔ وکرما دتیہ کے تخت تک پہنچنے ۳۲ سیڑھیاں تھیں اور ہر سیڑھی پر ایک پتلی تھی۔ جب بکرماجیت تخت پر بیٹھنے کے لیے جاتا تو ہر سیڑھی پر پتلی روک کر اسے کہانی سنانے لگتی اس طرح بکرماجیت کو ۳۲ دن تک تخت پر بیٹھنا نصیب نہ ہو سکا۔ :سنگھاسن بتیسی: کو :وکرم چرتر: سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے ترجمے ہندوستان کی تقریباً سب ہی زبانوں میں ہوئے۔ چینی زبان میں کسما کیرا نے اس کا ترجمہ کیا جو چودھویں صدی عیسوی (ساتویں صدی ہجری) میں ہوا ہے۔

بنگالی میں اس کا ترجمہ ورارو چی نے کیا تھا جس کی گرام قدیم ترین گرام سمجھی جاتی ہے[1] جنوبی ہند کی زبانوں میں بھی :وکرم چرتر: کے نام سے اس کے ترجمے ہوئے۔ سنسکرت سے فارسی میں اس کا سب سے پہلا ترجمہ چتر بھوج داس نے جو مہر چند بھاٹ کا بیٹا تھا اکبر کے زمانے میں کیا تھا۔ اور اس کا نام :شاہنامہ: رکھا تھا۔

اس کے بعد بہاری مل اور راج مل نے جہانگیر کے زمانے میں ایک اور ترجمہ کیا۔

شاہ جہاں کے دور میں ابن ہرکرن نے جس کا نام کیرائے ہرکرن داس کا بستھ بھی بتایا گیا ہے مذکورہ بالا فارسی ترجموں سے مدد لے کر ایک اور فارسی ترجمہ کیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی (مصنف :منتخب التواریخ:) نے بھی ایک برہمن کی مدد سے :سنگھاسن بتیسی: کا ترجمہ فارسی نظم و نثر میں :خرد افروز: کے نام سے ۹۸۲ھ میں کیا تھا۔[2]

چتر بھوج داس کے :شاہنامہ: کا ایک ترجمہ دکھنی میں بھی ملتا ہے۔ جو کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ ابھی تک :سنگھاسن بتیسی: کے اس دکھنی ترجمے کا حال کسی محقق نے نہیں لکھا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد للو لال نے :سنگھاسن بتیسی: کا اردو میں ترجمہ کیا۔

---

[1]: اے ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر از وی۔ ورد ھاچاری صفحہ ۱۲۰

[2]: کیٹلاگ مرتبہ ریو

اور یہ کتاب : ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں چھپی تھی۔ ؎ للولال جی کے ترجمے میں ہندی الفاظ بکثرت ہیں۔ سالار جنگ کے مخزونہ مخطوطہ کا کچھ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سالار جنگ کے کتب خانہ میں مخزونہ مخطوطے میں مترجم کا نام درج نہیں۔

مترجم اردو کو دکھنی کہتا ہے۔ ابتداء میں اس قصہ کے ترجمہ کی یہ وجہ بتاتا ہے :

: کسی شخص فارسی زبان سے آشنا نہیں۔ اس واسطے ترجمہ اس کا دکھنی زبان میں اس طرح سے لکھا گیا۔ اب مجکو دانش مندوں اور صاحب کمالوں سے التماس یہ ہے کہ اگر کچھ فراموشی اور خطا اس میں ظاہر ہووے اپنی عنایت سے معاف فرمائیں کہ مجھے بزرگی اور اعتبار ہووے اور اپنی مراد کو پہنچے۔ :

معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کے پیش نظر چتر بھوج داس کا : شاہنامہ : ہی تھا کیونکہ دیباچہ میں خدا کی حمد و نعت کے بعد بادشاہ اکبر کی مدح کی گئی ہے۔ پھر مترجم نے اس کہانی کے ماخذ اور ترجموں کی تھوڑی سی تاریخ بھی مندرجہ ذیل لفظوں میں دیدی ہے :

: اول یہ کتاب چتر بھوج داس بیٹا سرپ چند بھاٹ کا فارسی زبان میں لکھ کر نام اس کا : شاہنامہ : رکھا ہے اور ۳۲ حکایتاں بھوت فصاحت اور نزاکت سے ظاہر کیا ہے ہندی زبان میں اس کتاب کو : سنگھاسن بتیسی : کہتے ہیں :

اس تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ ابتداء میں راجہ بھوج کے والد اور اس کی پیدائش کا حال مذکور ہے۔ پھر اصل قصے شروع ہوتے ہیں۔ یعنے جس وقت راجہ بھوج تخت پر بیٹھنا چاہتا ہے تب ایک ایک پتلی اس سے ایک نئی کہانی کہتی ہے۔ اس ترجمہ سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

: یوں نقل کرتے ہیں کہ ایک شہر عظیم الشان اور آبادان نام اس شہر کا دھارانگر

؎ : داستان تاریخ اردو صفحہ ۱۳۹

مشہور تھا اور قلعے اس کے نہایت خوبصورت اور دروازے بہوت مضبوط تھے
ادمی ہر قوم کے اس شہر میں جمعیت اور دولت سے محفوظ رہتے تھے۔ سونا اور
روپا جواہر اور لعل موتی اور الماس کھوڑی ہاتیوں کا شمار نہ تھا۔ بہوت خوبی
اور زینت سی زندگانی کرتی تھی۔ ہر ایک محل اور رستوں میں محل اور حویلیاں نقاشی
فرما کر رنگین اور آراستہ کی تھی۔ تمام عالم زمانے کے حادثے اور آفتوں سے امینت
پا کر عیش و عشرت سے رہتے تھے۔ اس شہر میں راجہ بھوج نام ایک راجہ کا تھا۔
و راجہ بہوت قابل اور لایق چودہ علم سی واقف تہا۔ بادشاہ ہے اس شہر کی و
راجہ کرتا تھا۔ اور اپنی بادشاہت میں خلق کو بہوت راضی رکھا تھا۔ اور سب
راجے ملکوں کے متابعت اور فرمانبرداری اس کی کرتے تھے اور ہر سال خزانہ اور
تحفہ نذرانہ اس کو بھیجتے تھے۔ خویشاں اور دوستاں اس جماعت کے ہمیشہ بیچ
خدمت کے حاضر رہتے تھے۔ بھائیاں اس کے صاحب شجاعت اور فرزنداں
اس کے تخت نشین اور امیران دانشمند اور وزیران صاحب عقل اور شاعران
پاکیزہ طبیعت نے اور حکیمان نادر حکمت کے نجومیان غیب کی جاننے والے
اور رانیاں کمال کے کھولنے والے اور ہم نشیناں دل کی خوش کرنے والی مانند تاروں
کے جمع رہتے تھے۔ اور وہ راجہ درمیان ان کے چاند کی مانند روشن نظر آتا
تھا۔ یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک وقت مہادیو اوپر یہ کیلاش پہاڑ کے بیٹھا
تھا وہ پہاڑ مہادیو کے رہنے کا مکان تھا۔ اور پاربتی نام ایک عورت تھی ہاتھ
باندھ کر خدمت میں کھڑی تھی کہ آج کی روز دل میرا یوں چاہتا ہے کہ قصہ کوئی
راجہ پرہیزگار کا کہ سخاوت اور شجاعت میں بے مثال ہو میری صاحب کے
زبان سے سنوں میں کس واسطہ کہ میری پر مہربانی کرتے ہیں اس سبب یہ
التماس کرتے ہوں کہ وگر نہ کیا قدرت میری کہ اس گستاخی سے عرض کروں
میں۔ امیدوار فضل و کرم سے ایسا ہے۔ زبان مبارک بہتر آب حیات سے ہے۔

وہ قصہ ظاہر فرما کر دل میرا خوش وقت فرمائیں اور زندگانی تازہ بخشیں جب
وہ عورت پاربتی ایسی عاجزی سے التماس کری کہ سری مہادیو فرمای اور ایسی
تو خدمت کرنے والی ہماری ہی جو کچھ مطلب تیرا ہو ضرور ہے کہ بجالاؤں میں
تب کہی کہ آگی اس بات کے ایک تخت واسطے ہمارے بناتی تھی اور اس
کے لعل زیادہ قیمت کے زمرد اور الماس بہوت نادر جوڑکر آراستہ کیے تھے۔
وہ سنگھاسن راجہ اندر کو دیا تھا میں ہور راجہ اندر پیچھے کئی روز کے وہ تخت
بکرماجیت کو دی تھی بکرماجیت کا ایک بھائی بڑا تھا۔ سرہری نام رکھا تھا۔
وہ راجہ اجین کا تھا تب پاربتی نے پوچھی کہ نام اس راجہ کے باپ کا کیا تھا
اور کس طرح راجہ اندر نے وہ سنگھاسن دیئے تھے تب سری مہادیو جواب دیے کہ
دیوکندا نام اس کنڈرپ سین کا تھا جب اندر نے معلوم کی کہ کئی مرتبہ اس سے
بدعملی ظاہر ہوئی ہے اور حوروں کو بد نظر سے دیکھتا ہے۔ تب غصہ ہوئی اور
بددعا کی اور یوں فرمائے کہ اس کو اندرلوک سے یعنی ہماری مجلس سے باہر کریں
اور اوپر زمین جاری اور گدھے کی صورت میں پیدا ہوئے۔ کندرپ سین اس
بات سے بہوت غمگین ہوا ہات باندھ کر کھڑے رہا اور التماس کیا کہ ای صاحب
جیسا عمل کیا تھا ویسی سزا کو پہنچا میں اور صاحب کے حکم سے کچھ علاج نہیں
رکھتا ہوں میں جس وضا حکم ہووے اسی طرح بندا ہوں گا میں لیکن امیدوار اس بات
کا ہون کہ میری تین ظاہر فرمادیں کہ پھر کب خدمت میں آوں گا۔ اور کتی روز
رہوں گا میں۔ دوسری غرض یہ ہے کہ دن کو گدھے کی صورت میں اور وقت
رات کے اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوں میں اور غسل فرما کر اللہ تعالیٰ کی عبادت
میں مشغول رہوں میں۔ جب راجہ اندر جواب دیا جس طرح تو کہتا ہے ایسا ہی
ہووے گا۔ لیکن جب تو گدھے کی صورت میں آوے گا ایک راجہ پوست تیرا
جلادے گا وہ راجہ کے لڑکی سے تجھ کو فرزند پیدا ہوگا پیچھے اس گدھی کے صورت

سے خلاصی پاکر پھر اندر لوک میں آوے گا۔ کندرپ سین یہ بات سنا اور راجہ اندر کے حضور سے رخصت ہوکر زمین پر آیا اور ایک کمار کے گھر میں گدھے کی صورت میں پیدا ہوا۔ :

اس طرح قصہ میں بتایا گیا ہے کہ اس شخص سے راجہ بھوج پیدا ہوتا ہے وہ تخت پر بیٹھنا چاہتا ہے تب اسے پتلیان کہانیاں سناتی ہیں آخری پتلی کی کہانی ذیل میں دی جاتی ہے :

ایک پتلی ان پتلیوں میں سے پدمنی نام رکھتی تھی ایک مرتبہ ہنسی اور کہی کہ راجہ بھوج یہ تخت شاہی کا اس راجہ بکرماجیت کا ہے جو کوئی مانند اس کے سخاوت کرے اور کام مشکل کو آسان فرمائے وہ شخص لایق ہے کہ اس تخت پر بیٹھے راجہ بھوج وہ حقیقت کس طرح ہے تب پتلی کہی کہ راجہ بکرماجیت اجین کے شہر میں تخت پر بادشاہی کے بیٹھا تھا۔ اس کے بادشاہت کو میں ایک سنار بہت نادر کاریگر تھا ایک روز آیا سنار راجہ کی خدمت میں اور زمین بوسی کیا اور تسلیمات بجالایا موافق اپنے مرتبہ کے ہات باندھ کر کھڑا پیچھے یک ساعت کے بادشاہ اس کو نزدیک بلایا حکم کیا کہ تخت بہوت تحفہ سونے اور روپے کا شتابی سے تیار کر اور اس پر لعل و جواہر کا کام آراستہ کرکے ہمارے واسطے لے آ۔ وو سنار تسلیمات کیا ...... :

آخر کار پتلی بتاتی ہے کہ یہ وہی تخت ہے جو راجہ بھوج کو ملا۔ اختتام اس عبارت پر ہوتا ہے:

رحمت اوپر راجہ بھوج کے اور تعریف کالی داس شاعر کو وہ مجلس کے دانشمندوں کی فرمایا اور وہاں سے رخصت ہوکر طرف راجہ اندر کے روانہ ہوا۔ بعد از رخصت ہونے اس کے راجہ بھوج سبھوں کو خلعتان بخشا اور انعام بہوت فرمایا۔ تمام خوش وقت ہوے اور دعا کیے کہ اے پروردگار اس راجہ کو سلامتی دے اور ہمیشہ درست قایم رکھ :

کام روپ و کام لتا | یہ قصہ بھی ہندوستان کے مشہور قدیم قصوں میں سے ہے۔ اس کے

مصنف کا پتہ نہیں چلتا۔ مرتب مقالہ کو اس کا مواد اور ترجمہ کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے ایک انشاپرداز میر محمد کاظم حسین کریم نے کام روپ وکام لتا کے قصے کو : کام روپ : کے نام سے لکھا تھا۔[1] یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میر محمد کاظم حسین کے قصے کا ماخذ کیا ہے۔

اورنگ زیب کے عہد میں میر بخشی ہمت خان میران نے اس قصہ کو فارسی نثر میں لکھا تھا۔ لیکن قصہ مکمل کرنے کے بعد ہی ہمت خان کا انتقال ہو گیا اور ان کی یادگار میں ان کے ہم صحبت محمد مراد نے ۱۰۹۶ سنہ ہجری میں ہمت خان کی تصنیف کو : دستور ہمت : کے نام سے نظم کیا۔ ریو نے اپنے کیٹلاگ میں اس کا سنہ تصنیف ۱۰۹۶ سنہ ہجری لکھا ہے۔[2] گارساں دتاسی کے قول کے مطابق یہ مثنوی ۱۱۱۵ سنہ ہجری میں لکھی گئی۔

اُردو میں اس کا منظوم ترجمہ پہلے تحسین الدین نے کیا اور اس نظم کا نام : قصہ کام روپ وکام لتا : رکھا۔ اس کے متعلق گارساں دتاسی لکھتا ہے :

: یہ وہ قصے ہیں جن میں تخیل نے تاریخ سے مل کر اپنی صنعت دکھائی ہے۔ ان کے بعد ایسے قصے آتے ہیں جن کی بنیاد محض تخیل پر ہے۔ میرے خیال میں کام روپ کا قصہ بھی اسی تحت میں آتا ہے۔ یہ عجیب قصہ ہے اور ہندستانی نظم و نثر میں بہت سے مصنفوں نے اسے لکھا۔ نظم میں تحسین الدین۔ ضیغم۔ آرزو۔ حسن۔ اور سراج الدین پانی پتی نے طبع آزمائی کی۔ :[3]

آگے چل کر ڈی تاسی لکھتا ہے :

: کہتے ہیں سندباد کا قصہ جو : الف لیلیٰ : میں ہے اور سن بران دین کا قصہ جو میری دی فرانس کی تالیف ہے ان کی اصل یہی ہے۔ :[4]

---

[1] کیٹلاگ برٹش میوزیم مرتبہ ریو
[2] 〃 〃 〃 〃
[3] خطبات گارساں ڈی تاسی صفحہ ۱۵۵
[4] 〃 〃 〃 صفحہ ۱۵۵

اس کے منظوم اُردو ترجموں کے علاوہ مندرجہ ذیل نثری ترجمے ملتے ہیں :

۱۔ دکھنی ترجمہ جس کے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتہ نہ چل سکا۔

۲۔ اُردو نثر میں کندن لال لاہوری نے ۱۸۴۹ء میں اس کو لکھا۔ کندن لال نے محمد مراد کی مثنوی : دستورِ ہمت : کے پہلے باب کا ترجمہ کیا ہے۔

۳۔ تیسرا : مرغوب الطبع : کے نام سے سید حسین علی خان نے ۱۲۴۸ھ میں اُردو نثر میں ترجمہ کیا۔ جس کے متعلق ڈاکٹر زور : تذکرہ اُردو مخطوطات : جلد اول میں لکھتے ہیں :

یہ کتاب دراصل فارسی قصہ : کام روپ : کا اُردو نثر میں ترجمہ ہے۔ اس کے مولف سید حسین علی خان حیدرآباد کے طبقہ شرفا و جاگیرداران میں سے تھے۔[1]

چونکہ ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۴۹ھ کا زمانہ فورٹ ولیم کالج کے بعد کا ہے۔ اس لیے یہاں صرف اُس دکھنی ترجمہ پر روشنی ڈالی جائے گی جس کا مخطوطہ[2] کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوا۔ مخطوطہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تاریخ تصنیف ۱۱۸۰ھ ہے۔ اس کا کاتب ابو القاسم ہے۔ لیکن اس کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ مخطوطے کے کل ۶۲ صفحات ہیں۔ ان کی اصل یہی ہے۔

اس کا قصہ شہزادہ کام روپ اور کلا کی داستانِ عشق ہے۔ جس میں شہزادہ ایک شہزادی کو خواب میں دیکھ کر اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

: ایک بادشاہ تھا جو ملک اودھ پر حکومت کرتا تھا۔ وہ مسلمان نہیں تھا۔ جس طرح آج کل اس علاقے کے نواب ہیں وہ رام کی اولاد میں تھا۔ مگر شاعر نے اس کا نام نہیں بتایا وہ ہمیشہ اس کا ذکر مہاراجہ کے نام سے کرتا ہے۔ اس کے

---

[1] اس کا مخطوطہ ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ فہرست اُردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۱۶۴

[2] مخطوطہ نمبر ۹۳

کوئی اولاد نہیں تھی۔ اولاد کی خاطر اس نے اپنے دارالسلطنت اودھ پور میں فقیر فقرا میں خوب خیرات تقسیم کی۔ دیس دیس کے درویش اس کے ہاں جمع رہتے تھے۔ بالآخر ایک درویش نے اسے "شبری" کے پھل کا تحفہ دیا۔ اور رانی سے اسے کھانے کی درخواست کی۔ رانی کا نام سُندر روپ تھا اس نے یہ پھل چکھا اور معاً اسے اس کا اثر محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ اعلیٰ عہدہ داروں کی چھ بیویوں نے بھی اس پھل کو چکھا وہ سب کی سب حاملہ ہو گئیں۔ راجہ کے ہاں جب ایک شہزادہ روشن تولد ہوا تو اسی روز ان سبھوں کے ہاں بھی لڑکے تولد ہوئے شہزادے کا نام کام روپ تجویز ہوا اس مبارک گھڑیوں کے بعد کئی دن تک خوشی کے شادیانے بجے اور سونے چاندی کے ڈھیر بطور نذرانہ بادشاہ کو پیش کیے گیے رقص و سرور کی محفلیں منعقد کی گئیں۔ نوخیز لڑکوں اور خوش ادا ناچنے والیوں نے اپنے ناچ رنگ سے اہلِ محفل کے دلوں کو خوب گرمایا پنڈتوں نے شہزادے کا جنم پتر دیکھ کر بتایا کہ بارہ سال کی عمر میں اس کا دل محبت کی کسک سے آشنا ہوگا۔ اور ساتھ ہی اسے بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے بادشاہ کے دل کو بڑی تشویش ہوئی۔ دن رات اسی ادھیڑ بن میں رہتا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ شہزادے کو ۱۲ سال کے سن تک ایک قصرِ عالی شان میں ان چھ بچوں کے ساتھ رکھا جائے جو اس کے ساتھ تولد ہوئے تھے اس محل کے چاروں طرف باغات تھے یہاں ہر وقت اس کی حفاظت کی جاتی تھی کام روپ اور اس کے چھ ساتھیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی پورا خیال رکھا گیا۔ جب شہزادے نے عمر کی پانچویں سال میں قدم رکھا تو اسے ننھی سی سونے کی تختی پر لکھنا سکھایا گیا۔ اسے پہلا سبق فنِ حکومت پر دیا گیا۔ وزیر کے بیٹے متر چند کو انتظام ملکی۔ بادشاہ کے طبیب کے بیٹے کنول روپ کو فنِ طب اور جوہری کے بیٹے مانک کو ہیرے جواہرات کی پرکھ سکھائی گئی۔ دربار کے منجم کے بیٹے اچھا راج کو

اختر شناسی اور دینیات کی تعلیم دی گئی۔ بادشاہ کے نقاش کے بیٹے چترمان کو فن نقاشی سکھایا گیا اور درباری کے بیٹے رس رنگ کو فن موسیقی کی تعلیم دی گئی۔ یہ سب بچے خوش وقتی سے اپنے وقت صرف کرتے۔ کبھی پڑھتے لکھتے کبھی سیر تفریح کو جاتے اور کبھی شکار کھیلتے مگر قسمت کا لکھا مٹائے نہیں مٹتا۔ جب شہزادہ بارھویں سال میں قدم رکھا تو ایک دن ہونے والی بات گرمی شدت کی تھی۔
کامروپ کی آنکھ لگ گئی خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک دلفریب باغ میں بیٹھا ہے۔ اس باغ میں ایک شہزادی رہتی تھی جو اپنے حسن وجمال میں نظیر نہیں رکھتی تھی۔ اس کا نام کلا تھا۔ وہ سراندیپ کے راجہ کی بیٹی تھی۔ اس کی گردن ہنس کی سی منہ کنول کا سا اور قدو قامت شیرنی کے مثل تھا اس کے پاؤں میں گھونگرو پڑے ہوئے تھے جب وہ چلتی تھی تو اس سے آواز نکلتی تھی۔ اس کے ہاتوں میں حنا لگی ہوئی تھی۔ سر کے بال جواہرات سے آراستہ تھے۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں کو مستی نے باکیف بنا دیا تھا۔ اس کی حسین سہیلیاں باغ کے گھنے درختوں میں چہلیں کرتی پھرتیں۔ اور وہ سب کی سب سرخ جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھیں یہ عجیب بات ہے کہ ادھر تو کامروپ نے کلا کو خواب میں دیکھا اور ادھر کلا نے شہزادے کو خواب میں دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے پر دل وجان سے فریفتہ ہوگئے۔ عشق کے تیر نے دونوں کو گھائل کیا پہلے ان دونوں نے اپنا اپنا احوال ایک دوسرے کو سنایا اور پھر وہ دونوں ابدی محبت کی زنجیر میں جکڑ گئے۔
کامروپ کی آنکھ کھلی تو وہ بوکھلایا ہوا سا تھی اس کے دل

میں کلا کے سوا کسی جگہ نہیں تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کی تصویر پھرتی تھی۔ اسے اس کی میٹھی سریلی آواز رہ رہ کے یاد آتی تھی۔ باوجود ان تمام باتوں کے کامروپ کے ذہن سے اس پری جمال کا نام بالکل محو ہو گیا اسے کلا کے خدوخال بخوبی یاد تھے۔ وہ تو اس کے دل ایسے نقش ہو گئے تھے جیسے پتھر پہ لکیر۔ ادھر کلا کی بھی یہی حالت تھی۔ شہزادے کے ہم جلیسوں نے جب اس کا یہ حال دیکھا جب انھیں اس کی اندرونی کیفیت کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ شہزادے کی آنکھیں ہر وقت آنسوؤں سے تر رہتی تھیں۔ کوئی اس سے بات کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سننا ہی نہیں۔ بالآخر بڑی کوششوں سے مترچند نے شہزادے کے دل کا بھید معلوم کر لیا۔ اسے شہزادے سے بڑا انس تھا۔ بادشاہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس تدبیر پر عمل کرنے کی ٹھانی۔ جو وہ پہلے بھی ایک دفعہ کر چکا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کی ساری دولت خیرات میں بے دریغ لٹا دی جائے ملک ملک کے پردیسیوں کو دعوتیں دی جائیں۔ جب یہ دیسی لوگ اس کے ہاں جمع ہوئے تو اس نے ان سے فرمائش کی کہ کامروپ کے روبرو اپنی اپنی سرگزشت بیان کریں اسی سلسلہ میں ایک برہمن بھی آیا۔ یہ برہمن اس مندر کا نگران کار تھا جہاں کلا خواب کے بعد پوجا کرنے گئی تھی۔ کلا نے اس برہمن سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی خاطر گم شدہ شہزادے کو ڈھونڈ لائے جس نے اس کے دل کے سینے میں موہ لیا تھا۔ چنانچہ بادشاہ راجپت نے کامروپ کو اس کے چھ رفیقوں کے ہمراہ سراندیپ جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہاں پہنچ کر وہ پری

جمال کلا سے بہ نفس نفیس درخواست کر سکے۔ پنڈتوں نے روانگی
کی نیک گھڑی مقرر کی شہزادہ اپنی ماں سے رخصت لینے کی غرض
سے گیا۔ ماں نے نیک شگون کے لئے اس کے ماتھے پر دھی کا نشان
لگا دیا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ پہلے وہ سب
مقام ہنگلی گئے۔ اس مقام پر سے سراندیپ نظر آتا ہے۔ بلکہ ایک
سمت سے دور سے وہ مندر بھی دکھائی دیا جس میں کلا پوجا کیا کرتی
ہے۔ اسی دوران میں سمندر میں بلا کا طوفان اٹھا۔ ان کا جہاز موجوں
کے تھپیڑوں سے پاش پاش ہو گیا۔ اور آٹھوں مسافر ایک ایک تختے
پر بیٹھے رہ گئے۔ سمندر کے لہریں انھیں کبھی ادھر کبھی ادھر لئے پھرتی
تھیں کچھ عرصے کے بعد کامروپ کا تختہ کنارے پر آلگا۔ اترا تو کیا
دیکھتا ہے کہ وہاں سوائے جنگل کے کچھ نہیں۔ جنگلی پھل کھا کر رات میں
وہ ایک درخت پر چڑھ گیا۔ دوسرے دن پھرتا پھراتا ایک باغ میں
پہونچا۔ یہ باغ تریا راج کی رانی راوتا کا باغ تھا۔ یہاں کسی آدمی کو
آنے کی اجازت نہیں تھی۔ کامروپ کی خوش قسمتی کہ اس نے راوتا کو
اپنا گرویدہ بنالیا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ وہ خود کلا کو اس نئی محبت
میں بھول چلا تھا۔ ایک رات کلا خواب میں آئی اور اس نے کامروپ
کو خوب لعنت ملامت کی اور کہا کہ وہ عزت سچائی اور انصاف
کے اصول سے بالکل بیگانہ ہے۔ اس خواب کے بعد کامروپ راوتا
کے باغ سے نکل بھاگا کچھ دور چل کر وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا
ایک پری اسے کوہ قاف اٹھالے گئی۔ کوہ قاف دیوؤں اور رکھشوں
کا مخزن ہے۔ اس پری کا جو کامروپ کو اٹھا کرلے گئی تھی ایک چاہنے
والا تھا۔ اس کے سینے میں آتش حسد بھڑک اٹھی ایک دن موقع پاکر

وہ کامروپ کو اٹھا لے گیا۔ اور اسے سمندر میں پھینک دیا۔ بہتا بہتا وہ سراندیپ کے ایک جزیرے کے کنارے آ لگا۔ اس جزیرہ میں تنہا رہتا تھا۔ اس جزیرے والوں کی یہ خصوصیت تھی کہ اگر وہ کسی بھولے بھٹکے مسافر کو پکڑ پاتے تو اس سے سواری کا کام لیتے چنانچہ کامروپ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص اس کے کاندھے پر سوار ہو گیا اور کوڑے مار مار کر اسے ہانکنے لگا۔ اتفاق کی بات ایک دن کامروپ کو کچھ انگور مل گئے اس نے اس کا عرق نکال کر شراب بنائی اور اہل جزیرہ کو پلائی اور ر جزیرے والوں کو شراب کا چسکا لگ گیا تو ایک دن ان سبھوں نے خوب جی بھر کے پی کامروپ اور ان بدقسمت لوگوں نے جو اس سے پہلے یہاں گرفتار ہو چکے تھے اس موقع کو غنیمت سمجھا جس نے شراب پی تھی اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہی تھی پھر کیا تھا ان لوگوں نے بہت بدمستوں کو چن چن کر قتل کیا اور پھر خود آزاد ہو کر بھاگ نکلے ان میں سے ایک شخص جب شہزادہ کامروپ کو دیکھا تو وہ اس کے پاؤں پر آ کر جھپٹ گیا۔ یہ شخص متوجہ ہو زیرکا بیٹا تھا۔ جو کامروپ جگری دوست تھا۔ اسے ایک دیو اٹھا لے گیا تھا بہت دنوں وہ ایک غار میں رہا اس کے ساتھ جو دوسرے غار میں تھے انھیں سب کو دیو چٹ کر گئے۔ مگر اسے چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنی جان کی زیادہ فکر اور پروا نہیں تھی راکشوں کو اس کی یہ ادا پسند آئی انھوں نے اسے رہا کر دیا۔ اور ایک نے اپنے سر کے تھوڑے سے بال دئے اور کہا کہ جب کبھی تجھے کوئی مصیبت پیش آئے تو ان بالوں کو جلانا اور وہ فوراً اس کی

مدد پر پہنچ جائے گا کامروپ اور متوجب آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ایک طوطا اڑ کر شہزادے کے ہاتھ پر آبیٹھا۔ جیسے وہ پہلے سے اس سے واقف تھا۔ طوطے کی ٹانگ میں ایک دھاگا بندھا ہوا تھا۔ اس کے کھلتے ہی وہ طوطا آدمی بن گیا۔ ان دونوں دوستوں نے پہچان لیا کہ ہو نہ ہو یہ اچھا راج ہے۔ اس نے اپنی سرگزشت یوں بیان کی کہ اسے ایک پری اٹھا لے گئی اپنی خوشی سے اس نے اسے طوطے کی روپ میں تبدیل کر دیا اور اس کی ٹانگ میں ایک طلسمی دھاگا خوب مضبوطی سے باندھ دیا ایک دن وہ پری کو دھوکا دیکر اس کے پاس سے اڑ آیا یہ تینوں دوست جارہے تھے کہ راستے میں ایک برہمن سے مڈبھیڑ ہوئی برہمن نے جانے کا سبب پوچھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ کامروپ اس رانی کا بیٹا ہے جسے اس نے پُراسرار پھل کھلایا تھا تو بہت خوش ہوا اور اسے ایک پارس پتھر دیا۔ اس طرح وہ پتھرے کر آگے بڑھے کہ انہیں ایک نیا مسافر ملا جو چترمن تھا۔ چترمن کلا کے باپ کے دربار میں ملازم تھا کامراج بھی اس کی ہنرمندی سے بہت خوش تھا ایک مرتبہ وہ بہت بیمار پڑ گیا اس کا علاج کرنے جو طبیب آیا وہ اتفاق سے کنول روپ تھا اس طرح بچھڑے دوست مل گئے۔ چترمن نے اس وقت کی ایک تصویر بنائی اسے دیکھ کر کلا جو فراق میں بیمار پڑی تھی بہت خوش ہوئی اور اس اس کی حالت بہتر ہوگئی۔ کامراج بیٹی کی صحت یابی سے مسرور ہوا اور اس نے سوئمبر منعقد کروایا۔ سوئمبر میں کلا نے کامروپ کے گلے میں مالا پہنائی آخر دونوں کی شادی ہوگئی۔

اس طرح کامروپ کا کردار ہومر (   ) کے مشہور ہیرو یولی سس (   )

سے بہت ملتا جلتا ہے اس کے کچھ واقعات "راین من کروسو" سے بھی ملتے جلتے ہیں اس کی زبان صاف ستھری اور جدید دور کی زبان سے بہت قریب ہے ذیل میں اس حصہ کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے :۔

"کنور کامروپ وہاں سیر و شکار کو جاتا تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ راجہ شکار سے فارغ ہو کر عمارت میں آبیٹھا اور چھ شخص جو اس کے رفیق تھے وہ بھی حاضر تھے متر چند کا بیٹا جو بہت عاقل تھا۔ دوسرا بدیا چند پنڈت کا بیٹا کہ نجومی خوب تھا۔ تیسرا دنترحکیم کا بیٹا کہ حکمت میں پورا تھا۔ چترمن مصور کا بیٹا کہ تصویر کھینچنے میں ہوشیار تھا۔ پانچواں نانک چند جوہری کا بیٹا کہ جواہر خوب پرکھتا تھا۔ چھٹا رنگ رس کلاونت کا بیٹا کہ خوب گاتا تھا۔"

قصہ ملکہ زماں و کام کندلہ فارسی کی ایک داستان "جواہر سخن" کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا سنہ کتابت ۱۲۳۴ ہجری ہے اندرونی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فورٹ ولیم کالج سے قبل کی تصنیف ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں بھی مظہر علی خاں ولا نے موتی رام کیشو کے ہندی قصے "مادھونل اور کام کندلہ کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ لیکن یہ قصہ مختلف ہے اس کا نام "ملکہ زماں اور کام کندلا" ہے مترجم اردو کو "کرناٹکی" سے موسوم کرتا ہے۔ اور اپنا ماخذ ایک فارسی تصنیف "جواہر سخن" کو بتاتا ہے۔ جبکہ مظہر علی خاں ولا کا ماخذ موتی رام کیشو کا ہندی قصہ ہے۔ "مادھونل اور کام کندلا" مکمل نہیں چھپی[1] مظہر علی ولا نے مادھونل اور کام کندلا میں ایک برہمن مادھونل اور قاصد کام کندلا کی عشق و محبت کی داستان بیان کی ہے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے بیاض ہندی میں اس کا ایک اقتباس شامل کیا کیا تھا اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم میں موجود ہے[2] قصہ ملکہ زماں و کام کندلا میں

---

[1] ارباب نثر اردو صفحہ ۱۷۴

[2] " " " ۱۷۴

کام کندلا راجہ اندر کے اکھاڑے کی ایک پری ہے اسے ملکہ زماں کے بیٹے یعنی شہزادے سے محبت ہو جاتی ہے۔ بڑی کوششوں اور ملکہ زماں کی عقلمندانہ ترکیبوں سے بلاآخر دونوں کا بیاہ ہو جاتا ہے۔ اس قصہ میں کل چودہ حکایتیں ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:-

آغاز:- خدا کا حمد اور پیمبر کا نعت بشر کہاں کر سکتا ہے اس واسطے اس عاصی نے اپنی مدعا بر آ بیان کرتا ہے"
جواہر سخن یک قصہ عجیب نظم سے ہے۔ اس کو نثر بین کرناٹکی محاورے سے نو آموز سرداران والاشان کی پڑھنے کی خاطر لکھا ہوں اگر اس میں کچھ ہو ادی تو دیکھنے ہاری کو لازم ہے اپنی مہربانی سے درست کر مجھ پر احسان فرمانا عین سرفرازی ہے

یہ کل چودہ حکایتیں ہیں

پہلی حکایت — شہزادہ پیدا ہوا سو بیان ہے۔
دوسری حکایت — شہزادہ نامہ وزیر زادہ کے نام سے لکھے میں۔
تیسری حکایت — وزیر زادہ کا شہزادی کا جواب لکھ روانہ کرتا ہے۔
چوتھی حکایت — شہزادہ اور وزیر زادہ ل سفر کرنا اس بیان میں ہے۔
پانچویں حکایت — شہزادہ اور وزیر زادہ پھر کر آنا شہر کو اس بیان میں
چھٹی حکایت — ملنے جانا بادشاہ کام بخش سوداگر کامیاب سے شہزادے کی نسبت مانگنی اس بیان میں ہے۔
ساتویں حکایت — رخصت ہو جانا ملکہ زماں اپنی گھر اس بیان میں ہے۔
آٹھویں حکایت — اقرار نامے لے جانا ملکہ زماں رضامندی کا اور شادی ہونا۔
نویں حکایت — روانہ ہو جانا شہزادہ باغ سے حاصل کر حکمت

کی سواری باغبان سے اپنے دل کا مقصد حاصل کرنے اس بیان میں ہے۔

دسویں حکایت — طلب کرنا راجہ اندر کام کندلا کیتین اپنی حضور اس بیان میں ہے۔

گیارہویں حکایت — جانا شہزادہ باغبان پاس اور ظاہر کرنا چار خواب کا بیان اور مشورت کا اس نے اس بیان میں ہے۔

بارہویں حکایت — مصلحت دینا کام کندلا شہزادی کیتین اس بیان میں ہے۔

تیرہویں حکایت — بلانا راجہ اندر کام کندلا کو اپنی حضور دوسری دفعہ۔ اور اطلاع پا جانا شہزادہ اس کی ہمراہ اس بیان میں ہے۔

چودھویں حکایت — رخصت ہونا شہزادہ اور کام کندلا مقصد بار راجہ اندرسی اور اپنی محل کو آنا بڑی شان سے۔ اس بیان میں ہے۔

قصہ جنگ امیر حمزہ امیر حمزہ کی بہادری کی داستانیں قدیم قصوں کا دلپسند موضوع ہے۔ چنانچہ فارسی اور عربی میں ان کی شجاعت اور بہادری کے متعلق کئی قصے لکھے گئے ہیں۔ ببلیوتھک نیسا سیونال پیرس میں امیر حمزہ کی داستان کا ایک خلاصہ ہے جو ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے[1]۔ اس کی تاریخ کتابت سنہ ۱۱۹۸ ہجری ہے۔ اس داستان کو فورٹ ولیم کالج کے انشا پرداز خلیل علی خاں اشک نے بھی

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۶۲۵

ڈاکٹر گلو کواسٹ کی فرمایش پر اُردو میں لکھا تھا اس کے متعلق اشک کا بیان یہ ہے۔

مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ
کے وقت سے ہے اور اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں
کلام تھے۔ انھوں نے آپس میں مل کر واسطے منانے اور یاد دلانے
منصوبے لڑائیاں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے
واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر
رات کو ایک داستان حضور میں سناتے تھے۔ انعام واکرام پاتے تھے
اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ ۱۲۱۵ ہجری سنہ
۱۸۰۱ع کے خلیل علی خاں نے جو تخلص بہ اشک ہے حسب خواہش
مسٹر گل کراسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنا، بر آموزان زبان
ہندی اس قصے کو اُردوئے معلی میں لکھا تاکہ صاحبان مبتدیان کے
پڑھنے کو آسان ہوئے۔

خلیل علی خاں کے بعد داستان امیر حمزہ کو منشی نول کشور نے حافظ سید
عبداللہ بلگرامی سے مرتب کرا کے شایع کیا۔ پھر مطبع نول کشور کے مشہور مصنف سید
تصدق حسین نے اس کو اپنے طرز پر فسانہ عجائب کے رنگ میں مقفی و مسجع لکھا۔

امیر حمزہ اور طلسم ہوش رُبا بعد کے لوگوں نے اس ایک قصے کو طول دیکر بڑی ضخیم
کتابیں طلسم ہوش ربا طلسم ہفت پیکر وغیرہ تیار کرائیں
نہ صرف یہ بلکہ اس داستان کی مقبولیت میں اسی طرح کی طویل داستانوں کی تصنیف
کا ذوق پیدا کر دیا ایسی داستانوں میں فارسی بوستانِ خیال مصنفہ میر تقی خیال کا اردو
ترجمہ "ذوحتہ الابصار" خاصے مشہور ہیں جس کا مرزا محمد عسکری نے ترجمہ کیا ہے۔

امیر حمزہ اور دوحتہ الابصار یا بوستانِ خیال اس کتاب کی شان نزول جیسا
کہ مصنف میر تقی خیال نے خود لکھا ہے کہ یہ تھی وہ

گجرات کے رہنے والے تھے کسب معاش کی خاطر دہلی گئے وہاں ایک زن مطربہ رہتی تھی اس کی فرمائش تھی کہ وہ اسے روزانہ ایک قصہ سنایا کرے۔ چنانچہ وہ روزانہ ایک قصہ سناتے تھے اس مکان کے پچھواڑے میں ایک جلسہ ہوا کرتا جس میں داستانِ امیر حمزہ روزانہ پڑھی جاتی تھی۔ ایک وزیر صاحب وہاں موجود تھے۔ جب جلسہ برخواست ہوا تو انھوں نے کہا کہ اس سے بہتر کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو تحریر کرکے اس جلسہ میں پڑھا۔

اس کے کرداروں میں ایک دلچسپ کردار عمر عیار کا ہے جو اسم باسمی بے حد عیار ہیں۔ ایک خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کی تہذیب و تمدن کے علاوہ ہر سوسائٹی کا نقشہ ہو بہو پیش کرتی ہے۔ رزم بزم کے واقعات کے علاوہ عورتوں اور مردوں کی حالت مخصوص نسوانی اصطلاحات وغیرہ اچھی طرح بتائے ہیں۔ عبارت کا رنگ اور مسجع ہے۔

"قصہ جنگ امیر حمزہؓ کے بارے میں مرتب مقابلہ کی معلومات کا ماخذ نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" ہے۔ موصوف نے اس کی عبادت کا کچھ اقتباس بھی دیا ہے جو درج کیا جاتا ہے۔

داستان اول ابراہیم خلیل اللہ خدا کے دوست ان کے عہد میں جتا بادشاہ اور وزیر سب رہتی تھی۔ آگ کے پوجنے والا قباد نام بادشاہ کے دو وزیر تھا ایک کا نام خواجہ بخت جمال دوسرے کا نام النقش ان دونوں میں بڑی دوستی تھی۔

داستان چہارم بزرجمہر حکیم کا اون مکہ اور پیدا ہونا امیر حمزہؓ جتا نیکی شکم سون۔ اس کی باتیں کتاب کے موافق بیان کرتے ہیں مکہ کے درمیان اسمٰعیل مہتر کی اولادوں میں یک مرد بزرگ عبدالمطلب نام رہتے تھے۔ بڑا جہان پرست اور خدا دوست"

قصہ گل و ہرمز یہ قصہ اصل میں فارسی میں تھا جس کا دکھنی نثر میں ترجمہ کیا گیا ہے اس کتاب کا مخطوطہ انڈیا آفس کتب خانہ میں ہے۔ جس کا حال نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سے معلوم ہوتا ہے[1]۔
راقم الحروف کو اس کا کوئی نسخہ نہیں مل سکا نصیر الدین صاحب ہاشمی نے مخطوطہ کے مصنف کا نام اور سنہ تصنیف نہیں بتایا لیکن شمس اللہ قادری اپنے مضمون "کتب خانہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات"[2] میں مصنفین کے نام محمد خاطر اور شمشیر علی درج کئے ہیں۔ قصہ کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

روم کے ایک بادشاہ کو اولاد نہیں تھی جس سے وہ متفکر رہا کرتا تھا۔ آخر ارکان دولت سے مشورہ کیا تو انھوں نے ایک روشن دل فقیر کا پتہ بتایا بادشاہ فقیر سے رجوع ہوا فقیر نے پڑھنے کے لئے ایک دعا دی اور کہا کہ خواب میں شہدا کا دیدار ہوگا ان سے اپنی مراد مانگ بادشاہ نے اس ہدایت پر عمل کیا جس کے بعد ہرمز تولد ہوا لیکن سوتیلی ماں کی وجہ سے اس کی پرورش محل میں نہ ہوسکی۔ ایک مالی نے پالا پوسا خوارزم کی شاہزادی گل اس پر عاشق ہوئی۔ بڑی دقتوں کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔

زبان گیارھویں صدی کی طرح کسی قدر صاف ہے مثلاً:۔

"نقل ہے کہ ایک بادشاہ تھا روم شہر میں جہاں وسکے تابع تھا اور سب ملک کے بادشاہ اس کی تابعداری کرتے تھے اور خزانہ بھیجتے تھے۔ اس کو لوگ چھوٹے بڑے اس کو قیصر رومی کہتے۔ اسکو سب اسباب خوشی کا اور دولت وحکومت میسر تھا"

---

[1] "یورپ میں دکھنی مخطوطات" صفحہ ۵۹۵ [2] "مطبوعہ رسالہ اردو"

قصہ انار رانی اس قصہ کی معلومات بھی مرتب مقالہ کو نصیر الدین صاحب ہاشمی کی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سے ہوئیں۔

راقم الحروف کو اس کا مخطوطہ دستیاب نہ ہوسکا۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ انڈیا آفس کا مخزونہ ہے۔ اس کے مصنف اور تاریخ تصنیف کے بارے میں ہاشمی صاحب کو بھی کچھ پتہ نہ چل سکا۔ سرنامہ کی عبارت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نثر میں لکھی گئی ہے۔ زبان کے انداز اور اسلوب کے لحاظ سے یہ بھی فورٹ ولیم کالج سے قبل کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیٹ لاک میں حسب ذیل صراحت کی گئی ہے۔

"دکھنی نثر میں شہزادی انار کی داستان جو ایک پریوں کی کہانی ہے[۱]

یہ کہانی بھی "سب رس" اور "گل بکاولی" کی طرح کھوج کی کہانیوں سے تعلق رکھتی ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ کو اولاد نہیں تھی۔ منت مراد کے بعد چار بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے چوتھا بیٹا ( ) ثابت ہوتا ہے

اسے کہیں سے انار رانی کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ ایک جوگی کی مدد سے شہزادی تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ راستہ میں اسے بہت سے مصائب سے گزرنا اور دیو پریوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جوگی کے بتائے ہوئے طریقے سے شہزادہ ان مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔ اور اس طرح انار شہزادی اسے مل جاتی ہے۔

جب وہ انار شہزادی کو ساتھ لے کر وطن واپس ہوتا ہے تو راستہ میں اس کے غیاب میں ایک بدصورت دھوبن انار شہزادی کو کنوئیں میں ڈھکیل کر خود اس کے کپڑے پہن لیتی ہے شہزادہ واپس آکر بڑا پریشان ہوتا ہے کہ انار جیسی

---

[۱] "یورپ میں دکھنی مخطوطات" صفحہ ۶۱۳

حسین شہزادی یکایک اس بدصورت میں کیسے تبدیل ہوئی۔ لیکن مجبوراً اُسے اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔ اس اثنا میں انار نقل روح کرکے ایک خوب صورت پھول بن جاتی ہے جس کی اتنی شہرت ہوتی ہے کہ ہر شخص اس کے حصول کے درپے ہوتا ہے۔ یہ شہزادہ بھی قسمت آزمائی کے لئے پہنچتا ہے اور خوش قسمتی سے پھول حاصل کرکے لوٹتا ہے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد نقلی انار رانی یعنی دھوبن کو اس پھول کی حقیقت کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اسے بھی ایک کنویں میں پھنکوا دیتی ہے۔ اس طرح متعدد بار انار رانی یعنی دھوبن کا راز فاش ہو جاتا ہے اور شہزادہ اسے موت کے گھاٹ اتار کر اصلی انار رانی کو دوبارہ پا لیتا ہے۔

پورا قصہ نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کا ماخذ بھی کوئی فارسی کتاب تھی کیونکہ (   ) یا تبدلیت اور نقل روح کی یہ داستانیں یونانی ادب کی طرح فارسی ادب میں بہت مقبول رہی ہیں۔[1]

قصہ کی زبان گیارہویں صدی ہجری کے اواخر یا بارہویں صدی کے اوائل کی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے:۔

"کہنے ہارے خبروں کے ہور عاقلاں آگے نے کہے ہیں کہ بیچ ملک ہندوستان کے ایک بادشاہ تھا کہ سخاوت جوانمردی اور عدالت میں مانند اس کے دنیا میں کم اور خزانے اور سونا روپیہ اور زر و جواہرا ور اسباب و سپاہ حد سے زیادہ تھے۔"

قصہ بندگان عالی اس قصے کا نسخہ بھی انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور اس کے بارے میں معلومات مولوی نصیر الدین ہاشمی

---

[1] اوڈ کی "میٹا مارفوسس" اس کی بہترین کتاب ہے۔

کی تصنیف" یورپ میں دکھنی مخطوطات[1] " سے ماخوذ ہیں۔ یہ کہانی خلیفہ ہارون رشید سے متعلق ہے۔ اس کے مصنف اور سنہ تصنیف کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس قصہ میں بھی ہارون رشید کو برطانیہ کے شاہ آرتھر کی طرح ایک پُراسرار شخصیت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جس کے اطراف کئی کہانیوں کے جال بنے گئے ہیں چنانچہ عربی کی مشہور داستان " الف لیلیٰ " میں بھی بعض کہانیوں کا ہیرو ہارون رشید ہی ہے۔

یہ کہانی بہت زیادہ دلچسپ نہیں اور اس زمانے کے مقبول عام قصوں کے برخلاف کہانی کو آگے بڑھانے کے لیئے طلسمات جادو " نقل روح یا تلاش " وغیرہ کا سہارا بھی نہیں لیا گیا۔ اس قصہ میں ہارون رشید کی شب کوری اور انصاف کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جب خلیفہ حسب معمول رات کو گھومنے نکلتا ہے ایک بوڑھیا کو دیکھتا ہے جو اپنی بیٹی کی شادی کے لیئے متفکر ہے۔ ایک چور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ دیکھ کر خلیفہ خود اس لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اور بوڑھیا اور اس کے خاندان کو آلام و فکر سے نجات دلاتا ہے۔

ہشت کنشت قدیم دور کے قصوں میں یہ کہانی کافی اہم ہے۔ اس کہانی کا ماخذ فارسی زبان میں ہے ایران کے بادشاہ بہرام گور کے اطراف بھی کنگ آرتھر ہی کی طرح کئی قصوں کے پلاٹ تیار کئے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بہرام کی سات یا آٹھ بیویاں تھیں جن کے لئے اس نے آٹھ محل بنوا رکھے تھے[2]۔ بہرام کے متعلق فارسی میں جتنی مثنویاں لکھی گئی ہیں ان میں اس بات کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مثلاً امیر خسرو کی مثنوی " ہشت بہشت " نظامی کی مثنوی " ہفت پیکر " ہاتفی کی مثنوی " ہفت منظر " وغیرہ۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۷   [2] خطبات گارساں دی تاسی صفحہ ۱۵۰

قدیم ادب میں اس کو جو اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ دکھنی میں بھی اس قصے کو مندرجہ ذیل شاعروں نے نظم کیا۔

۱۔ بیجاپور کے دو شاعروں امین اور دولت تھے سنہ ۱۰۵۰ ہجری میں "بہرام و حسن بانو" کے نام سے اس قصہ کو لکھا۔

۲۔ ملک خوشنود نے امیر خسرو کی "ہشت بہشت" کا ترجمہ "ہشت بہشت" ہی کے نام سے ۱۰۵۶ھ میں کیا تھا جس کے مخطوطے اکثر کتاب خانوں میں موجود ہیں

۳۔ دوسرا ترجمہ طبعی کا ہے جو ابوالحسن تانا شاہ کا درباری شاعر اور شاہ راجو حسین کا مرید تھا۔ اس نے نظامی کی "ہفت پیکر" کو "بہرام و گل اندام" کے نام سے ۱۰۸۱ھ میں اردو کا جامہ پہنایا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد حیدر بخش حیدری نے "ہفت پیکر" ہی کے نام سے نظامی گنجوی کی مثنوی کو اردو نظم میں منتقل کیا یہ مثنوی اب ناپید ہے۔ اس مثنوی کی تاریخ تصنیف مرزا کاظم علی جوان نے کہی تھی جو مندرجہ ذیل ہے۔

"جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی" [1]

مذکورہ بالا مصرعہ سے ۱۲۲۰ھ برآمد ہوتا ہے۔

حقیقت بریلوی نے بھی ۱۸۱۰ء (۱۲۲۵ھ) میں "ہشت گلزار" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ جس کے متعلق گارساں دتاسی لکھتا ہے۔

غالباً یہ نام آٹھویں آسمان کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ ورنہ نظامی کی "ہفت پیکر" اور ہاتفی کی "ہفت منظر" کی مناسبت سے ہفت گلزار ہونا چاہیئے تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ایران کے بادشاہ

---

[1] "داستان تاریخ اردو" صفحہ ۹۵

بہرام گور پسر یزد جود کا قصہ ہے جس کی سات بیویاں تھیں جو
سات باغوں میں الگ الگ رہتی تھیں۔"

نثر میں اب تک اس کے دو ترجموں کا پتہ چلا ہے

۱۔ "ہشت گلشت" مصنفہ غلام احمد
۲۔ قصہ بہرام گور" مصنفہ" فرخندہ علی رضوی بنو ممنوی ۱۲۶۲ھ
م ۱۸۵۳ء[۲]

ہشت گلشت"۔ مصنفہ غلام احمد کے متعلق حکیم شمس اللہ قادری نے اپنے
مضمون "کتب خانہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات" میں حسب ذیل صراحت کی ہے

غلام احمد دہلوی نے ہنری مارٹن کی فرمائش سے ۱۲۱۰ھ میں سید حسین
خفیقت کی "ہشت گلزار" کا ترجمہ کیا۔ "ہشت گلزار" نثر ہے۔
امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت کی (۱۴۱۰) ورق

حکیم صاحب نے غالباً کسی انگریز مرتب کی ترتیب دی ہوئی فہرست مخطوطات
سے مخطوطوں کے نام اور تصریحی نوٹ کا ترجمہ کیا ہے لیکن موصوف کا محولہ بیان
صحیح نہیں سید حسین خفیقت کی کتاب کا نام "ہشت گلزار" ہی ہے لیکن وہ اردو
نظم میں ہے اور امیر خسرو کی نظم کا ترجمہ ہے۔ ممکن ہے کہ غلام احمد نے اس نظم کو نثر
میں لکھا ہو۔ چونکہ یہ مخطوط راقم الحروف کی دسترس میں نہیں ہے اس لیے اس بارے
میں کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

یورپ میں "دکھنی مخطوطات" کے مولف نے بھی اپنی تالیف میں اس کی کوئی
صراحت نہیں کی ہے۔

۱ے خطبات گارسان دی تاسی" صفحہ ۱۵۰
۲ے مضمون چند فراموش شدہ داستانیں" مطبوعہ رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۰۱

"ہشت کنشت" ہی کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ آصفیہ میں بھی دستیاب ہوا ہے ۱۷؎ یہ ترجمہ کسی ولیم ہیم مارٹن کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ مترجم کا نام کمترشاہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ کمترشاہ نے خود یہ بات بتائی ہے کہ شاہجہاں آباد میں انھیں ایک حادثۂ عظیم پیش آیا جس کی وجہ سے انہیں کلکتہ جانا پڑا۔ کلکتہ میں ولیم مارٹن کی فرمائش پر انہوں نے اس قصہ کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا۔

یہ کتاب بھی آٹھ کنشت پر منقسم ہے۔ پہلے "کنشت" میں بہرام گور اور دلارام کے شکار کھیلنے کا قصہ ہے اور لقب "گور" کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ بہرام کو گورخر کا شکار کھیلنے کا شوق تھا اس وجہ سے اس کا لقب "گورخر" پڑ گیا تھا۔

بہرام کی بیبیوں کے نام مختلف قصوں کی طرح اس میں بھی بتائے گئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ گل اندام۔ حسن بانو۔ دلارام وغیرہ۔

اس کہانی میں آٹھ "کنشت" ہیں پہلے کنشت میں جیسا کہ کہا جا چکا ہے بہرام گور اور دلارام کے شکار کھیلنے کا قصہ اور "گور" کی وجہ تسمیہ دی گئی ہے۔

دوسرا باب سات کنشتوں کے آراستہ ہونے کے بیان میں ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب بہرام کا شوق شکار حد کو پہنچ گیا تو وزیرا ورامیر بہت پریشان ہوئے اور کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہی جس سے بادشاہ کا شکار موقوف ہو جائے آخر لقمان بن منذر نے جو بادشاہ کا ہم مکتب رہ چکا تھا۔ ایک تدبیر سمجھائی۔ اس نے سات اقلیم کی سات شہزادیاں فراہم کیں۔ سات گنبد سات رنگ کے بنائے۔ اور ان گنبدوں کو ان کے دنوں کی نسبت سے آراستہ کیا۔ مثلاً پہلے برج کو جو شنبہ سے منسوب تھا ہم رنگ زحل سیاہ کیا۔

دوسرے کو جو یکشنبہ سے منسوب تھا اور متعلق آفتاب سے تھا زعفرانی بنایا۔

تیسرے کو دوشنبہ کی نسبت ہونے کی وجہ سے سبز ریحانی نیلانی بنایا۔

چوتھے کو سہ شنبہ کی نسبت سے لال بنایا۔

پانچویں کو چہار شنبہ کی نسبت سے بنفشہ گوں
چھٹے کو پنجشنبہ کی نسبت سے صندلی
ساتویں کو جمعہ کی نسبت سفید کا فوری بنایا

جب سات شہزادیاں بیاہ کر آئیں تو انہیں ان سات برجوں میں الگ الگ رکھا گیا اور بہرام کو اس کی خبر دی گئی۔ بہرام بہت خوش ہوا اور ان کے ساتھ رہنے اس شرط پر تیار ہو گیا کہ جس برج میں جائے وہاں کی شہزادی سے ایک دلچسپ حکایت سنائے اس طرح مختلف دلچسپ حکایات دی گئی ہیں:۔

برٹش میوزیم کے مخطوطے کا ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں جو اقتباس دیا ہے راقم الحروف نے اس کا مقابلہ کتب خانۂ آصفیہ میں دستیاب شدہ مخطوطے سے کیا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ عبارت ایک ہی ہے۔ اس کے علاوہ وجہ تصنیف بھی ایک ہی ہے۔ صرف مترجم اور ممدوح کے ناموں میں اختلاف ہے۔ برٹش میوزیم کے نسخہ کے مترجم کا نام غلام احمد بتلایا گیا ہے جنہوں نے مہری مارٹن کی فرمائش پر وہ ترجمہ کیا تھا۔

کتب خانۂ آصفیہ کے مخطوطے میں مترجم کی حیثیت سے کمتر شاہ کا نام دیا گیا ہے جنہوں نے ولیم ہیم مارٹن کی فرمائش پر یہ ترجمہ کیا تھا۔

لیکن چونکہ دیے ہوئے اقتباس کی عبارت اور وجہ تصنیف بالکل یکساں ہے اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ دونوں نسخے ایک ہی کتاب کے ہیں یا تو غلام احمد مصنف کمتر شاہ کاتب ہے یا کمتر شاہ مصنف اور غلام احمد کاتب ہے۔

اس کی زبان فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات کی زبان سے بہت مشابہ ہے اس لیے اس کا سنہ تصنیف فورٹ ولیم کالج کے قیام کے زمانے کے لگ بھگ سنہ ۱۲۱۱ھ معلوم ہوتا ہے۔

حکایات زیادہ تر عشق و محبت کی ہیں کہیں کہیں ابتذال بھی آ گیا ہے۔

کہانیوں کے موضوع مختلف ہیں۔ کسی میں مردوں کی ذکاوت عقلمندی کا بیان ہے تو کسی میں عورتوں کی چالاکی مکاری اور بدچلنی کا ذکر ہے۔ جادو اور طلسم کا بیان بھی ہے۔ لیکن اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ کہانی کے اختتام پر داستان گو شہزادی اپنے رنگ کی خوبیاں ضرور بتاتی ہے مثلاً آخری کہانی عورتوں کی مکاری اور بدچلنی کے متعلق ہے اس کہانی میں پاک دامن عورت کا لباس سفید بتلایا گیا ہے اور سفید رنگ جمعہ کا ہے یعنی آخری برج کا۔

ذیل میں اس مخطوطے کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

عرض کی ملک سراندیپ میں ایک بادشاہ تھا عادل۔ اور اس عہد میں نہ تلہا کوئی اس کا مقابل۔ غریب نواز ظالم کش میزان عدالت میں ہر ایک کام موزوں اور نام مبارک اس کا ہمایوں بادشاہوں کو تاج دیتا اور ان سے باج لیتا دانا اور ہند مند کی محبت کا راغب اور تمام دانش مند اور اہل کمال اس کے مصاحب اس کے تین بیٹے تھے خوب صورت اور خوب سیرت کہ ہر ایک علم و ہنر میں علامہ عصر تھا اور بزرگ خوردہ شناسی میں سترگ اور خود دانش و بینش سے بزرگ ان کی کارروائی سے سلطنت کا کام بخوبی انتظام تھا۔ اور بادشاہ کو دن رات عیش و آرام تھا۔ ایک دن صبح ہوتے ہی جو کچھ خیال دل میں آیا۔ ہر ایک کو جدا جدا بلایا۔ تا راز قلب ہو ایک کا محک امتحان میں لائے اور دریافت کرے کہ خیال بادشاہی اور عزم سلطنت کیسے ہے۔ پہلے بڑے بیٹے سے پوچھا کہ اب میری شب جوانی سحر ہوئی اور صبح عمر کی شام سلطنت اب تجھے مبارک ہو، رعیت داد و دہش سے خوش رکھنا اور بنائے ظلم جہاں سے اٹھانا اس سعادت مند دانش ور نے یہ جواب با صواب عرض کیا

خدا آپ کو صد وسی سال اور یہی ہمارے سر پہ قائم رکھے ۔

بادشاہ جی میں بہت خوش ہوا۔ اور ہزار آفریں کی لیکن ظاہر میں بہت سی نفریں کر اپنے پاس سے اٹھا دیا۔ پھر منجھلے بیٹے کو بلایا.....

اس طرح تینوں کو بلایا جاتا ہے آخر میں بادشاہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے باہر جا کر کچھ دن سیر و سیاحت میں گزاریں۔ الگ الگ روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن اتفاقاً ایک جگہ مل جاتے ہیں وہاں ایک زنگی جس کا اونٹ گم ہو گیا تھا آتا ہے اور اُن سے اونٹ کے بارے میں پوچھتا ہے۔ کہ ان کو اونٹ کے متعلق کچھ معلوم نہیں رہتا لیکن محض قیاس سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اونٹ جو کھو گیا ہے کانا ہے۔ دوسرا کہتا ہے اس کے دانتوں میں کچھ نقص ہے۔ تیسرا کہتا ہے اس کے پاؤں میں لنگ بھی ہے۔ غرض اس طرح اور نشانیاں بھی گناتے ہیں۔ جب زنگی یہ دیکھتا ہے کہ ان کی بتائی ہوئی نشانیاں سب درست ہیں تو وہ اونٹ واپس دلانے کے لیے منت کرنے لگتا ہے۔ جب شہزادے اونٹ کا کوئی پتہ نہیں بتا سکتے تو وہ ان پر اونٹ کی چوری کا الزام لگاتا ہے اور انھیں حاکم شہر کے سامنے لے جاتا ہے۔ شہزادے ہر چند یہ یقین دلاتے ہیں کہ اونٹ کو انھوں نے دیکھا تک نہیں۔ لیکن حاکم شہر ان کی ایک نہیں سنتا اور انھیں قید میں ڈال دیتا ہے کچھ دنوں بعد زنگی کو گم شدہ اونٹ مل جاتا ہے۔ وہ جا کر بادشاہ کو بتاتا ہے اور شہزادوں کو رہا کرنے کی درخواست کرتا ہے بادشاہ ان کو چھوڑ دیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اونٹ کو دیکھے بغیر وہ اس کی نشانیاں کس طرح بتا سکے وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ زمین پر دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ پاؤں گھسٹتا گیا ہے۔ جس پر انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اونٹ لنگڑا ہے۔ اس کے دانتوں کا نقص اس طرح معلوم ہوا کہ سرِ راہ جو درخت نظر آیا شاخ و برگ اس کا نیم خوردہ پایا یقین ہوا کہ دانتوں میں کچھ نقصان ہے

بادشاہ تینوں کی عقلمندی پر آفرین کہہ کر اپنی ملازمت میں رکھ لیتا ہے لیکن ایک دن وہ شراب وکباب پر اسی طرح اپنے ذہن لڑاتے ہیں۔ اور بادشاہ کو مطبخ زادہ بتاتے ہیں جو تحقیق پر صحیح نکلتا ہے بادشاہ ان کی عقلمندی سے خائف ہو کر انھیں بہ عزت و احترام رخصت کر دیتا ہے۔

اسی طرح اور سات حکایتیں ہیں آخر میں بہرام کی موت پر کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے اس کی عبارت کہیں کہیں اور مسجع بھی ہے لیکن زیادہ تو قصہ صاف زبان میں لکھا گیا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اس قصہ کے اسلوب بیان پر روشنی پڑتی ہے۔

> شکار کھیلنے والے رمز اسمارا ور نخچیر گیر صید گاہ گفتار آہوان بے آہو اس قصے کے دام بیان میں یوں لائے ہیں کہ جب بہرام گور کے پدر لطف گستر نے طرف گور کے رخت ہستی کا باندھا بہرام نے تاج فرمان روائی سر پر رکھا۔ ہاتھ کرم کا کھولا۔ سات قانون عدالت اور زر فشانی کے دوستوں کو سرفراز کیا اور گانون سیاست وجانفشانی سے نقد قلب دشمنوں کا گداز بیانی عدالت آباد اور اہل جہاں اس کی جود وسخا سے دل شاد....

انوار سہیلی "شکا سپ تتی" اور "سنگھاسن بتیسی" کی طرح یہ بھی دور قدیم کا ایک مشہور قصہ ہے۔ اصلی قصہ "پنچ تنتر" جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے۔ سنسکرت میں ہے لیکن فارسی نثر میں ترجمہ کر کے مولانا حسین واعظ کاشفی نے اسے آخر شہرت دے دی۔ چنانچہ دنیا کی تقریباً تمام ادبی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔[1]

---

[1] انڈیا ان یورپینگیز لٹریچر صفحہ ۵

کسریٰ نوشیرواں (۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) کے زمانے میں ۵۷۰ء میں اس کا ترجمہ سنسکرت سے پہلوی زبان میں ہوا پھر پہلوی سے یہ کتاب سریانی اور عربی زبانوں میں ترجمہ کی گئی عربی ترجمہ خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں ۷۶۰ء کے قریب عبداللہ ابن المقنع نے حکایات "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے کیا عبداللہ ابن المقنع بڑا عالم تھا وہ عربی اور فارسی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جانتا تھا۔ اصلی سنسکرت اور پہلوی ترجمہ دونوں مفقود ہیں۔ "پنچ تنتر" کے بعد میں جتنے بھی ترجمے ہوئے ان کی اصل یہی عربی ترجمہ ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ امیر نصر بن احمد کی فرمائش پر ابوعبداللہ رودکی نے نظم میں کیا تھا۔

اس کے تقریباً دو سال بعد نصراللہ متوفی نے اسے ۶۰۰ھ کے قریب فارسی نثر میں لکھا جو بہرام شاہ کے دور حکومت میں دارالانشاء کا افسر تھا۔

پھر مولانا حسین واعظ کاشفی نے نصراللہ کے ترجمے کو پیش نظر رکھ کر اپنے انداز میں "انوار سہیلی" تصنیف کی یہ کتاب سلطان حسین مرزا کے سپہ سالار امیر نظام الدین احمد سہیلی المتوفی کی فرمائش سے لکھی گئی اس مناسبت سے مولانا نے اس کا نام "انوار سہیلی" رکھا۔

اکبر کے زمانے میں ابوالفضل نے "انوار سہیلی" کا خلاصہ "عیار دانش" کے نام سے کیا تھا۔ اردو میں عیار دانش کے بھی کئی ترجمے ہوئے فورٹ ولیم کالج سے پہلے اور بعد۔ انوار سہیلی کے بہت سے ترجمے مختلف ناموں سے کئے گئے جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

۱۔ "بستان حکمت" فقیر محمد خاں گویا نے ۱۲۵۱ھ میں لکھی
۲۔ "ضیائے حکمت" عمر علی خان وحشت کا ترجمہ
۳۔ "دکھنی ترجمہ" "انوار سہیلی" محمد ابراہیم بیجاپوری
۴۔ " " " مصنف نامعلوم

۵۔ "خرد افروز" حفیظ الدین احمد نے جو فورٹ ولیم کالج میں مدرس تھے ابوالفضل کے خلاصے "عیار دانش" سے ترجمہ کیا ہے۔

"انوار سہیلی" کے چھ اردو ترجمے کتب خانہ انڈیا آفس میں محفوظ ہیں جن کی صراحت کیٹلاک میں حسب ذیل دی گئی ہے[1]

"انوار سہیلی" کا دکھنی ترجمہ جو فارسی کتاب ملا حسن بن علی سے کیا گیا ہے ایک اور دکھنی ترجمہ منشی محمد ابراہیم بن حسن خان نے ۱۸۲۲ء میں مرتب اور ۱۸۲۴ء میں مدراس سے شائع کیا۔

اس ترجمہ کی زبان قدیم اور املا مانوس ہے۔ ترجمہ میں روانی اور شگفتگی نہیں ہے اس کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"ابو جعفر منصور ہمیشہ اس کتاب کو مطالعہ کے بیچ رکھ کر اس کی نصیحت و حکمت کے مطابق عمل کرتا تھا۔

سلطان حسین بادشاہ کے عہد موں شیخ احمد نے ایک امیر اس کا سہیلی وہ آوردہ امیر سارا امیروں کا سردار بڑا دیانت دار تھا ہمت و فضیلت کا رکھن والا خیر و خیرات کا کرن والا.....

خلق اللہ کہ فائدہ کہ واسطے مجھ غریب کو اس وجہ فرمایا کہ اے محمد حسین ملا محمد علی واعظ کے فرزند تم اس کتاب کو پارسی زبان موں کہو اور اس باغ کے درمیان اس وجہ مثنی کا درخت لگا دو"[2]

محمد ابراہیم بیجاپوری نے "انوار سہیلی" کا جو ترجمہ کیا ہے اس میں شک نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ۲۴ برس بعد اور میر امن کی "باغ و بہار" کے

۱۔ "یورپین دکھنی مخطوطات" صفحہ ۵۷۹

۲۔ " " " صفحہ ۵۷۹

۳۔ " " " صفحہ ۵۸۰

(۲۳) برس بعد ہوا۔ لیکن اس پر نئے اسالیب کا بالکل اثر نہیں تھا۔ یہ دکھنی زبان اور قدیم اسلوب ہی میں لکھا گیا ہے یہ ترجمہ محمد ابراہیم بیجاپوری نے مدراس رجمنٹ کے فوجی افسروں کے لئے کیا تھا۔ چنانچہ سرنامہ پر ذیل کی وضاحت درج ہے

"ترجمہ بہ زبان دکھنی فارسی "انوار سہیلی" کا فوجی افسروں کے لئے"

محمد ابراہیم کتاب کے ترجمہ و تالیف کا یہ سبب لکھتے ہیں :-

جب میں نے اپنا عجز و انکسار بتلایا تب حضرت دل سے خطاب مستطاب ہوا کہ اے میاں محمد ابراہیم بن ملک حسین خان بن شیخ محمد بیجاپوری جمعدار دکھنی ہزار سواری کونے کیا کہ اگر کونے مجھ سا فقیر زماں و کیف دوراں اس جہاں بے پایاں میں لیفور تمام ملاحظہ کیجئے تو بھی اس کا دست ارادت دامن مقصود تک نہ پہنچے" [1]

"انوار سہیلی" کے ترجموں کی زبان سے اردو ادب کے عہد بہ عہد ارتقاء کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

شمارہ ہند معروف اردو انوار سہیلی ضیائے حکمت عمر علی خاں وحشت یا وحشی کی تصنیف ۱۲۷۹ھ کی ہے۔ اس اثنا تک زبان کافی منجھ چکی تھی اس کا اسلوب گذشتہ دنوں ترجموں کے مقابلے میں کافی ترقی یافتہ ہے مثلاً یہ جملے :-

اب فارسی کا رواج ختم ہو جانے سے زبان اس کی سخت اور عبارت ایسی پیچیدہ خیال کی جاتی ہے"..... وغیرہ

کہانی کی عبارت کا ایک اقتباس یہ ہے :-

نقل ہے کہ مملکت چین میں ایک بادشاہ تھا عالی جاہ فرخ فال

---

[1] مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ

نام اور اس کا ایک وزیر تھا۔ نیک تدبیر موسوم خجستہ رائے ایک دن بادشاہ اور وزیر پہاڑوں کی طرف شکار کھیلنے گئے“ ...[1]

نوطرز مرصع

اس دور کی ایک مقبول عام کہانی قصہ ”چہار درویش“ ہے جس کے اردو میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ اصل قصہ فارسی میں تھا۔ جو بہت دنوں تک امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا رہا۔ لیکن ریو نے ڈبلیو۔ ایم۔ اوسلے کی سند پر اس کے مصنف کا نام محمد معصوم بتایا ہے۔

ریو لکھتا ہے :۔

یہ قصہ عرصہ دراز تک امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا رہا۔ لیکن ڈبلیو ایم اوسلے نے اپنی فہرست میں مصنف کا نام محمد معصوم تحریر کیا ہے[2]

اس کے کئی ترجمے نظم و نثر میں ہوئے۔ چند ترجموں کا حال نیچے لکھا جاتا ہے :۔

۱۔ ”نوطرز مرصع“ کے نام سے عطا حسین خاں تحسین نے اس قصہ کا ترجمہ کیا
۲۔ ”باغ و بہار“ 〃 〃 میر امن دہلوی 〃 〃 〃
۳۔ ”نوطرز مرصع“ 〃 〃 محمد عوض زرین 〃 〃 〃
۴۔ ”چہار درویش“ 〃 〃 سید حسین علی خان 〃 〃 〃

منظوم ترجموں میں ابھی تک صرف محمد علی خاں کے ترجمہ ”قصہ چہار درویش“ کا پتہ چل سکا ہے۔

قصہ ”باغ و بہار“ فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں لکھا گیا۔ حسین علی خاں نے ”چہار درویش“ ”باغ و بہار“ کے طبع ہونے کے بعد ۱۸۰۷ء میں لکھا تھا[3] عطا حسین خاں کے قریبی زمانے میں محمد عوض زرین نے بھی اسی نام سے ”قصہ چہار درویش“ کا ترجمہ

---

[1] مخطوطات مخزونہ کتب خانہ آصفیہ [2] کیٹلاگ ریو صفحہ ۷۶۲

[3] فہرست اردو مخطوطات“ جلد اول صفحہ ۱۷۵۔ اس کا نمونہ ادارہ ادبیات کتب خانہ میں محفوظ ہے

اب کمیاب ہے۔

اس کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں تھا۔ عطا حسین خاں تحسین کا ترجمہ بہت مشہور ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیقات سے واضح ہوتا ہے[1] میرامن نے اس ترجمہ کو سامنے رکھ کر سنہ ۱۷۷۵ء م سنہ ۱۱۷۰ھ میں "باغ وبہار" لکھی

"نوطرز مرصع" کے سنہ تصنیف کے بارے میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔

محمد یحییٰ صاحب تنہا نے "سیر المصنفین" میں سنہ تصنیف سنہ ۱۷۹۸ء م (سنہ ۱۲۱۳ھ) بتایا ہے[2] حامد حسین قادری نے اپنی کتاب "داستان تاریخ اردو" میں اس سنہ کو معتبر مانا ہے ڈاکٹر عبدالحق دیباچہ باغ وبہار میں اسے سنہ ۱۷۷۵ء م (۱۱۷۵ھ) کے قبل کی تالیف بتاتے ہیں۔ یہ تاریخ قرین قیاس بھی سمجھی جاسکتی ہے کیونکہ انھوں نے باغ وبہار سنہ ۱۸۰۱ء م سنہ ۱۲۱۴ھ میں شروع کی جو سنہ ۱۸۰۳ء م (سنہ ۱۲۱۵ھ) میں ختم ہوئی

"نوطرز مرصع" اس سے پیشتر لکھی جاچکی تھی۔ اس لئے یہ سنہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

تحسین کی "نوطرز مرصع" کے متعلق ڈاکٹر زور "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں کہ وہ چھپی بھی تھی[4]۔ لیکن اب اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ نہیں ملتا اس کا ایک مخطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے۔ جس سے تحسین اور "نوطرز مرصع" پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

حالات زندگی میر عطا حسین خاں تحسین محمد باقر خاں شوق کے بیٹے تھے۔ جنرل اسمتھ کے میر منشی ہو کر ان کے ساتھ کلکتہ گئے۔ جب جنرل اسمتھ ولایت گئے تو تحسین پٹنہ آگئے پھر وہاں سے فیض آباد آکر شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے

---

۱ مقدمہ "باغ وبہار" صفحہ ۵

۲ سیر المصنفین صفحہ ۵۱

۳ مقدمہ باغ وبہار صفحہ ۵

۴ "تاریخ ادب اردو" صفحہ ۹۲

تحسین خوش نویس تھے اس وجہ سے "مرصع رقم" کے لقب سے مشہور ہیں جیساکہ حامد حسین قادری لکھتے ہیں:-

نام میں "مرصع" کا لفظ طرز عبارت کے علاوہ مصنف کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے[1]

تحسین اردو کے علاوہ فارسی کے بھی اچھے انشا پرداز تھے فارسی میں ان کی مندرجہ ذیل تصانیف مشہور ہیں۔

تصانیف

۱۔ "انشائے تحسین"

۲۔ "تواریخ فارسی"

۳۔ "ضوابط انگریزی"

اردو میں ان کی ایک ہی کتاب "نو طرز مرصع" کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً اس ایک کتاب کے علاوہ اردو نثر میں انھوں نے اور کوئی کتاب نہیں لکھی۔

تحسین نے یہ کہانی جیساکہ وہ خود لکھتے ہیں سفر میں دل بہلائی کی خاطر لکھی تھی اس کی تفصیل خود انھیں کی زبانی درج ذیل ہے۔

نواب مبارز الملک افتخار الدولہ جنرل اسمتھ رئیس بہادر صولت جنگ بجرہ میں کلکتہ جا رہے تھے لیکن بہ سبب مسافرت دور دراز کے بعضے وقت طوطی فارغبال دل خفگی مکان کیسے بیچ قفس کشتی کے آتی اس وقت واسطے شغل طبیعت اور قطع منازل کے ایک عزیز سراپا تمیز کہ بیچ رفاقت میری ... کے قمری وار حلقہ محبت اور اخلاص کا اوپر گردن کی رکھتا تھا۔ عندلیب زبان کے تئیں بیچ داستان سرای حکایات عجیب وغریب کی اوقات خوش رکھتا تھا۔ ایک روز بلبل داستان اس حکایت دلفریب تن بیچ ..... کہانی کے مترنم کیا۔ جوہر

---

[1] "داستان تاریخ اردو" صفحہ ۵۸

ایک صدر سے ترنم اس کی دل کے تئیں بے طرح لبھاتے ہیں کہ سُننے
سے تعلق ہے۔ طاوس نگارین خیال کا بیچ دماغ خاطر کی جلوہ گر ہوا۔

لیکن اب "نوطرزِ مرصع" کی اہمیت کہانی سے زیادہ اس کے اسلوب کی بدولت
ہے۔ قبل اس کے کہ "نوطرزِ مرصع" کے اسلوب پر بحث کی جائے۔ تحسین کے انتخاب کی
داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے ترجمے کے لیے ایک ایسی کہانی منتخب کی جس میں ذہن
انسانی کو متاثر کرنے اور مسرت زای کی صلاحیت بدرجہ اتم ہے۔

اچھی کہانی کی صفت یہ ہے کہ اس میں "تعطل" ہوتا ہے۔ یعنے واقعات پے بپے ایسے
ہوتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے شخص کا دھیان ان کی طرف سے نہیں ہٹتا یہ خصوصیت
"نوطرزِ مرصع" میں بدرجہ غائت موجود ہے۔

یوں تو یہ قصّہ پانچ الگ الگ قصّوں کا مجموعہ ہے مگر ان پانچوں میں اسی طرح کا
ایک اتحاد پیدا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ بکاچیو (   ) کی "ڈی کیمرون"
(   ) یا چاسر کی کینٹربری ٹیلز (   )
میں ملتا ہے یعنی چار درویش اور ایک بادشاہ ایک مقام پر جمع ہو کر اپنا اپنا قصّہ
سناتے ہیں۔ ہر ایک کا قصّہ نامکمل رہ جاتا ہے اور ہر ایک سے علی مرتضیٰؑ۔ یونانی
ڈراموں کے دیوتا (   ) کی طرح نمودار ہو کر قصّہ
کو اس کی خواہش کے مطابق تکمیل کو پہنچانے کا وعدہ کرتے ہیں چنانچہ سب قصّوں
کی تکمیل ایک ساتھ ہوتی ہے اور جس طرح سب اشخاص سے دلچسپی ایک وقت میں
شروع ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ہی وقت میں ختم بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو ایک
"اجتماعی قصّہ" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے مختلف سلسلوں کو ایک ربط میں گوندھنے
کی اس کے مصنف نے وہ ساری کوشش کی ہے جو اس سے ممکن تھی اپنی جگہ مکمل اور دلچسپ
ہے اور سب قصّوں کی ایک مجموعی دلچسپی بھی ہے۔

اس قصّے کو تحسین اگر عام فہم زبان میں لکھتے تو میر امن کے ترجمے "باغ و بہار" کی

طرح قبولیت عام حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن تحسین کی ادق زبان موٹے موٹے عربی اور فارسی الفاظ کے استعمال، اور قافیہ اور سجع کی رعایت نے اس قصے کی اتنی شہرت نہ ہونے دی جتنی اس کے دوسرے ترجمے "باغ و بہار" کو حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالحق "نوطرز مرصع" کا مقابلہ "باغ و بہار" سے کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"نوطرز مرصع" اور "باغ و بہار" کے طرز بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ "نوطرز مرصع" کی عبارت نہایت رنگین اور سرتاپا تشبیہات واستعارات سے مملو ہے یہاں تک کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلانے لگتا ہے تحسین نے اپنے بیان میں عام قصہ گوؤں کا طرز اختیار کیا ہے آج کل اس کا پڑھنا طبیعت پر بار ہوتا ہے۔ زبان کا ڈھنگ پرانا ہے اور فارسی ترکیبوں اور الفاظ سے بھر پور ہے"[1]

پہلے درویش کے قصہ کا خاکہ یہ ہے کہ ایک واقعہ ہمارے سامنے لایا جاتا ہے۔ مگر اس کا راز پنہاں ہی رکھا جاتا ہے۔ اور اس واقعہ سے متعدد اور واقعات کی کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں مگر راز ہر ایک کا پنہاں ہی رہتا ہے۔ درویش خود اس راز راز سے ناواقف ہے اور آخر کا ایک بیان سے یہ سب راز کھل جاتے ہیں۔ ذیل میں پہلے درویش کی سیر کا کچھ اقتباس دیا جاتا ہے جس سے تحسین اسلوب کا اندازہ ہوسکتا ہے

درویش اول نے غزال رعنائی داستان ندرت بیان احوال صدق مقال اپنے کے تئیں بیچ چراگاہ صحرائی ...... نے ساتھ لطافت اور ظرافت کی زبان سخن گوئی کیسے اس طرح جلوہ گر تحریر تقریر کا کیا۔"

تحسین عبارت میں موقع بہ موقع اشعار بھی لکھے ہیں مثلاً پہلے درویش کی داستان میں نثر کی مدد کے لئے انھوں نے اشعار سے جو مدد لی ہے اس کا ایک

---

[1] مقدمہ "باغ و بہار" صفحہ ۱۸

نمونہ حسب ذیل ہے۔

دوستاں ویسے سنو حال دل افگار کے تئیں
حالت گریہ اس دیدہ خوں بار کے تئیں

تجھ کو شفقت سے جو پاتا ہوں میں غم خوار اپنا
پس بجا ہے کہ کروں درد کا اظہار اپنا

اے یاران غمگسار مولد وطن اس سرگشتہ یا البیہ آشوب کا بیچ خطہ پاک عجم کے ہے اور والد اس عاجز کا ملک التجار سوداگر تھا نہایت مالدار اور آسودہ روزگار اور اس قدر گنج فراواں بیچ بساط جمعیت کے موجود تھا کہ صراف سپہر کا بیچ صندوق کہکشاں کے خزانہ ستاروں کا نہ رکھتا ہوگا دو فرزند تولد ہوئے از آں یہ عاجز اور دوسری وہ ہمشیرہ عزیز کہ اوس کی تئیں قبلہ گاہ نے بیچ قید حیات اپنی کے ساتھ ایک سوداگر بچہ عالی خاندان کے منکوح کر دیا تھا

اُردو نثر کی با اعتبار الفاظ چار قسمیں قرار دی گئی ہیں[1]

۱- موجز ۲- مقفی ۳- مسجع ۴- عاری

۱- مرجز اس نثر کو کہتے ہیں جس میں وزن شعر تو ہو مگر قافیہ نہ ہو
۲- مقفی وہ نثر ہے جو مرجز کے برعکس ہے یعنی قافیہ تو ہوتا ہے لیکن وزن نہیں ہوتا۔
۳- مسجع ایسی نثر جس کے فقروں کے الفاظ وزن میں برابر ہوں اور حروف آخر میں موافق ہوں۔

۴- نثر عاری جس میں نہ الفاظ کی قید ہے نہ وزن کی نہ قافیہ کی یعنی ان سب باتوں سے عاری ہو۔ آج کل نثر عاری ہی کا رواج ہے۔ معنی کے اعتبار سے ہی

---

[1] اُردو کے اسالیب بیان صفحہ ۱۱۲

اس کی چار قسمیں مقرر ہیں۔

۱۔ سلیس سادہ ۲۔ سلیس رنگین ۳۔ دقیق سادہ ۴۔ دقیق رنگین

۱۔ سلیس سادہ :- وہ نثر ہے جس کے معنیٰ آسانی سے سمجھ میں آجائیں

۲۔ سلیس رنگین :- گو معنیٰ سہل ہوتے ہیں لیکن ادائے مطالب میں مناسبات الفاظ کی رعایت ہوتی ہے۔

۳۔ دقیق سادہ :- جس کے معنی دقت سے سمجھ میں آئیں۔

۴۔ دقیق رنگین :- وہ نثر جس کی عبارت کے معنی بھی مشکل ہوں اور ادائے مطالب میں مناسبت الفاظ کی رعایتیں بھی ہوں۔

ان تشریحات کی روشنی میں "نوطرز مرصع" بہ اعتبار الفاظ مقفی اور بہ اعتبار معنیٰ "دقیق رنگین" کی ذیل میں آتی ہے۔ اور اس بارے میں تحسین کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ جیسا کہ ڈاکٹر زور صاحب بھی لکھتے ہیں[1]۔ اس زمانے کا رواج اور ادبی مذاق ہی اس نہج کا تھا۔ چنانچہ میرامن نے جن کے ترجمے کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی جب "باغ و بہار" نثر عاری میں لکھی اس عہد کے مشہور انشا پرداز رجب علی بیگ سرور نے اس کا مذاق اڑایا۔ "نوطرز مرصع" میں تحسین نے قصہ چہار درویش کو اردو میں منتقل کرتے وقت اس کا خیال ضرور رکھا ہے کہ رسم و رواج۔ ساز و سامان۔ کھانے پوشاک وغیرہ ہندوستانی ہوں اور یہ ان کے لیے ایک فطری بات تھی۔ قصے کے افراد وہ کہیں سے لاسکتے تھے لیکن قصے قصا کو ہندوستانی بننے سے وہ نہیں روک سکتے تھے۔

بہار دانش کے ترجمے شیخ عنایت اللہ دہلوی نے ۱۶۵۱ء م ۱۰۶۱ھ میں "بہار دانش" کے نام سے ایک قصہ لکھا تھا جس میں

---

[1] اردو کے اسالیب بیان صفحہ (۱۱۰)

جہاں دار شاہ اور بہرہ ور بانو کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد حیدر بخش حیدری نے بھی اس کا ترجمہ "گلزار دانش" کے نام سے کیا۔ لیکن ان سے پہلے اس کے بہت سے دکھنی ترجمے ملتے ہیں۔ جن کی تفصیل ڈاکٹر گیان چند لکچرار حمیدیہ کالج بھوپال نے اپنے مضمون۔ "چند فراموش شدہ داستان"[1] میں دی ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل مشہور ہیں

۱۔ داستان جہاں دار دکنی نثر میں فارسی کا ترجمہ ہے اس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو میں موجود ہے۔

۲۔ "بہار دانش" بھی دکنی نثر میں ہے لیکن یہ اول الذکر داستان جہاں دار سے مختلف ہے۔ اس کا بھی مخطوطہ انجمن ترقی اُردو میں تھا

۳۔ "ہمیشہ بہار" سید حسین علی نے اس کا ترجمہ سنہ ۱۲۵۰ھ میں کیا اس کا قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ چونکہ یہ فورٹ ولیم کالج کے بعد کی تصنیف ہے اس لیے اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ مذکورہ بالا دو مخطوطوں تک راقم الحروف کی رسائی نہ ہو سکی۔

نگار دانش و مفرح القلوب اس کا ماخذ بھی سنسکرت زبان کا قصہ ہے۔ جسے "نگار دانش" اور "مفرح القلوب" کے نام سے فارسی کا جامہ پہنایا گیا۔ فورٹ ولیم کالج میں میر بہادر علی حسین نے "اخلاق ہندی" کے نام سے اس کا ترجمہ اردو نثر میں ہو چکے تھے چنانچہ ان کا مجموعہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے[2] نصیر الدین ہاشمی نے ان کی تفصیل لکھی ہے:۔

---

[1] اردو کی چند فراموش شدہ داستانیں مطبوعہ رسالہ "اردو" جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

[2] ملاحظہ ہو یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۰۷

انڈیا آفس کے کتب خانہ میں "بہار دانش" کی حکایتوں کے دو مخطوطات ہیں جن میں دکھنی نثر میں اس کی بعض حکایات کا ترجمہ کیا گیا ہے بلوم ہارٹ نے اس کی اس طرح صراحت کی ہے :-

دکنی زبان میں یہ حکایات ہیں۔ ان کا مصنف مرزا محمد اسمٰعیل ہے ڈاکٹر نے انگریزی میں سرورق پر مصنف کا نام لکھا ہے۔ یہ حکایات فارسی بہار دانش سے ترجمہ کی گئی ہیں؟

جس میں بہار دانش کی بارہ حکایات میں سے صرف چھ حکایات ترجمہ کیا گیا ہے حکایات یہ ہیں۔

۱۔ حکایت سوداگر ۲۔ چوہوں کا بادشاہ ۳۔ قصہ احمق برہمنی
۴۔ احمق عورت ۵۔ خوبی قسمت ۶۔ حکایت جنگلی شہزادہ۔

یہ قصہ دکہنی میں لکھا گیا تھا اس کا اقتباس درج ذیل ہے'۔

"روایت کرنے ہارے خبروں کی ایسے روایت کرتی ہیں کہ بیچ ملک دکہن کے ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اس بادشاہ کو سات بیٹے تھے ایک روز وہ ساتوں شہزادے واسطے شکار کی بادشاہ سے آکر بادشاہ رضا دیا۔ اور فوج اپنی ہمراہ کیا جب یہ ساتوں شہزادے واسطے شکار کی طرف ایک جنگل کے گئے' لاکن کہیں ایک جانور چرند پرند نہیں نظر آیا"[1]

مذکورہ قصوں کے علاوہ جن میں سے اکثر فارسی یا سنسکرت کے ترجمے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں طبع زاد افسانے بھی کافی لکھے گئے۔ ان میں سے ایک عیسیٰ خاں کا قصہ" دلبر و مہر افروز" ہے جس کا مخطوطہ آغا حیدر حسین صاحب کے

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۷۰

ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ قصے کے پیرائے میں "جشن مہتابی" کا بڑا عجیب حال لکھا ہے۔ جشن مہتابی مغلوں کے عہد کا خاص جشن تھا۔ جو چاندنی رات میں منایا جاتا تھا۔ اس مصنف کی ایک اور تصنیف بھی ہے جس کا موضوع اخلاقیات ہے اس کا مخطوطہ بھی آغا صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

عیشی خاں کے حالات کا پتہ نہ چل سکا۔ رامپور کے کتب خانہ میں عیشی خاں کی ایک مثنوی "قصہ بخشی طوائف" کا حال پروفیسر سروری کی بیاض سے معلوم ہوا ہے۔ اس مثنوی میں ان کا تخلص جرأت تبلایا گیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۹۵ء میں لکھی گئی ممکن ہے کہ یہ عیشی خاں قصہ "دلبر و دل افروز" ہی کے مصنف ہوں۔

چہار چمن ڈاکٹر گیان چند کے مضمون "اردو کی چند فراموش شدہ داستانیں"[۵۱] سے ایک اور قصہ "چہار چمن" کا سراغ ملتا ہے جو نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ۱۷۹۷ء م ۱۲۱۱ھ میں لکھا گیا تھا۔ اس کا مخطوط دستیاب نہ ہو سکا ڈاکٹر گیان چند نے جو تفصیلات دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورق پر اس کا نام "چار چمن" درج ہے۔ لیکن دیباچے میں اس کا نام "دلفریب" بھی لکھا گیا ہے اس کا مصنف عاجز یا فاخر نامی کوئی شخص تھا۔ قصہ "الف لیلیٰ" کے قصوں کی طرح کا ہے۔ جس میں تبایا گیا ہے کہ ایک بادشاہ ہر شام ایک عورت سے شادی کرتا تھا اور ایک رات بعد اسے طلاق دے کر دوسری شادی کر لیتا۔ ایک عورت "بزم افروز" نے شہزادہ کی طرح ہر شب ایک نئی کہانی سنانی شروع کی اور اس طرح بادشاہ کو دوسری شادی کرنے سے باز رکھا۔ اس کی زبان کافی رنگین ہے

پروفیسر گیان چند نے دو اور داستانوں کا حال لکھا ہے جو اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں[۵۲]

---

۵۱ مطبوعہ رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۱ء

۵۲ اس کا علم راقم الحروف کو ڈاکٹر گیان چند جین ایم۔اے۔ڈی فل لکچرار حمیدیہ کالج کے خط سے ہوا۔

۱۔ "جذبۂ عشق" یہ داستان شاہ حسین حقیقت نے ۱۲۱۱ھ میں لکھی تھی اس میں ۱۲۰۱ھ کی ایک عشقیہ داستان کو قلمبند کیا گیا ہے۔

۲۔ "قصہ ہائے قلمی" یہ تصنیف مکمل داستان نہیں بلکہ قصص کا ایک نامکمل مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اڈنبرا یونیورسٹی میں (۴۹) صفحوں کا ایک مخطوطہ ہے جس میں پرندوں کی عقلمندی کی کہانیاں درج ہیں آخری کہانی میں مصنف نے اس وقت کے کلکتہ اور مونگھیر کا حال بتایا ہے۔ زبان شمالی ہند کے قصبات کی سی ہے مثلاً:۔

"دو کبوتر ایک کوندہ کے درمیان رہتے تھے"

قصص کے علاوہ ایسی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا گیا ہے جن کا موضوع اخلاقیات ہے۔ ان میں سعدی کی مشہور کتاب "گلستان" کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔ سعدی کی اس تصنیف کا دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو کے پانچ مختلف[1] ترجموں کا حال نصیر الدین صاحب ہاشمی کی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سے معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۷۰۹

(۱۰)

دہلی کے شعرا اور اُردو نثر

مغلوں کا دکن پر تسلط ۔ ریختہ کا رواج ۔ میر جعفر زٹلی کا نثری کارنامہ ۔ محمد حسین کلیم ۔ فضلی کی "دہ مجلس" دہ مجلس کے نسخے ۔ سراج الدین علی خاں ۔ آرزو کی تصانیف ۔ عبدالولی عزلت ۔ مرزا رفیع سودا ۔ قتیل ۔ سعادت یار خاں رنگین ۔ انشاء اللہ خاں انشاء ۔ مرزا جان طپش ۔ اس دور کی نثر پر تبصرہ ۔

دہلی کے شعرا اور اردو نثر

شمالی ہند کے تہذیبی مرکزوں خاص طور پر دہلی میں ایرانی اثرات اور فارسی ادب اور شاعری کی مقبولیت کی وجہ سے ادبی اظہار کے لیے اعلیٰ طبقہ کے لوگ فارسی ہی کو اختیار کرتے تھے، اور ہندوستان کے عام باشندے ہندو اور مسلمان مقامی بولیوں جیسے برج بھاشا، اودھی، راجستانی وغیرہ میں لکھتے تھے[1] اس کا نتیجہ یہ تھا شمالی ہند میں سترھویں صدی عیسوی سے پہلے اردو کو ایک ادبی زبان کے طور پر سنجیدگی کے ساتھ کبھی اختیار نہیں کیا گیا۔ مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ، فارسی عمل دخل بھی ادبی فضاء سے مٹنے لگا، اور اس خلا کو پر کرنے کے لیے اردو آگے بڑھنے لگی یہاں تک کہ خود مغلوں کے آخری دور میں اس نے زبان اردوئے معلےٰ" کا رتبہ بھی پا لیا۔ عالمگیر کے فتح دکن کے بعد شمال اور جنوب میں حد فاصل پھر ناپید ہوگئی، اور ایک مرتبہ پھر شمال اور جنوب کی تہذیب اور ثقافت میں میل ملاپ رونما ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ادبی روایات بھی شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کو سفر کر پہنچنے لگے۔ انھیں میں دکنی اردو شاعری کی روایات بھی تھیں جو کئی راہوں سے شمال پہنچیں۔ میر کے "نکات الشعرا" میں دکھن کے شعرا کی روایات عبدالولی۔ عزلت کے ذریعہ پہنچیں۔ اس طرح سے

۱۔ انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۲۰۰

رفتہ رفتہ شمال کی ترقی یافتہ زبان دکن پہنچنے لگی۔ عالمگیر کے بارے میں فتوت اپنے تذکرہ ریاض حسینی میں لکھتا ہے کہ جب اس نے دکن فتح کیا تو نصرتی کے کلام سے متاثر ہو کر اسے خطاب بھی عطا کیا تھا۔ فتوت کا بیان حسب ذیل ہے:۔

"وقتیکہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی انار اللہ برہانہ ولایت دکن را در تسخیر آورد حکم بہ نفاذ پیوست کہ سخن سنجاں این ملک را در نظر بگذرانند بموجب حکم گزرانیدند کلام نصرتی را بر ہمہ افضل فرمودہ بہ خطاب ملک الشعراء ہند سرفرازی یافت"[۵۱]

عالمگیر کی مدح دکن کے اکثر شعرا نے لکھی ہے۔ انھیں میں ایک ضعیفی بھی تھا۔ وہ قطب شاہی دور کا آخری شاعر تھا اس نے کئی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے ایک مثنوی "ہدایت نامہ" بھی ہے جس میں اس نے فقہ حنفی کے عقاید قلمبند کیے اس میں وہ اورنگ زیب کی مدح اس طرح کرتا ہے۔

یہہ دور جہاں دار اورنگ زیب + کہ جس نے ہوا رس زمانے کو زیب
شہنشاہ عادل رہے در امور + کہ بدعت ضلالت ہوا جس منے دور
دیا حق تعالیٰ نے یوں جس کو جس + جو دشمن ہوا اس انگے خوار و خس
دھریا سو یو جیں شہی کا وو تاج + دکی ہور دکھن کا ہوا ایک راج[۵۲]

دکھن کے اردو شعرا کی ان مدحوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب ہی کے زمانے سے اردو مغلیہ دربار میں بھی رسوخ پانے لگی تھی۔ یعنی علما نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر اور شاہ جہاں بھی ہندی میں شعر کہتے تھے۔ پروفیسر حسن عسکری نے اپنے مضمون "شمالی بہار" کے ایک شطاری صوفی بزرگ احمد الدین راجگیری[۵۳]

۵۱۔ مخطوطہ تذکرہ فتوت مقبوضہ دفتر دیوانی و مال

۵۲۔ "دکن میں اردو" صفحہ ۲۵۸

۵۳۔ شمالی بہار کے ایک شطاری صوفی "(امام الدین راجگیری) از محمد حسن عسکری

میں اورنگ زیب کا مندرجہ ذیل دوھا نقل کیا ہے :-

" یہ دکھ میرے کن سو کہوں [1]
جو دیا سو ٹہار رہا جو را کہا سو جائے "

اور اس میں کچھ تعجب کی بات بھی نہیں۔ کیونکہ مغل شہنشاہ اور ان کے امرا اس زبان سے بول چال کی زبان کی حیثیت نا واقف نہیں تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے دربار کی زبان فارسی رہی تھی۔ اسی طرح خاص طور پر دھلی کے عوام اس زبان سے نامانوس نہیں تھے۔ کیونکہ یہ انھیں کی بولی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ولی پہلے پہل دلی جاتے ہیں تو وہاں ان کی آو بھگت اسی طرح ہوتی ہے گویا وہ دھلی ہی کے شاعر تھے پھر ان کا طرز اتنا مقبول ہوتا ہے کہ اکثر شاعران کی پیروی میں ریختہ لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ میر اور قائم کے شعر شاہد اس بارے میں قطعی کا حکم رکھتے ہیں۔ میر نے فرمایا تھا۔

ع :- معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور قائم کہتے ہیں :-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ

یہ ذوق رفتہ رفتہ گوشے گوشے میں پھیل گیا اور ریختہ نے فارسی کی جگہ لے لی۔ اور اس میں خدائے سخن میر۔ بادشاہ سخن سودا۔ درد۔ حاتم۔ مظہر جان جاناں۔ یکرنگ۔ ناجی اور بالآخر آتش۔ ناسخ۔ ذوق اور غالب جیسے شاعر ہوتے ہیں۔

لیکن نثر کا معاملہ اس کے برعکس ہے جیسا کہ محمد یحیی تنہا اپنے تذکرے

---

[1] اس کا ہم معنی فارسی شعر یہ ہے :-

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد + وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

"سیر المصنفین" میں لکھتے ہیں:-

اس وقت نثر اردو میں لکھنا ایک قسم کی توہین سمجھا جاتا تھا بالفاظ دیگر نثر اردو لکھنے کے یہ معنی تھے کہ لکھنے والا فارسی اظہار خیال کی قدرت نہیں رکھتا۔ غدر کے بہت بعد تک یہی حال رہا ہے۔ دوستانہ خط و کتابت معمولی اشخاص فارسی زبان ہی میں کرتے رہے[۵۱]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی کے شعرا جنہوں نے شعر و سخن کے لیے اردو شعرا کے تذکرے۔ مکاتیب حتیٰ کہ اگر اردو کلام کے لیئے عنوان بھی مقرر کرنا ہوتا تو یہ شاعر فارسی ہی سے کام لیتے تھے۔ میر کا "نکات شعرا" میر حسن کا تذکرۃ الشعرائے اردو" لچھمی نارائن شفیق کا "چمنستان شعرا" قدرت اللہ شوق کا "طبقات الشعرا" اور اس طرح کے دوسرے تذکرے شامل ہیں۔

سب سے پہلی نثری کتاب جس کا تذکرہ ملتا ہے وہ فضلی کی "دہ مجلس" ہے اور اس کے بعد محمد حسین کلیم کی اردو نثر کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن شمالی ہند کے نثری آثار میں ایک چیز اب تک مورخین اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہی اور یہ ہے اردو کے ابتدائی مزاحیہ شاعر میر جعفر زٹلی کے دیوان کا وہ حصہ جس میں اس نے نثر میں کچھ کہاوتیں اور ضرب الامثال لکھی تھیں۔

میر جعفر زٹلی ۱۰۶۸ھ تا ۱۱۲۵ھ

میر جعفر ہزل گو شاعر تھے اسی مناسبت سے انھوں نے "زٹلی" تخلص اختیار کیا تھا یہ یہ نارنول کے باشندے تھے۔ اورنگ زیب کے بیٹے کام بخش کے ساتھ دکن آئے اور اس زمانے میں شاعری شروع کی۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ فارسی میں ہے۔ لیکن جو اردو کلام ملتا ہے وہ بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں۔ خصوصاً بیان کی ندرت اور اچھوتے پن

---

۵۱ "سیر المصنفین" صفحہ (   )

کے لحاظ سے ان کا اردو کلام قابل ذکر ہے گو انھوں نے سنجیدہ شاعری کی طرف توجہ نہیں کی لیکن "مرثیہ عالمگیر" سے جو انہوں نے اورنگ زیب کی وفات پر لکھا تھا ان کی سنجیدگی اور شرافت نفس کا پتہ چلتا ہے۔

زٹلی نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد کی ہنگامہ آرائیوں اور طوائف الملوکی کی ستم رانیوں کی بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ ایک مثنوی میں خود اپنے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ ان کی ہزل گوئی اور ہجو سے سب ہی خائف رہتے تھے یہاں تک کہ امراء اس لیئے ۱۱۲۵ھ م ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیے گئے۔

ڈاکٹر زور نے ان کی مندرجہ ذیل کتب کا تذکرہ کیا ہے۔

تصانیف ۱۔ اخبار سیاسیہ:۔ جس میں متفرق واقعات پر چار کہانیاں ہیں جو اورنگ زیب کے سامنے بیان کی گئی ہیں۔ اردو میں اس کا جواب بھی ہے گو جواب چار سطروں میں ہے بقول ڈاکٹر زور۔

"وہ اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ شہنشاہ بھی اپنی خانگی گفتگو میں اردو زبان استعمال کرتا تھا"

۲۔ "اخبار دربار معلیٰ" جس میں پانچ قصے ہیں جن میں سے چار خود شاعر کے متعلق ہیں اس میں بتلایا گیا ہے کہ وہ درباریوں سے کس طرح روپیہ کھینچتا تھا ان کو بن کر بادشاہ نے کیا جواب دیا۔

۳۔ اس کے علاوہ اس کا مجموعہ نظم بھی ہے جس میں ۴۵ نظمیں ہیں ان ۴۵ نظموں میں مندرجہ ذیل چار بہت مشہور ہیں۔

۱۔ سلوک ۲۔ جوبن نامہ ۳۔ اختلاف زماں ۴۔ مرثیہ عالمگیر

۴۔ کلیات کا ایک نسخہ پروفیسر سروری نے رامپور کی رضا لائبریری میں دیکھا تھا جس کا نوٹ راقم الحروف کو ان کی بیاض میں ملا۔ اس کلیات میں نثر کے کچھ حصے

اے ملاحظہ کیجئے "اردو شہ پارے" صفحہ ۱۳۱

بھی شامل ہیں۔

ان کی دوسری تصنیف اخبارات دربار معلے کے متعلق ڈاکٹر زور کا بیان کیا جا چکا ہے لیکن پروفیسر محمود شیرانی لکھتے ہیں۔

"محمد معظم کے دور میں میرتے ایک رسالہ دربار معلے کے نام سے لکھا ہے۔ جس میں اول دربار کے فرض وقائع بیان کیے جاتے ہیں۔ پھر ان کے متعلق شاہی احکام صادر ہوتے ہیں۔ میر جعفر نے یہ شاہی احکام اکثر ضرب الامثال کی زبان میں ادا کر دے ہیں"۔

اس کے بعد انھوں نے (۲۲) ضرب الامثال نقل کیے ہیں جن میں سے چند نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ چوم چہاڑا بھاری پتھر ۲۔ تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی آپ نبیڑ
۳۔ ہمارا حاکم ضامن جاہے ۴۔ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا
۵۔ دم جو پکڑی بھیڑ کی وارا ہوا نہ پارا۔

راقم الحروف کو کتب خانہ آصفیہ میں "لغات ہندی" کے نام سے ایک مخطوطہ[1] نظر آیا جو قدیم دستی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ کتاب تصنیف (۷۸) برس بعد کی ہے یعنی ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس میں (۱۵۵۹) کہاوتیں یکجا کی گئی ہیں۔ جن میں سے بعض فحش بھی ہیں۔ اندرونی شواہد کی بناء پر راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ زٹلی ہی کی لکھی ہوئی ہیں اس نسخہ کی کچھ ضرب الامثال نقل کی جاتی ہیں۔

آ بلا گلے لگ جا
آپ ڈوبا تو جگ ڈوبا
آپ ڈھاپ عیب خود بہ پوش

---

[1] نمبر مخطوطہ ۵۵۷ فن لغت

اپنے منہ دھنا بھائی۔ آپ ہی میاں منگتا باہر کھڑے درویش
اتا و لا سو باولا ۔ اترا شحنہ مردک نام
رتی تورائی ہوگی جو راستے میں پڑے ۔ آنکا بنبا سوواد دیوے
اجڑے گھر کا بلینڈا سقف یا ستون ۔ اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام
چھوہاں میں سماتا نہ تھا کانوں باندھا چھاج
سُن لے ڈھول بھر کے بول
سمن (رحیمن کی خرابی) دھاگا پریم کا تورو چٹکائے
تورے ہر جیون جور ہو بیچ گانٹھ پڑ جائے ۔
احسان لیجئے جہان کا نہ احسان لیجئے شاہ جہان کا"
ٹٹی کے اوٹ شکار کھیلے۔
ہری بہرے مل گئے جلوے کے وقت ٹل گئے۔
ہرن کھائے کھیت منہ سونگھا جائے بکری کا۔
ہزار ہاتھی کٹا تو بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔
ہزار لاٹھی ٹوٹے تو بھی گھر بار کے بانس توڑنے کو بس ہے
ہنس ہنس کھائے بھوہڑ کا مال

محمد حسین کلیم جعفر زٹل کے بعد شمالی ہند کے شعرا میں "محمد حسین کلیم" کا نام ملتا ہے جن کے متعلق میر حسن تذکرۃ الشعرا میں لکھتے ہیں کہ ہناری نثر میں ایک کتاب "ایجاد" کی تھی

۱۔ میر تقی میر تذکرہ نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ کلیم در فارسی گذشتہ است اما کلیم ریختہ فقیر این است قطع نظر بندہ را بہ خدمت او قرابت قریبیت است یک اخلاص تہ دلی دارم مداکثر بہ حال ایں، ہیچ منزان شفقت

می فرماید"[۱]

۲۔ میر حسن تذکرۃ الشعرا میں تحریر فرماتے ہیں۔

" درفن شعر و شاعری استاد سخن بحر ذخار طبعش درنثر ونظم موج زن رسالہ درعروض و قافیہ ہندی تصنیف فرمودہ "و فصوص" راکہ عربی است زبان ریختہ ترجمان کردہ کتابے نثر در ہندی نیز ایجاد کردہ"[۲]

میر حسن کے اس بیان سے نثر میں کتابوں کی کمیابی کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۔ مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ کلیم نے عروض و قافیہ پر اردو میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا اس کے علاوہ مرزا نے ان کی دو اور نثری کتابوں کا بھی تذکرہ کیا۔ لکھتے ہیں۔

" ایک رسالہ عروض و قافیہ کا زبان ریختہ میں لکھا ہے اور "فصوص الحکم" کا ترجمہ بھی ہندی زبان میں لکھا ہے۔ ایک نثر اور بھی زبان ریختہ میں ریختہ قلم معنی رقم رکھتا ہے"[۳]،

۴۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ "گلشن بے خار" میں کہتے ہیں کہ وہ میر تقی میر کے بہنوی تھے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے طب بھی جانتے تھے۔ دیوان اور مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں"

مگر ان کے دیوان اور مثنویوں کا تذکرہ کسی اور نے نہیں کیا۔

مولوی عبدالحی تذکرہ گل رعنا میں لکھتے ہیں:۔

۱۔ نکات الشعرا مجموعہ انجمن ترقی اردو صفحہ

۲۔ منقول از "گل رعنا" صفحہ ۱۱۱

۳۔

سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ ایسے بڑے فاضل شخص کے حالات اب تک نہ تذکرہ مشائخ میں ملے نہ اور کسی کتاب میں معلوم نہیں کس خاندان میں پیدا ہوئے کس سے تعلیم پائی کس کی صحبت میں حقایق و معارف کا چسکا پڑا کس سے مشورہ سخن کرتے تھے اور کس سنہ میں وفات پائی"[۱]

لیکن کلیم کی مذکورہ بالا تصانیف اب نایاب ہیں۔ راقم الحروف کو کسی کتب خانہ میں ان کا پتہ نہیں چل سکا۔ حامد حسن قادری نے کلیم کا اردو نقرہ نقل کیا ہے جس کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"میر حسن نے حکیم کا صرف ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہی فقرہ تبرک کی طرح تمام مصنفین "آبِ حیات" و "سیر المصنفین" و "یوپی میں اردو" وغیرہ میں دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے"[۲]

جہاں تک سیر المصنفین کا تعلق ہے۔ مرتب مقابلہ کو اس میں نہ تو کوئی اردو نقرہ محمد حسین کلیم کا ملا۔ اور نہ ان کا تذکرہ سیر المصنفین میں سرے سے کلیم کا ذکر ہی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کہ پھر یہ تسامح قادری صاحب کو کس طرح ہوا۔

کلیم کا وہ نقرہ جو احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے پر کہا گیا تھا یہ ہے

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو ر بصیر الہی دولت سے زینہار زینہار فاعتبرو یا اولی الابصار"

غالباً یہی ایک دو جملے ہیں جو کلیم کی نثر کے نمونے کے طور پر اب ہماری دسترس

---

[۱] تذکرہ "گلِ رعنا" صفحہ ۱۱۳

[۲] داستانِ تاریخ اردو صفحہ ۱۵۱

[۳] اردو کے اسالیب بیان صفحہ ۳۷

یں ہیں۔ کلیم شاعر بھی اچھے تھے گو اکثر تذکرہ نویس ان کو اعلیٰ پایہ کا شاعر نہیں مانتے لیکن ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے زمانے کے منجھے ہوئے سخن سنج تھے۔ شعر جو خاصہ مقبول ہے۔

غرورِ حسن کیا ممکن کسی کی داد کو پہونچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہونچے

گارساں ڈی۔ تاسی نے ایک کتاب روضتہ الشعراء کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس کے مصنف کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ حاشیہ میں مترجم نے اسے محمد حسین کلیم کی تصنیف بتایا ہے[1]

حاشیہ کی عبارت یہ ہے:۔

"مصنف کو دھوکہ ہوا ہے یہ تذکرہ نہیں بلکہ محمد حسین کلیم کا قصیدہ ہے جس کے متعلق میر صاحب نے لکھا ہے" یہاں محمد حسین کلیم... قصیدہ گفتہ مسمی بہ روضتہ الشعراء دراو نام تمام شعرا نقل کردہ "

سوائے اس کے محمد حسین کلیم کی اور کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ کلیم کے مندرجہ بالا ایک دو جملوں سے اندازہ لگتا ہے کہ دکھن کی بہ نسبت شمالی ہند میں عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا چلن زیادہ ہے اس کے برخلاف جیسا کہ آئندہ صفحات میں پیش کردہ نمونوں سے واضح ہوگا دکھن کی زبان سلیس اور عام فہم تھی۔ تب ہی تو شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:۔

شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء تک کوئی نثر اردو کی کتاب ہماری نظر سے ایسی نہیں گزری جس میں کوئی فن یا کسی طرح کا قصہ بیان ہوا ہو جا بجا اگلے وقت کی عبارتیں لکھی دیکھی ہیں جن میں لغات غیر مانوس عربی فارسی کا جماو اور قافیوں اور ذومعنی لفظوں کے چھوٹے نگینے

---

[1] خطبات گارساں ڈی تاسی صفحہ ۱۰۱

بہت سے جڑ دیے ہیں"

فضلی شمالی ہند کے اوّلین نثر نگار کی حیثیت سے مولانا فضلی کا ذکر تقریباً سارے تذکرہ نگار کرتے آئے ہیں اور خود فضلی کو اپنے اس "اجتہاد" پر فخر تھا۔ چنانچہ اپنی کتاب "کربل کتھا" (ترجمہ دہ مجلس) کے مقدمے میں انہوں نے صاف الفاظ میں لکھا ہے۔

کوئی اس صفت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر میں نہ ہوا"

حالات زندگی فضل علی نام اور فضلی تخلص تھا۔ نواب شرف علی خاں کے بیٹے تھے محمد شاہی عہد میں ہوئے مولانا احسن مارہروی انہیں اورنگ آبادی بتاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

اس لحاظ سے کہ ۱۱۶۱ھ میں فضلی نے دوبارہ اپنے ترجمے کی اصلاح کی ہے اور اس گمان پر کہ شاہ فضل اللہ فضلی حنفی و نقشبندی کے سوا دوسرے فضلی کا پتا نہیں ملتا حسب تحریر تذکرہ "محبوب الزمن" مذکور کی وفات ۱۱۶۳ھ میں بعید از قیاس نہیں سمجھی گئی"[1]

چنانچہ حامد حسن قادری نے بھی اپنی کتاب داستان تاریخ اردو میں احسن مارہروی کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور لکھتے ہیں۔

اس بناء پر فضلی کا دکن لاصل ہونا لازم ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ فضلی دکن میں نہیں رہے۔ شمالی ہند میں رہ کر انھوں نے علم حاصل کیا انشا پردازی سیکھیں اور تصنیف تالیف کی

---

[1] منثورات (تاریخ نثر اردو) صفحہ ۶۴

ان کے ان کے دیباچہ کی تمام نثر میں اور کہیں دکنی الفاظ روزمرہ اور
اسلوب پایا جاتا جبکہ دکن میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط
تک الفاظ و زبان کی قدامت موجود ہے" [1]

مولف تذکرہ محبوب الزمن فضلی (فضل اللہ) کے حالات میں فضلی کو سُنّی
بتایا ہے۔ ڈی تاسی۔ کریم الدین و فیلن ان کو "شیعہ" لکھتے ہیں۔

اس لئے راقم الحروف کے خیال میں مولانا احسن مارہروی کو فضلی نام سے مغالطہ
ہوا ہے۔ فضلی اورنگ آبادی دوسری شخصیت ہیں جو فضلی (دھلوی) کے تقریباً
معاصر تھے۔ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء ان کا تذکرہ خواجہ خاں حمید نے "ریاض الحسنیٰ" میں فتوت نے
"تذکرہ فتوت" میں لچھمی نارائن شفیق نے "چمنستان شعرا" میں اور اسد علی خاں تمنا نے
"گل عجائب" میں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام شاہ فضل اللہ اور
فضلی تخلص تھا۔ یہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے باپ سید عطاء اللہ
غازی الدین فیروز جنگ کے ساتھ عرصہ دراز تک رہے۔ فضلی اورنگ آبادی ہی کئی
کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے قصہ پریم لوکا' قصہ بیوہ بیوکا اور دو مثنویاں ہیں
فن سلوک میں ایک رسالہ فارسی میں "زاد راہ" لکھا تھا ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں ان کا انتقال ہوا [2]

سب سے پہلے کریم الدین نے "طبقات الشعرا" میں فضلی کے نثری کارنامے "کربل کتھا"
کا ذکر لکھا ہے اور دیباچے کا ایک طویل اقتباس بھی دیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:۔

اس جائے تک مصنف کے کلام تمام ہونے اب میں کہتا ہوں کہ اس کتاب
کو میں نے دیکھا وہ میرے پاس موجود تھی اس مصنف نے ڈھنگ اس کا
اچھا ڈالا ہے مگر اتنا قصور ہے کہ عبارت اچھی نہیں یعنی بول چال
اور محاورات متقدمین کے ہیں یہ اس کا قصور نہیں واقع میں اس کے

---

[1] داستان تاریخ اردو صفحہ ۵۳ [2] "دکن میں اردو" صفحہ ۳۳۲

زمانے میں اردو زبان ایسی صاف نہ ہوئی تھی جیسی کہ اب ہے۔ یہ بات اس مصنف کی گفتگو سے بھی ثابت ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ میں اس کتاب کی تصنیف میں دلیری نہ کرسکتا تھا بسبب اس کے کہ اب تک کوئی ترجمہ فارسی سے زبان اردو میں نہیں ہوا بلحاظ طعنہ لوگوں کے رو کا ہوا تھا۔ مصنف کا مذہب شیعہ ہے اس نے مرثیہ اور مناقب اور مدح ائمہ میں بیت، شعر کہے ہیں مگر سب بہ سبب محاورات قدیم کے لچر ہیں چند شعر جو اس نے شہادت امام قاسم کے بیان میں لکھے ہیں وہ لکھتا ہوں وہ کہتا ہوں کہ اس وقت ماں بہن کرکے روتی تھی اور دلہن چیخ مار کر کہتی تھی۔

"تقدیر نے میرے تئیں گھونگھٹ ہی میں افسوس
میرے بنے کی مجھے لا لاش دکھائی" [1]

اس کے بعد پورا مرثیہ نقل کیا ہے

گارسان ڈی تاسی اپنی تاریخ ادبیات جلد اول میں فضلی کے متعلق لکھتا ہے

فضلی نے وہ مجلس نثر مخطوطہ بہ نظم میں بطرز قدما لکھی ہے۔ فورٹ ولیم میں ظاہرا اس کا قلمی نسخہ تھا۔ حیدری کی گل مغفرت کا نہیں، فضلی نے یہ کتاب شرف علی کی ماں کے لیے لکھی تھی۔ اس یہ نگرہ کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ تھا اور یہ دہلی میں ۱۸۵۰ء میں طبع ہوئی ہے۔ فضلی شیعی تھے انھوں نے اس کتاب کے علاوہ بہت سے مراثی مناقب اور مدح ائمہ اور اماموں کی مدح لکھی" [2]

---

[1] مخطوطہ طبقات الشعراء مملوکہ شمس اللہ قادری

[2] ہسٹری دی لٹراچور جلد اول صفحہ ۴۵۷، ۴۵۸

طبقات کے بعد ایک کیٹلیو گ آف دی ببلوتیکا اورنٹیالس اسپرنگریانا[1] ہے جس میں ان کتابوں کا ذکر ہے جو اسپرنگر کے ذاتی کتب خانے میں تھیں اور جو غالباً سب کی سب برلن کے ملکی کتب خانے میں جنگ عالمگیر سے قبل موجود تھیں۔ اس فہرست کے صفحہ ۱۲ میں نمبر ۱۷۳ دہ مجلس کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے"[2]

دہ مجلس حسین اور ان کے رشتہ داروں کی موت کل حزنیہ نظم و نثر میں از فضلی جو محمد شاہ کے عہد میں ہوا تھا"[3]

آب حیات میں لکھا ہے کہ

محمد شاہ کے عہد ۱۱۵۵ھ میں ایک بزرگ تھے جن کا تخلص فضلی تھا انھوں نے دہ مجلس نام ایک کتاب لکھی تھی غالباً یہی اُردو کی پہلی تصنیف ہوگی"[4]

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

بہر حال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی زبان اردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی جن کی تصنیفات۔ عاشقانہ اور مدحیہ قصیدے ہوتے تھے اور ان سے غرض امرا و اہلِ دل سے انعام کا تھا۔ نثر کے حال پر کسی کی

---

[1] دہ مجلس دی لٹریچیکل ہسٹری اف دی ڈیتھ اف حسین اینڈ ہز ریلیٹیوز ان پروز اینڈ ورس بائی فضلی ہو فلوریشڈ انڈر محمد شاہ"

[2] اس کا حوالہ قاضی عبدالودود کے مضمون "دہ مجلس فضلی" مطبوعہ معاصر میں ملتا ہے

۔ موصوف کا بیان ہے کہ یہ عبارت ان کے دوست شاہ مقبول احمد استاد اردو سنٹرل کالج کلکتہ نے ان کی استدعا پر نقل کر کے بھیجی ہے

[3] آب حیات صفحہ ۲۱

توجہ نہ تھی نہ تھی ۱۲۱۳ھ میں میر عطا حسین خاں نے چار درویش
کا قصہ اُردو میں لکھا تھا ادھر یہ حال تھا کہ چونچال لڑکا کے جلسوں
اور امرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل
بہلا رہا تھا ادھر دانائے فرنگ نے کلکتہ میں اس کی پرورش کی جانب
توجہ کی۔[1]

چنانچہ آب حیات میں فضلی کتاب کا تذکرہ آ جانے کے بعد حکیم شمس اللہ قادری
منصب اردوئے قدیم[2] محمد یحییٰ تنہا مصنف سیر المصنفین[3] احسن مارہروی[4] مصنف مغل
اور اردو سب نے اپنی تصنیفات میں فضلی کی اس کتاب کے وجود کو تسلیم کیا۔ لیکن
سوائے دیباچے کے کسی نے متن کتاب کا اقتباس نہیں دیا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر زور نے
اس کتاب کے وجود پر مختصر تاریخ ادب اردو[5] میں شبہ کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"مشہور ہے کہ فضلی نام ایک اُردو کے اہل قلم نے فارسی کتاب
روضۃ الشہدا کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے اس کا ذکر آب حیات میں
کیا گیا ہے۔ اور اسی بنا پر یہ روایت مشہور ہے لیکن اس کا صرف نام
ہی سنا جاتا ہے۔ کوئی قلمی نسخہ اس اُردو روضۃ الشہدا کا موجود نہیں ہے"

چنانچہ قاضی عبد الودود صاحب نے اپنے اس مضمون میں جس کا ذکر گزر چکا ہے[6]
ڈاکٹر زور کی تائید کی ہے اور لکھتے ہیں۔

۱؎ آب حیات صفحہ (۲۱)
۲؎ اُردوئے قدیم صفحہ (۱۲۰)
۳؎ سیر المصنفین صفحہ (۴۴)
۴؎ منشورات صفحہ
۵؎ تاریخ ادب اردو ادارۂ ادبیات صفحہ (۹۲)
۶؎ رسالہ معاصر پٹنہ جلد ۴ شمارہ ۳

"میرا حافظہ دھوکہ نہیں دیتا تو کسی دوسری جگہ اس نے دڈی (اس) نے یہ بھی بتایا ہے کہ دہ مجلس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے میں نے دہ مجلس کے مطبوعہ نسخے کو بہت ڈھونڈھا مگر کہیں نہ ملا شاہ مقبول احمد نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے مخطوطات اردو کی فہرستوں میں اسے تلاش کیا مگر یہ فہرستیں اس کے ذکر سے خالی ہیں یہ یقین ہے کہ دتاسی نے خود یہ کتاب نہیں دیکھی ورنہ اپنے دستور کے مطابق نسخہ مطبوعہ تفاصیل دیتا میرا خیال ہے کہ اس نے دھوکہ کھایا ہے اور یہ کتاب اس وقت تک طبع نہیں ہوئی ڈی ٹاس کا یہ بیان کہ شرف علی خاں کی والدہ کے لیے لکھی گئی اس کے ماخذ میں نہیں اور ان چیزوں کے علاوہ وہ جو خود دہ مجلس میں ہونگی مراثی وغیرہ کی قسم سے اس کی کوئی چیز نہ دستیاب ہوتی ہے نہ اس کا کسی نے ذکر کیا ہے۔ یہ کہیں زیادہ قرین قیاس ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا نسخہ گل مغفرت ہو۔[1]

فضلی کی ایک ہی تصنیف "دہ مجلس" کا سراغ ملا ہے جس کو اکثر تذکرہ نگاروں کی نثری کارنامہ قرار دیا لیکن یہ نظم و نثر دونوں میں لکھا گیا تھا۔ اب تک صرف نثر میں ان کا دیباچہ ملتا ہے۔ اور چونکہ یہ نایاب ہے اس لیے تمام و کمال درج کیا جاتا ہے۔

دیباچۂ کربل کتھا

تالیف ملا فضلی درعہد محمد شاہ بادشاہ

ماخوذ از طبقات الشعرا مولفہ منشی کریم الدین

اس کتاب کا سبب تالیف یہ ہے کہ قبلہ حقیقی اور کعبۂ تحقیقی میرے والد نواب مستطاب معلی القاب اعلیٰ نواب بابام نواب شرف علی خاں سلمہ اللہ الملک المنان۔ ہر سال تعزیہ ابو عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام

---

[1] مطبوعہ معاصر جلد ۴

کا بہ خلوص نیت اندرون محفل مخفی بہ موجب حدیث شریف کہ
التقیہ دینی ودین آبائی والتقیہ جنتہ بوجہ احسن بجا لاتا
تھا اور بندہ حقیر پر تقصیر حسب الارشاد اس قبلہ گاہ کے روضۃ الشہدا
کا خلاصہ کہ سب نکتہ سنجاں مناقب شاہ لا نے اور سب دقیقہ فہماں
مصائب سید الشہدا نے واقعہ شہادت شاہ کربلا کا اس میں لکھا
ہے سناتا تھا لیکن معنے اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔
اور فقرات پر سوز و گداز اس کتاب مذکور کے بہ سبب لغات فارسی
ان کو نہ رلاتے تھے۔ اکثر اوقات وہ یہ کہتے کہ صد حیف و صد
ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے
کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں ایسا کوئی صاحب شعور ہو کہ کسی
طرح من عن ہمیں سمجھا دے اور ہم سے بے سمجھوں کو سمجھا کر رلا دے
مجھ احقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا بہ رنگینی عبارات
اور حسن استعارات ہندی قریب الفہم میں عامہ مومنین و مومنات کیجیے
تو موجب اس کلام بانظام کے من بکی علی الحسین او ابکا وجبت
لہ الجنۃ بڑا ثواب لیجیے۔ ترجمہ:۔ جو شخص رویا اوپر حسین کے یا جس
نے رلایا اوروں کو اس کے واسطے جنت واجب ہوگی۔ کیونکہ اس
فائدہ سبحانی اور اس فائدہ ربانی سے زن و مرد اور پیر و جوان
خوانده و ناخوانده اور خورد و کلاں کو بہرہ فاضل اور نصیبہ کامل ہوئے
اور ہر ایک بے خبر اس درد پر سوز اور اس خبر غم اندوز کو سن کر رو اور
بکھ کر روے۔ بہرحال دل میں یہ گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے
کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئی شامل کیونکہ بے تائید عیدی اور
بے مدد جناب احمدی بہ شکل صورت پذیر نہ ہوئے۔ اور گوہر مراد

رشتہ امید میں نہ آسکے۔ لہذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں
ہوا مخترع۔ اور اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نثر نہیں ہوا
مستمع۔ پس اس اندیشہ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل و تدبیر
میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ناگاہ غنایت الہی
گلشن افگار پر اہتراز میں آئی۔ یہ بات آئینہ خاطر میں منہ دکھلائی
کہ یہ فکر عظیم بغیر امداد ارواح مقدس حسین علیہ السلام حسب خواہش
محبوبوں کے سرانجام نہ پائے۔ جب ذکر حسین علیہ السلام کی مدد کا
ذہن نشین ہوا وہیں دل کو تقویت ہوئی پھر خاطر میں گورا کہ قادر
حقیقی اور خالق تحقیقی نے ذات انسانی کو ایسی قدرت کرامت کی
ہے کہ جس کام پر طبیعت اور توجہ کو مصروف رکھے البتہ معطل و موقوف
نہ رہے اور انصرام کو پہنچے۔ اے دل بہ حکم السعی منی والاتمام
من اللہ اس سعادت عظمیٰ اور اس سعادت کبریٰ کو خاطر امید میں
موافق اس بیابان فصاحت و بلاغت کو ساتھ تائید عنایات عیدی
کے طے کر اور بہ مقتضائے حدیث،۔

الداعی علی الخیر کفاعلہ امید صواب دہر ایک رات
بعد کتاب خوانی اور سینہ زنی کے ایک فاتحہ مخفی اس کام با نظام کے
لئے بھی پڑھا وہیں برکت اور میمنت فاتحہ سے مجھ بے دل کے دل
کو ایک انشراح اور افتتاح ظاہر ہوا۔ پھر ساتھ نظر تاملی اور فکر
کے مطالعہ لاتحرک ذرۃ الا باذن اللہ کا کر سو گیا میں اسی
رات رویا میں دیکھتا ہوں کہ گویا ایک طرف بہ مع اخوان ذیشان
و دوستان بہتر از جان سیر کو جاتا ہوں۔ مابین راہ میں ایک شخص
اجنبی نے کہا کہ اول روضہ مقدس حسین علیہ السلام کی زیارت کو

جائیں۔ بہ خواہش اتم اور بہ خوشی اکم اس روضہ منورہ میں گیا دیکھتا ہوں کہ عمارت باہدایت اس مکان لطیف کی بعینہ مانند عمارات حضرت قدم شریف کے ہے۔ اور متصل دیوار کے دو قبریں نہایت ملی ہوئی باہم چوں قافیہ و ردیف ہیں۔ ایک بالشت بھر سرہانے کی طرف سے سبز ہے۔ اور ایک سرخ ہے۔ میں نے بہ ادب تمام اور بہ صدق تمام فاتحہ پڑھ کر سرہانے کی طرف بیٹھ کر مناقب شروع کیا۔ اور مجھے وہ معراج بلند حاصل ہوا۔ اور وہیں میرے فلک چشماں سے رونا نازل ہوا۔ یکایک ان مرقدوں سے دو دستہ نرگس کے نہایت تر و تازہ نکلے۔ لیکن میں مناقب پڑھتا اور روتا رہا۔ کہ دو دستہ اور نکلے۔ تب میں نے یہ دعا مانگی کہ یا امامین علیہما السلام ایک دستہ اور عنایت ہووے کہ میرا صدق دل مجھ پر ثابت ہوئے کیونکہ میں پنجتن کا خادم ہوں۔ معًا مانگنے اس دعا کے ایک دستہ اور ترو تازہ نکلا۔ حاصل الامر تا شام اسی درگاہ فلک بارگاہ میں رہا۔ اور دل میں کہا کہ اے نفضلی تو ایسی جناب مستطاب اور ملجا مآب عالم و عالمیاں سے کہاں جاتا ہے اور پھر اپنے تئیں چاہ دنیا میں پھنساتا ہے۔ یہیں رہ اور مت جا۔ اس قصد کو مصمم کر وہیں رہا۔ یکایک بہ عنایت ایزدی اور بہ ہدایت صمدی ایک جوان ریش بروت آغاز انہی قبروں سے نکلا۔ ایک عبا کہ رنگ اس کا مجھے یاد نہیں اوڑھے ہوئے دونوں قبروں پر سوا مجھے خبر نہ تھی کہ وہاں کے خادموں نے کہا کہ اے نفضلی دوڑو کہ حضرت امام حسین یہی ہیں۔ یہ سنتے ہی بہ شادی تمام دست و پا گم دوڑا دیکھا اس جمال جہاں آرا کو کہ مانند مہر منور اور ماہ انور کے برج روضہ مقدس

کو روشن کیے ہوئے بیٹھے روتے ہیں اور گوہر غلطاں اشک صدف
رخسار آبدار پہ بہتے ہیں۔ میں دیکھتے ہی اس جمال باکمال کو تصدق
ہوا قدموں پہ بہ ل کیا کہ یا حضرت حق تعالیٰ میری بہ مراد دے
جو پیشانی کو ان مبارک قدموں پہ ملے لیکن باعث رونے اور مجھ سے
نہ بولنے کا کیا۔ یہ کہتا تھا اور انکھیں اپنی تلوؤں میں ملتا تھا کہ ایک
مرتبہ ایک شخص میرے ساتھ کا آیا اور اس نے کہا کہ بھائی اور آشنا
تمہارے سب سوار ہوگئے اور تم اب تک یہیں بیٹھے رہے۔ بلکہ تمہاری
سواری کا گھوڑا بھی گیا۔ جون میں سنا کہ گھوڑا گیا خوش ہوا اسے جواب
دیا کہ بھلا ہوگیا۔ لیکن میں تو یہاں سے نہ گیا ہوں نہ جاوں گا۔ غلامی
اس جناب نے قبول کی۔ تب آپ لب اعجاز بیان سے فرمائے اب تو
جا پھر آئیو۔ میں نے بہانہ کیا کہ یا حضرت اب تو میری سواری کا گھوڑا
بھی گیا۔ اور میں یہ قدم چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ پھر زبان مبارک سے ارشاد
کیا کہ باہر ایک پالکی سبز دھری ہے اس پر سوار ہو جا۔ پھر عدول حکم
نہ کرسکا۔ اور عرض کیا کہ یا حضرت اگر پھر آوں تو تحفہ شہر سے واسطے
نثار کے کیا لاؤں۔ حکم ہوا کہ کئی روپے اور ایک کپڑا جھالردار اور
ایک کپی تیل کی۔ اور ایک پوڑی مسی کی۔ تصدق ہوا آداب رخصت
بجا لایا باہر گیا۔ اور اسی پالکی پر سوار ہوکر چلا۔ وہیں آنکھ میری کھل
گئی۔ دیکھتا ہوں کہ وقت نماز ہے۔ اٹھ کر بعد ادائے فرض کے دو
رکعت شکر بجا لایا۔ یہ مصنف یوں کہتا ہے کہ یہ گوہر گراں بہار نہ کر
خواب کہ بہ تائید بحر رحمت الٰہی کہ صدف امید سے سلک عبارت میں
منسلک ہوا۔ وکفیٰ باللہ شہیدا کہ مبرا از کذب و خلاف ہے۔ بموجب
نص صحیح کہ لعنت اللہ علی الکاذبین ومعہذا تہمت بر جناس

حضرت امام حسین باعث کفر ہے۔ اگرچہ مجھ سا نالایق روسیا اس مظہر سبحانی کے دیدار مطلع انوار کو دیکھنے کی طاقت کہاں رکھتا تھا لیکن اس کے فضل خاص اور فیوض علم سے بعید نہیں۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

یہ رسالہ مسودہ اوپر بارہ مجلس اور ایک خاتمہ کے ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کی تاریخ مصنف نے یوں لکھی ہے۔

یہ جو نسخہ ہوا ہے اب تصنیف
بہر کسب ثواب فیض بشر
چاہا تاریخ اس کی بولے سروش
شیعوں کی نجات کا مظہر

اور اب کے نظر ثانی وکیفیت مضامین ہندی اصطلاحات واستعارات رنگین اصلاح دیا۔ اس تاریخ نے صفحہ دل پر جلوہ دیا

ہر کس از من کند بہ نیکی یاد
بہ جہاں نامش ہم بہ نیکی یاد
۱۱۶۱ھ

فضلی کی اس تصنیف کی مقبولیت نے بہت سے لوگوں کو اس کے تتبع پر مجبور کیا چنانچہ جب راقم الحروف نے فضلی کی دہ مجلس کی مختلف کتب خانوں میں تلاش کیا تو حسب ذیل ترجموں اور تصنیفوں کا پتہ چلا۔ ان میں سے سب فورٹ ولیم کالج سے قبل کی ہیں اور مخطوطوں کی شکل میں ہیں۔

۱۔ روضۃ الشہدا ۱۱۷۰ھ محمد فیاض ولی ویلوری[1]

---

[1] مخطوطا ادارۂ ادبیات اردو تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۵۸۔

۲۔ روضتہ الاطہار	نوازش علی خاں شیدا	۲ھ
۳۔ دہ مجلس	شمس الدین ولی	۳ھ
۴۔ بستان شہادت	سید احمد درویش	۴ھ
۵۔ گنجینۂ شہدا	امان اللہ	۵ھ
۶۔ روضتہ الشہدا	محکم	۶ھ
۷۔ نقلی ماتم	مرزا جعفر علی فصیح	۷ھ
۸۔ حالات شہادت	مصنف نامعلوم	۸ھ
۹۔ دہ مجلس	" "	۹ھ
۱۰۔ دہ مجلس	فاضل	۱۰ھ

ان میں نمبر ۱۔ ۲۔ ۵ اور ۱۰، منظوم ہیں۔ نمبر ۹، ۳ اور ۷ نثر میں ہیں مخطوط نمبر ۹ ادارۂ ادبیات اُردو کی ملک ہے۔ جو دکھنی اُردو میں فضلی نے بھی اردو نثر میں ایسی ہی کتاب لکھی تھی لیکن بقول ڈاکٹر زور
"یہ ٹھیٹ دکھنی مصنف کی دہ مجلس ہے جیسا کہ زبان و اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے"

۲ھ مخطوط ادارہ ادبیات اُردو تذکرہ اُردو مخطوطات صفحہ ۷۵
۳ھ " " " " " " "
۴ھ مخطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ و کتب خانہ آصفیہ صفحہ ۲۶۷
۵ھ مخطوطہ آصفیہ
۶ھ " "
۷ھ تذکرہ اُردو مخطوطات صفحہ ۱۹۳
۸ھ تذکرہ اُردو مخطوطات " ۴۳)
۹ھ تذکرہ اُردو مخطوطات "
۱۰ھ تذکرہ اُردو مخطوطات

سراج الدین علی خان آرزو شمالی ہند کے شاعروں میں زبان اردو کی معمار اور بام ترقی پر لے جانے والے کی حیثیت سے سراج الدین علی آرزو کا نام یادگار رہے گا انھوں نے نوادر الالفاظ کے ذریعے اردو کی بڑی عظیم بالشان خدمت انجام دی ہے۔

خان آرزو میر کے سوتیلے ماموں اور فارسی اردو کے زبردست شاعر تھے وہ بڑے عالم بھی تھے۔ لالہ سری رام مصنف "خم خانہ جاوید" کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا وطن اکبرآباد تھا۔لیکن وہ گوالیار میں بہ سلسلہ ملازمت رہے بعد میں شاہ جہاں آباد دہلی میں قیام رہا۔ ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت ہندی پنجابی اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے واقف تھے۔ ان اوصاف کی بنا پر ہندوستانی زبانوں کے متعلق ان کی زبان دانی مسلم تھی۔ اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے لگ سکتا ہے۔ آرزو کی استادی کا اعتراف ان کے ہر ایک معاصر نے کیا ہے میر تقی میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں۔

"ہمہ استادان مضبوط دن ریختہ ہم شاگرداں آں بزرگوار اند"

مولانا آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں:۔

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ اور منطق پر ہے"

آرزو کا سب سے بڑا کارنامہ "غرایب الغات" کی تصحیح ہے۔ عبدالواسع ہانسوی نے غرایب لغات کے نام سے ایک لغت لکھی تھی۔ جس میں اردو الفاظ کے معنی فارسی میں دئے تھے۔ خان آرزو نے اس کی تصحیح کی اس کتاب کو ڈاکٹر عبداللہ پروفیسر اردو پنجاب یونیورسٹی نے اپنے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شایع کیا ہے مقدمہ میں ڈاکٹر عبداللہ نے آرزو کے حالات زندگی بھی تحقیق اور تفصیل سے لکھے ہیں۔

یوں تو آرزو شاعری کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ

شاعری آرزو کا بڑا کارنامہ نہیں۔ بلکہ ان کی وہ خدمات ہیں جو انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور مقبولیت کے سلسلے میں انجام دیں۔ زبانِ اردو کی خدمت کے سلسلے میں جو خدمات قابلِ ذکر ہیں ان سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اُردو میں خود شعر کہہ کر اپنے شاگردوں میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کیا۔ اور اس طرح اُردو کے ادبی پایہ کو بلند کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد بھی رکھی اور ہندوستانی لسانیات کے ابتدائی قواعد وضع کیے۔

چنانچہ پروفیسر عبداللہ لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک اُردو لغت نگاری کا تعلق ہے ہم آرزو کو اردو کا پہلا معیاری اور بلند پایہ لغت نگار قرار دے سکتے ہیں یہ صحیح ہے کہ میر عبدالواسع ہانسوی کو ان پر تقدیم ہے مگر فن اور معیار کے اعتبار سے خان آرزو کو ہی ترجیح اور تقدم حاصل ہے۔"

ڈاکٹر عبداللہ نے ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتب کا ذکر کیا ہے

۱۔ "مجمع النفائس" فارسی شعراء کا تذکرہ ہے
۲۔ "مثمر" جس میں قواعد زبان اور لسانیات کے مسائل بیان کیے گئے ہیں
۳۔ "چراغ ہدایت" فارسی لغت
۴۔ "سراج اللغات" فارسی لغت
۵۔ "داد سخن" تنقید شعر
۶۔ "نوادر الالفاظ" لغت
۷۔ "دیوان" اشعار فارسی

لیکن منور سہائے اپنے ایک مضمون میں خان آرزو کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ دو دواوین دیوان آرزو در جواب دیوان شفیعائے اثر

دیوان درجواب دیوان سلیم
دیوان آرزو درجواب دیوان فغانی
دیوان آرزو دوم

۲- مثنویات:- "شورش" معروف بہ سوز وساز درجواب محمود و ایاز زلالی
جوش وخروش
مہر و ماہ
عبرت فسانہ
مثنوی ناکمل در بحر سنائی

۳- لغات "سراج اللغات" "چراغ ہدایت" "نوادر الالفاظ"
۴- قواعد زبان ولسانیات "مثمر"
۵- شرحیں:- خیابان گلستان (گلستان سعدی کی شرح)
شرح سکندرنامہ موسومہ بہ شگوفہ زار
شرح قصاید عرفی
شرح گل کشتی میر نجات کی مثنوی کی شرح
سراج وہاج حافظ شیرازی کے ایک شعر کی شرح

۶- تنقید تنبیہ الغافلین حزیں کے اشعار پر تنقید
سراج منیر منیر لاہوری کے کلام پر تنقید

۷- تنقید شعر "داد سخن" جس میں شیدا اور قدسی کے مناقشوں پر محاکمہ ہے نیز یہ بھی بحث ہے کہ زبان دانی میں ہندستانی ایرانیوں کے برابر ہیں یا نہیں۔

۸- بلاغت عطیہ کبری (در علم بیان) موہبت عظمیٰ (در بیان علم معانی)
۹- قواعد زبان معیار الافکار زاوید الفواید۔

۱۰- مکاتیب پیام شوق رقعات ارزو
۱۱- تذکرہ مجمع النفاس فارسی گو ایرانی و ہندوستانی شعرا کا تذکرہ
۱۲- رسائل اداب عشق- گلزار خیال و رخصت فصلی بہار و ہولی
۱۳- خطبات دیباچے وغیرہ

مذکورہ فہرست میں صرف نوادر الالفاظ ہی ایک ایسی تصنیف ہے جس کا تعلق اردو سے ہے باقی ساری تصانیف فارسی میں ہیں۔

پروفیسر عبداللہ نے ان کی تخلیلی اور تجریاتی صلاحیت کی مثال کے طور پر "لفظ" ادا کی تشریح لکھی ہے جو خان ارزو نے کی تھی ذیل میں اس کا اقتباس دیا جاتا ہے۔

ادا۔ علم لفظ ہے میر عبدالواسع اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں
" ادا کیفیتے باشد معشوقاں را کہ بہ تقریر نیاید و ذوق آں را دریابد"

میر عبدالواسع کی یہ تشریح کسی حد تک تشنہ ہے۔ آرزو اس لفظ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں سب سے پہلے وہ اس لفظ کا ماخذ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ لفظ عربی کا ہے فارسی میں اکثر حرکت موزوں کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً ابرو زچشم کی موزوں حرکت کو بھی ادا کہا جاسکتا ہے۔ ادا بعض اوقات مطلقاً بہ معنی حرکت آتا ہے مثلاً ادائے خارج۔ غرض ادا معشوقوں کی کیفیت نہیں بلکہ ان کے اعضا، خصوصاً چشم و ابرو کی حرکت موزوں کا نام ہے۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لفظ کی خوب چھان بین کرتے تھے علمی وسعت کے علاوہ ان کی معلومات کا بہت بڑا حصہ علمی مشاہدہ اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔

عبدالولی عزلت | آرزو کے بعد ان ہی کے ایک معاصر عبدالولی قابل ذکر ہیں

جنھوں نے اردو نظم کے علاوہ اردو نثر میں بھی اپنی یادگار چھوڑی۔ عزلت سلون (رائے بریلی) کے رہنے والے تھے۔ بعد میں اُن کے والد سید سعد اللہ نے سورت میں بود و باش اختیار کر لی۔ میر عبدالولی عزلت نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی مولوی عبدالحی کی مصنف تذکرہ گل رعنا لکھتے ہیں:۔

"ہما شا میں بھی فکر کرتے تھے دوھے کبت جھولنے سوال وجواب بارہ ماسے مکرنیاں۔ پہلیاں سب ہی چیزوں میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک چیز کو سلیقہ سے کیا[1]"

ان کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا ۱۱۶۵ھ میں دلی آئے سراج الدین علی خان آرزو کا زمانہ تھا۔ ان سے ملنے کے بعد عرصہ تک دلی میں رہے میر نے نکات الشعراء میں جن دکھنی شاعروں کا کلام نقل کیا ہے وہ ان ہی کی بیاض سے ماخوذ ہے دلی سے مرشد آباد گئے وہاں سے دکن گئے اور اورنگ آباد میں رہنے لگے۔ ۷ ارجب ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی حیدرآباد میں میر مومن کے دائرہ میں دفن ہیں۔

لچھمی نارائن شفیق نے عزلت کے متعلق صائب کا مندرجہ ذیل شعر بالکل ٹھیک لکھا ہے۔

دریں زمانہ کہ عقیم است جملہ محبت ہا
کنارہ گیر و غنیمت شمار "عزلت" را

شیخ چاند مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ عزلت نے اپنے دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا تھا۔ اس کا ایک حصہ بھی صاحب موصوف نے نقل کیا ہے اس سے عزلت کے اسلوب بیان کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ اس دیباچے میں انھوں نے تدوین دیوان کی وجہ بتائی ہے۔

---

[1] تذکرہ گل رعنا صفحہ نمبر (۹۶)

"اما مجھے عجز و درود کے فقیر سید عبد اولی عزلت بخشے اسے الی الحقیقۃ پر حضرت سید سعد اللہ قدس سرہٗ کا زبان بے جوہری سے عرض کرتا ہے کہ کتنے جلے ہوئے دم آتش خانہ دیوان ہندی سے نکال کر اور ان پریشان بیانی میں جمع کئے ہیں تا دوستوں مابین ہم جہاں فراموشوں کی یادگار رہے اور اس کے سب مصرعے سوختگی مضامین سے بزم سخن کی شمع کیے ہیں تا چراغ معنی کے پروانہ صورتوں کی آنکھ ہمارے خیال میں اشک باری رہے اور اس کی ہر بیت بہار جنون میں مصرعوں کے دو ہاتھ سے گریبان پھاڑ رہی ہے۔ اور ہر سطر ایک دیوانہ مضمون جنون کو زنجیر کو سرمۂ سوختگی بیان سے خموشی کے نالے پکار رہی ہے۔ درست فکروں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کے پسند کرائے رب العباد بمحمد و آلہ الامجاد"[1]

اس کے علاوہ انھوں نے ایک مثنوی "راگ مالا" بھی لکھی تھی۔

مرزا رفیع سودا اس دور کے شعراء میں جنھوں نے اردو زبان اور اردو نثر کی طرف توجہ دی مرزا رفیع سودا بھی ہیں جس کے میر تقی میر کی مثنوی کو اردو نثر کا جامہ پہنانے کی روایت مختلف ذرائع سے برابر چلی آ رہی ہے لیکن اب یہ کارنامہ ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ تاہم یہ اردو نثر کی خوش بختی ہے کہ اس شاعر اعظم کے دیوان مراثی کا دیباچہ نثر میں لکھا ہوا ہم تک پہنچا ہے سودا کے والد مرزا شفیع مرزایان کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا مرزا شفیع کے بیے ہندوستان آئے اور یہیں دہلی میں رہ گئے۔ مرزا شفیع نے نعمت خاں عالی کی بیٹی سے شادی کی ان ہی کے بطن سے سودا ۱۱۲۵ھ میں تولد

---

[1] مجلہ عثمانیہ جلد سوم "عبد الولی عزلت"

ہوئے۔ ان کی پرورش اور تربیت دہلی میں ہوئی جب وہ وہیں شعور کو پہنچے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "سلیمان قلی وداد" کی شہرت بہ حیثیت شاعر کی بہت تھی اس لیے پہلے وہ ان ہی کے شاگرد ہوئے بعد کو شاہ حاتم کا ستارہ چمکا تو مرزا نے ان سے تلمذ حاصل کیا۔ مرزا کی شاعری کی شہرت خاص و عام میں ہوئی شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کے پاس بھیجتے تھے۔ شاہ عالم کی معزولی کے بعد فرخ آباد گئے جو اس زمانے میں علم وفن کا مرکز تھا۔ وہاں سے فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں پہنچے انھوں نے ان کی بہت قدر و منزلت کی اور تنخواہ مقرر کر دی شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ کے زمانے میں بھی وہی عزت و احترام باقی رہے آخر ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وفا پائی اور لکھنؤ کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ سودا ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس لیے ان کی طبیعت نے نہ صرف غزل بلکہ قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ ہجو غرض ہر صنف کلام میں اپنے جوہر دکھائے اسی ایج نے انھیں نثر میں بھی لکھنے پر مائل کیا۔ چنانچہ عام شاعروں کی عادت کے برخلاف انھوں نے اپنے دیوان مراثی کا دیباچہ اردو میں لکھا۔ شعر کی طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نثر میں بھی فارسی اساتذہ کے نمونے ان کے محرک بنے کیونکہ اس میدان میں بھی انھوں نے گو سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ یہ چیز ان کے جملوں کے درست لفظوں کے انتخاب اور قافیہ اور مسجع کے التزام اور مفہوم کو واضح کرنے میں مشکل پسندی سے اچھی طرح ظاہر ہے۔ چنانچہ ذیل کے اقتباسات سے یہ باتیں واضح ہوں گی۔

ضمیر منیر بہ آئینہ داراں مانع کہ مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو پس بہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامہ دو زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پہ تحریر پائے لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کردن تا زبانی ان

اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفرین رہوں۔

قیمت قدر شناسا ہی سے ہو پنچے ہے بہم
ورنہ دنیا میں صدف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہر بیچ قفس کے حبس و قیت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے۔ واسطے گوش داد رس کے غرض جس اہل سخن کا در منصفی زینت لب ہے سر رشتہ حق معانی کا اس کلام کے اس سے انصاف طالب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کے مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا۔ تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا۔ چاہیے کہ دیکھکر نکتہ چینی کرے ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کا ہے کو مرے"

انسان کہ جس فن سے آپ ماہرانہ کرے چاہئے کہ اس میں اپنی حد سے سخن باہر نہ کرے۔ گفتگوئے جاہل پہلوئے عالم مورد انفعال بلکہ خموشی ہے اس کی برابر صد فضلی و کمال بات کر آوے تو چپ رہ کر گمان کے نزدیک نہ سو طرح کا ہے سخن پردہ خاموشی میں اگر ناگاہ جس فن کا آگاہ سے اس فن کی بولی بولے گویا ہر دو لب اس کے دروازہ رسوائی کے بات ہیں کہ عمداً اپنے منہ پر کھولے"

طرفہ میوہ ہے یہ سخت اے دوست
مغز شیریں و تلخ جس کا پوست

مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہر سخن عاصی زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے اس مدت میں مشکل گوئی دقیقہ سنجی کا نام رہا ہے اور سدا مرغ معنی عرش آشیاں گرفتار دام رہا ہے"

یہ دیباچہ سودا کے دیوان مراثی میں شامل ہے سودا کے شاعروں میں جنہوں نے

اردو نثر کی طرف بھی توجہ کی قتیل اور رنگین قابل ذکر ہیں

قتیل قتیل دہلی کے رہنے والے تھے اور کھتری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے دیوالی سنگھ نام تھا لیکن مسلمان ہونے کے بعد محمد حسن نام رکھا۔ قتیل کو فارسی زبان پر بڑا عبور تھا اور اپنے علم کے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انشاء اللہ خاں انشاء سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ "دریائے لطافت" انشاء نے ان کی شرکت کے ساتھ لکھی تھی۔

ان کی فارسی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ہفت الفصاحب ۲۔ چار شربت ۳۔ دیوان شعر۔

۴۔ دریائے لطافت۔

"دریائے لطافت" کا وہ حصہ جو منطق۔ عروض۔ قافیہ۔ بیان و معانی پر مشتمل ہے قتیل ہی نے لکھا ہے۔ اس میں قتیل نے انشاء ہی کی طرح ظریفانہ انداز اختیار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مثلاً عروض میں بجائے مروجہ ارکان کے نئے ارکان تراشے ہیں مثلاً مفعول مفاعلین مفعول مفاعلین کے لیے انھوں نے

"بی جان پری خانم بی جان پری خانم"

اور "فاعلین مفاعلین فاعلین" کے لیے

"جت لگن پری خانم جت لگن پری خانم"

تجویز کئے تھے یہ عبارت طرازی انھوں نے یقیناً انشاء سے سیکھی تھی لیکن انشاء کی بہت سی جدتوں کی طرح قتیل کی یہ ادبی جدتیں بھی لطائف بن کر رہ گئیں۔ صنائع لفظی اور معنوی کی تشریح قتیل نے اردو عبارات اور اردو فقروں سے کی ہے ضلع جگت کی مثال میں انھوں نے دریا کا ذکر کرتے ہوئے اس کے مناسب چیزوں کے بیان میں دو صفحے اردو کی عبارتیں لکھی ہیں کچھ یہاں درج کی جاتی ہیں

۱۔ آپ کا زہرہ کچھ آج کھل گیا ہے واللہ تمہاری پانی بہت مشکل ہے

۲۔ کل ستونا چھوڑ گئے۔ ہر چند ضعف نالی کی بھی توان میں جگہ نہ دی
۳۔ ایک باولی رنڈی کے کہنے سے ہماری چاہ دل سے اٹھا دی

مذکورہ بالا جملے چند نمونے ہیں اور اس طرح کی اور عبارتیں بھی دریائے لطافت میں ملتی ہیں۔

قتیل کی اردو تحریر "دریائے سخن" کے علاوہ ان کے مجموعہ مکتوبات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے ان مکاتیب کا مجموعہ "معدن الفوائد" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں پہلے حمد و نعت عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں لکھی ہے۔ چند نمونے ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغمبر کیا اور تمام فاضلوں اور عالموں کو اس کی امت کیا۔"

رنگین فورٹ ولیم سے قریب تر زمانے کے شعراء میں مرزا سعادت یار خان رنگین کو خاص اہمیت حاصل ہے شعر میں یہ دور جدت طرازیوں اور اظہار خیال کے نئے نئے سانچوں اور اسالیب پر طبع آزمائی کا دور تھا۔ رنگین اسی لیے ممتاز ہیں اور ان کی جدتوں کا تذکرہ اس دور کے سارے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے

ان کا نام سعادت یار خاں اور تخلص رنگین تھا۔ ان کے والد طہماسپ بیگ اعتقاد جنگ ایرانی نژاد تھے۔ وطن چھوڑنے کے کچھ دن وہ لاہور میں رہے اس کے بعد دلّی چلے آئے۔ بہت جلد ان کی رسائی دربار تک ہو گئی اور بادشاہ نے انھیں منصب ہفت ہزاری سے سرفراز کیا اور چوراسی گاؤں جاگیر میں دے۔ رنگین پیدا تو ہوئے سرہند میں لیکن دلّی میں ہوش سنبھالا۔ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی گئی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد نظام حیدر آباد کی فوج میں افسر توپخانہ کی خدمت پر مامور رہے پھر گھوڑوں کی تجارت شروع کی اس میں زیادہ دلچسپی نہ

ہوئی تو یہ ملازمت چھوڑ کر شاہزادہ سلیمان شکوہ کے زمرہ ملازمت میں داخل ہوئے شاہزادہ سلیمان شکوہ دہلی میں غلام قادر روہیلہ کی بغاوت کے بعد لکھنؤ آ گئے تھے اور آصف الدولہ کے خزانے سے وظیفہ پاتے تھے۔ رنگین کے دوست انشا بھی شاہزادہ ہی کے پاس ملازم تھے۔ کریم الدین مصنف طبقات الشعرا[1] نے رنگین کا سنہ وفات ۱۲۵۱ھ بتایا ہے گارسان ڈی تاسی[2] اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۱۲۵۰ھ لکھتے ہیں۔

رنگین نے اردو شاعری میں بہت سے کارنامے چھوڑے ان کا نمایاں کارنامہ "ریختی" ترقی دینا ہے۔ رنگین نے اس فن کو اتنی ترقی دی کہ لوگ انھیں ریختی کا موجب سمجھنے لگے۔

رنگین کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مجالس رنگین (نثر فارسی) جس کو مسعود حسن رضوی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے[3]

۲۔	چار باغ	مطبوعہ دہلی ۱۸۵۲ء
۳۔	ایجاد رنگین	مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۶ء
۴۔	مظہر العجائب	مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۶ء
۵۔	رسالہ نادرہ	مطبوعہ فتح گڈھ ۱۸۶۲ء

اس کے علاوہ پروفیسر مسعود حسن نے کئی غیر مطبوعہ مثنویوں اور نظموں کی تفصیل دی ہے جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ جن میں سے چند ذیل

---

[1] طبقات الشعراء

[2]

[3] دیباچہ مجالس رنگین صفحہ ۱۶ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

میں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ دیوان ریختہ — پہلا دیوان

۲۔ دیوان بیختہ — دوسرا دیوان

۳۔ دیوان آمیختہ — ہزلیات

۴۔ دیوان انگیختہ — ریختی

۵۔ مجموعہ رنگین — سات زبانوں میں قصائد و غزلیات کا مجموعہ

۶۔ امتحان رنگین

۷۔ اخبار رنگین — چشم دید واقعات منظوم کر دیے گئے۔

۸۔ شہر آشوب

۹۔ کہاوت ہائے رنگین

۱۰۔ حکایات رنگین

۱۱۔ گلدستہ رنگین

۱۲۔ نصاب رنگین

۱۳۔ داستان رنگین سرگذشت آغا عزیز سوداگر گجرات

۱۴۔ فرس نامہ رنگین۔

۱۵۔ چہار چمن رنگین وغیرہ۔

پروفیسر عبدالقادر سروری کی ایک بیاض کے نوٹ سے ان کی ایک اور تصنیف "محاورات بیگمات"[1] کا بھی پتہ چلا ہے۔ جس کا ایک مخطوط رامپور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس میں اردو محاوروں کی تفہیم اردو میں کی گئی ہے اس کے متعلق مولانا امتیاز علی علی عرشی کا خیال ہے کہ یہ سراج الدین علی خاں آرزو کی تصنیف ہے۔ اور "نوادر" کے

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست مخطوط صفحہ ۱۹۳

نسخہ کا حصہ ہے[1] - لیکن پروفیسر عبداللہ جنہوں نے نوادرالالفاظ کو مع حاشیہ کے چھاپا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"مجھے محاورات بیگمات کا ایک مجموعہ ملا جو مولانا (امتیاز علی عرشی) کے نزدیک آرزو کا معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کے بقول نوادر کے ایک نسخے کا حصہ ہے جو کتب خانہ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔ یہ رنگین کے مرتبہ محاورات سے بہت حد تک مماثل ہے مگر میں نے اس متن کو شامل نہیں کیا کیونکہ انجمن ترقی اردو کے نسخے میں (جو آزاد کی زندگی میں لکھا گیا تھا) یہ محاورات موجود نہیں" [2]

اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے خواتین کے روزمرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ رنگین کو ریختی میں بیگمات کی زبان اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اس لیے وہ بیگمات کی زبان سے بڑی واقفیت رکھتے تھے۔

انشاء رنگین کے معاصرین شعرا میں انشاء خاص اہمیت رکھتے ہیں یہ شاہان دہلی کے طبیب ۔ ماشاء اللہ خاں کے فرزند تھے۔ ماشاء اللہ خاں ایرانی نژاد تھے جو احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد مرشد آباد چلے گئے تھے۔ انشاء اللہ خاں وہیں پیدا ہوئے سن شعور کو پہنچنے کے بعد وہ پھر دلی آئے اور شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے ان دنوں لکھنؤ میں علما شعرا کی بڑی سرپرستی ہو رہی تھی چنانچہ کچھ تو اس کے اثر سے اور کچھ شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار میں رہے۔ بعد میں سعادت علی خاں کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ سعادت علی خاں کی مصاحبت میں انشاء کے کچھ دن بہت اچھے گذرے اس سے پہلے بھی شاہ عالم بادشاہ

---

[1] " نوادرالالفاظ" مطبوعہ رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۵

[2] " نوادرالالفاظ" " " " "

اور شہزادہ سلیمان شکوہ کے درباروں میں بھی انھیں چین میسر آیا تھا۔ ان کی تصانیف اسی زمانے کے ہیں۔ لیکن انشاء کی عمر کا آخری زمانہ بڑی تکلیفوں میں گذرا ذرا سی بات پر سعادت علی خاں ان سے کبیدہ خاطر ہوگئے آخر ۱۲۲۵ھ میں دربار سے نکلنا پڑا۔ تنخواہ بھی بند ہوگئی بعد میں گو تنخواہ جاری ہوئی تاہم آزادی سلب کرلی گئی اس تکلیف کی حالت میں ۱۲۳۳ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس میں شک نہیں متاخرین شعرا میں انشاء نے اردو نثر پر بڑی توجہ کی۔ ان کا زمانہ وہ تھا جب کہ نثر بھی اظہار خیال کے ادبی سانچوں کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ اکثر شاعروں نے شعر کے بجائے نثر کو اپنے خیالات کا ذریعہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا ثبوت متاخر دور کے سب سے بڑے شاعر غالب کے مکتوبات سے ملتا ہے جو جدید ادبی نثر کے سنگ میل سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ غالب نے اردو مکتوب نویسی ۱۸۵۰ء کے بعد شروع کی اس لیے اس مقالہ میں ان کے مکتوبات سے بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔

انشاء ایک جدت پسند شاعر ہی کی حیثیت سے اردو ادبی تاریخ میں اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اردو نثر اور سب سے بڑھ کر اردو زبان کے بعض پہلوؤں کے مطالعہ کے سلسلے میں ان کی دریائے لطافت اولیات میں شمار کی جاسکتی ہے۔ "دریائے لطافت" کا آخری حصہ جو قتیل سے منسوب ہے ایک روایتی چیز ہے۔ لیکن قواعد زبان کا وہ حصہ جس میں اردو حروف اصوات سے بحث کی گئی ہے وہ انشاء کے زمانے کے لئے ایک غیر معمولی چیز ہے۔ اس میں شک نہیں اردو حروف یا اصوات سے متعلق انشاء کے بعض نظریے[1] ہماری موجودہ لسانی معلومات کے لحاظ سے ناقابل قبول ہوتے ہیں لیکن اس میں انشاء کا قصور نہیں۔ ان کے زمانے کا قصور ہے۔ انشاء کے یورپی

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون پروفیسر عبدالقادر سروری کلا سفیکیشن آف اردو ساونڈس آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ناگپور۔

معاصرین جیسے وغیرہ کے لسانی نظریوں بھی جدید دور کے علما اس طرح مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ اصل چیز جو انشاء کی کوششوں میں دیکھنے کی ہے وہ ان کا تجزیہ پسند ذہن اور فکر کی اپج ہے۔ فکر کی اپج کے لحاظ سے ان کی شاعری کسی اور شاعر سے پیچھے نہیں ہے۔

انشاء نے حسب ذیل تصانیف چھوڑی ہیں۔

۱- دریائے لطافت
۲- داستان رانی کیتکی و کنور اودے بہان
۳- سلک گوہر
۴- لطائف السعادت
۵- روزنامچہ ترکی
۶- دیوان شعر

دریائے لطافت چند طبقوں کی بولیوں کے علاوہ بلاغت کے اصول پر مشتمل یہ کارنامہ انشاء کا یادگار کارنامہ ہے۔ مسائل اور موضوع اُردو زبان کے متعلق ہے تذکروں میں تبایا گیا ہے کہ انشاء اللہ خاں نے یہ کتاب اپنے دوست قتیل کے ساتھ مل کر لکھی تھی۔ اس کا دوسرا حصہ جو متعلق معانی اور عروض پر ہے قتیل کا ہے۔ زبان کے قواعد سے متعلق پہلا حصہ انشاء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں۔

> کتاب کی جان پہلا حصہ ہی ہے اگرچہ اس سے قبل یعنی اہل یورپ نے متعدد کتابیں اردو قواعد پر لکھیں تھیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہماری اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے۔ اور حق

۱؎ دیباچہ دریائے لطافت مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔

یہ ہے کہ عجب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد
قواعد محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی
مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی"۔

اس میں انشاء نے اردو زبان اور اس کے مسائل کو بڑی کدو کاوش سے لکھا ہے۔ اردو زبان کے بارے میں انشاء کا دہلی کو معیار قرار دینا ان کے لئے ایک فطری بات تھی تاہم انھوں نے اپنی رایوں کو حتی الامکان احتیاط سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں فصاحت اہل دلی کا حصہ ہے۔ لیکن ہر دہلی والا اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا بلکہ ایسا دعویٰ صرف چند مخصوص لوگوں کو زیب دیکتا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں ہر محلے میں ایک نہ ایک فصیح موجود ہے۔

فصیح کی تعریف انھوں نے اس طرح کی ہے۔

۱۔ جو تنافر کلمات اور تعقید سے پاک ہو آگے چل کر تنافر کلمات کی توضیح کرتے ہیں۔ تنافر کلمات۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ لانا کہ متکلم اس کے بیان میں خطا کرے یا دوسرے کلام کی طرح جلدی سے تمام نہ کرسکے۔

زبان دانی کے چار شرطیں یہ ہیں۔

۱۔ اس شخص کے والدین دار الخلافہ کی خاک پاک سے ہوں۔
۲۔ اردو دانوں کی صحبت اٹھائی ہو۔
۳۔ اُردو کی تحصیل وتحقیق میں اس کا شغف۔
۴۔ تیز ذہن اور طبع وقار۔

لسانی قوت کا ثبوت "زرگری" وغیرہ مصنوعی بولیوں سے ہوتا ہے۔ یہ "ب" کی بات یا "ف" کی بات کہلاتی ہے۔ جن میں تمام الفاظ میں "ف" آتا ہے
تیسرے باب میں عماد الملک۔ بہار لال۔ صدر الدین صفاہانی۔ اور
ملا عبد الفرقان کی بحثیں ہیں وہ بڑے دلچسپ انداز میں شعرا پہ تنقیدیں کرتے ہیں

اور اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑتے

بی نورن اور میر کی گفتگو سنئے

" اجی او میر صاحب تم تو عید کے چاند ہوگئے دلی میں آتے تھے دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے۔ لکھنو میں تمہیں کیا ہوگیا کہ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھویں میں بھی نہ چلو تمہیں علی کی قسم۔

شعراء پر تنقید

اجی بی نورن یہ کیا بات فرماتی ہو تم تو اپنے جوڑے کی چین ہو۔ کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہوگیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے

ریختے میں استاد میاں ولی ہوے۔ ان پہ ترجمہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو۔ اور میاں ناجی اور میاں حاتم پھر سب سے بہتر مرزا رفیع سودا اور میر تقی صاحب اور پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب نور اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی استاد تھے۔ وہ لوگ تو سب مرگئے اور انکی قدردانی کرنے والے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنو کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں۔ اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر سبحان اللہ یہ کون میاں جرات بڑے شاعر پوچھو تو تمہارا خانماں کس دن شعر کہتا تھا۔ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے۔ اور دوسرے میاں مصحفی کو مطلق شعر نہیں رکھتے۔ اگر پوچھے ضرب زید عمرو کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو ذرا اپنے شاگردوں کے ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھ کر اپنا عرق بادیان

اور شہرت انا رین چھوڑ کر شاعری میں آگے قدم رکھا ہے ۔ اور میر
انشاء اللہ خاں میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے پری زاد تھے ہم
ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے ۔ اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں
مرزا مظہر جان جاناں کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں ۔ اور سب سے
زیادہ ایک اور کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ
آپ کو جانتا ہے ۔ رنگین تخلص ہے ۔ ایک قصہ کہا ہے اس مثنوی
کا نام دل پذیر رکھا ہے ۔

داستان رانی کیتکی و کنور اودے بھان انشاء کی لکھی ہوئی یہ کہانی نہ صرف ان کی جدت طبع کا نتیجہ ہے بلکہ ایک حیثیت
سے ٹھیٹ ہندوستانی کے معیار قائم کرنے ایک نادر کوشش ہے ۔ انشاء اللہ خاں
کی یہ کہانی ان کی طبیعت کی اپج معلوم ہوتی ہے ۔ اس کہانی کی زبان اور اس کا
اسلوب بیان یہ سچ ہے کہ اس زمانے کے عام تحریروں سے مختلف ہے ۔ لیکن وہ
بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے اس میں شک نہیں کہانی میں مافوق الفطرت
عناصر آجانے سے وہ فطری کہانی نہیں رہی لیکن انشاء کو اپنے زمانے کے مذاق
کی رعایت منظور تھی ۔ اس زمانے کے داستان گو داستان کو دلچسپ بنانے
ایک ایسی دنیا کی تصویر کھینچتے تھے جو اس مادی دنیا سے پرے ہوتی جو انسانوں
کی تھکی ہوئی روح کو دنیا کے مصائب اور ہنگاموں سے نجات دلا کر اطمینان اور
تسکین کی دنیا میں یعنی تخیل کی ایسی بہشت میں لے جاتی جہاں روح مادہ اور
عناصر کی آسودگیوں کو دھوکر واپس آتی ۔

انشاء کی اس کہانی کا کمال یہ ہے کہ عرب و عجم خطا و ختن کے بجائے اس کا
ماحول ہندوستانی ہے جہاں جوتش پنڈت قسمتوں کا حال بتاتے ہیں ۔ سوئمبر رچائے
جاتے ہیں ۔ لڑکیاں امرائیوں میں جھولتی ہیں ۔ یہ ایک عشقیہ داستان جس کا ہیرو حسب

معمول ایک شہزادہ ہے وہ کیتکی کو جھولتے دیکھتا ہے اور اسی وقت سے اس کی محبت کا دم بھرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی شیفتگی کا حال جان کر والدین کیتکی سے اس کا بیاہ کر دینا چاہتے ہیں لیکن کیتکی کے والدین بیاہ پر رضا مند نہیں ہوتے۔ آخر مافوق الفطرت چیزوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یعنی ایک جوگی شہزادے کو ہرن کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح اور بھی مشکلات ہوتی ہیں بالآخر کیتکی اور اودے بہان مل جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں اس میں تخیل اتنا بے نظیر نہیں جتنا اس سے ماقبل کی بعض داستانوں میں ملتا ہے۔ پھر اس کے اختیار اور مصنف کے التزام کو پیش نظر رکھتے ہوئے قصے کی اہمیت گھٹنے نہیں پاتی

چونکہ یہ داستان چھپ چکی ہے اس لیے یہاں اس کا اقتباس نہیں دیا گیا

سلک گوہر یہ انشا کی دوسری کہانی ہے جس میں انھوں نے بے نقطہ حروف کے استعمال کا التزام کیا ہے۔ رانی کیتکی کی داستان میں انھیں طبیعت کے جوہر دکھانے کی پھر بھی گنجائش تھی لیکن اس "لزوم ما لا یلزم" نے ان کے قلم کے ساتھ ان کی تخیل کو بھی جکڑ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ بے مزہ کہانی ہے اردو کے حروف تہجی میں صرف بارہ یا پندرہ حرف ایسے ہیں جن کو نقطے نہیں ہوتے ان حروف کے اندر کہانی لکھنے کی کوشش انشا کی جدت طرازی کے حد سے بڑھی خواہش کی آئینہ دار ہے اس کہانی کو جناب امتیاز علی خاں عرشی نے ۱۹۴۷ء میں کتب خانہ رامپور کے مخطوطے کی مدد سے مرتب کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شایع کر دیا ہے۔ کہانی بالکل معمولی ہے بلکہ گوہر آرا" ملک روس" کے عشق کا افسانہ ہے۔ قصہ میں بے مزگی بھی ہے اور ابتذال بھی۔ زبان میں لفظوں کے انتخاب میں دقت کی وجہ سے انہیں عجیب عجیب نامانوس لفظ تلاش کرنے پڑے اور بھونڈی ترکیبیں تراشنی پڑی ہیں۔ جس کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے۔

اور واہ واہ وہ کلام لالا سد اسکھ کا کہ کھراس سادوسرا
کم ہو گا محو کاسہ مدام ہو کر اس طرح کہ درا درا درا راگ کا
سرا۔ در در در دور کر در در در درکس کا در اس امداد
کا کہ ماد آسا سادہ رو ہو اور وہ ملمع کلمہ کہ ما دالورد اور
درداد و ملاؤ کر کر درکلوم دہ۔ اومردک الور گلو حمار صحرا
گدھا گلو مگو"

پھر بھی یہ کتاب اردو کے بڑے شاعر کی ذہنی سعی کے طور پر اُردو
ادب میں یادگار رہے گا۔

اس میں شادی کے موقع پر بارات کی بڑی اچھی تفصیل دی ہے باراتیوں
میں مختلف طبقات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس میں پنجابی۔ عربی۔ فارسی اور
اور ترکی کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔

روزنامچہ ترکی انشا، کے روزنامچہ ترکی کا تذکرہ جناب امتیاز علی عرشی نے
"سلک گوہر" کے دیباچے میں کیا ہے اس میں ۱۲۲۳ھ[1]
ایک ماہ کے حالات بیان کیے گیے ہیں یہ روزنامچہ ترکی زبان میں ہے لیکن کہیں
کہیں اردو عبارتیں اور فقرے ملتے ہیں۔

لطائف السعادت اس کتاب میں انشار نے نواب سعادت علی خان کے لطیفوں
کو "لطائف السعادت" کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس کتاب
کے صرف ایک نسخہ[1] کا پتہ چلا ہے جو بقول قاضی عبدالودود برٹش میوزیم لندن[2] میں
ہے۔ یہ لطیفے فارسی میں ہیں لیکن سعادت علی خاں سے منسوب کردہ اکثر جملے اردو
میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ جیسے:-

---

[1] فہرست مخطوطات فارسی صفحہ نمبر ۱۶ ۹

[2] مضمون لطائف السعادت مصنفہ انشار مطبوعہ معاصر (۴) صفحہ ۱۶۴

می خواستم کہ امام باغ بگویم حسب اتفاق "امام باپ" از زباغ برآمد خیلے بستم فرمودند معروض داشتم کہ کمال انفعال عارض حال شد ارشاد فرمودند" تم پیغمبرزادے ہو" امام باپ تمہاری زبان سے نکلا تو کیا ہوا مضائقہ"

ایک بیٹے کا حال لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

ارشاد شد کہ میر انشاء اللہ خاں شما پیشتر نشنید کہ الحال از معونت غیبی جائے بہ فراغت چنانکہ می خواستم حاصل شد۔

زبان ارد و چنیں فرمودند

" حسین علی اس وقت ایسے نکل گیا جیسے پتھری نکل جاتی ہے"

اس کتاب میں ۵۳ لطیفے ہیں اور لطیفے میں اکثر اُردو جملے ملتے ہیں۔

مرزا جان طپش مرزا جان نے "اردو محاورات" کے نام سے ایک لغت تصنیف کی تھی جو اس موضوع پر اردو کی اوّلیں تصانیف میں سے ہے اس میں اردو محاوروں کی شرح فارسی میں کی گئی ہے اور سند میں اردو اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا تخلص اکثر تذکروں میں "طپش" لکھا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی جنھوں نے "اُردو محاورات" کی تصحیح کی ہے ان کا تخلص "طپش" ہی لکھتے ہیں لیکن محمد یحیٰ تنہا مصنف سیر المصنفین نے طپش بتایا ہے۔

مرزا جان کا پورا نام مرزا محمد اسمٰعیل تھا لیکن مرزا جان کے لقب سے مشہور تھے۔ آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ بعد میں ہندوستان آگئے تھے۔ مرزا جان کے والد کا نام یوسف بیگ تھا مرزا جان دہلی ۱۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے عربی اور فارسی کی تحصیل بڑی محنت سے کی۔ شاعری کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ خواجہ میر درد کو وہ اپنی غزلیں دکھانے لگے۔ لیکن منشی کریم الدین "طبقات الشعراء" میں لکھتے ہیں طپش پہلے مرزا محمد یار بیگ سائل کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی

کے بعد وہاں سے چل کر کچھ دنوں لکھنؤ میں رہے لکھنؤ سے بنگالہ چلے گئے اور ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ سید احمد علی خاں کے دربار سے توسل ہو گیا۔ ان ہی کے حکم سے لغت "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" لکھی "شمس البیان" نام نواب ہی کے خطاب کی مناسبت رکھا تھا۔ یہ لغت ۱۷۹۳ء م ۱۲۰۷ھ میں مرتب ہوئی کچھ دن بعد ان کا کلیات بھی کالج کی طرف سے شائع ہوا۔ ۱۸۱۳ء تک کلکتہ میں مقیم تھے۔ ۱۲۲۹ھ میں وفات پائی۔ راقم کی استدعا پر جناب عبدالیب شادانی صدر شعبہ اردو فارسی نے لغت کے متعلق مواد بھیجا ہے۔ سرورق کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لغت ۱۲۶۵ھ میں مرشد آباد میں طبع ہوئی۔ خاتمہ پر ۱۲۶۶ھ درج ہے۔ لیکن دیباچہ کے اقتباس سے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے پتہ چلتا ہے کہ سنہ تالیف ۱۲۰۷ھ ہے

"در سنہ یک ہزار و دو صد و ہفت از ہجرت نبوی صلعم در شہر محرم الحرام بتاریخ بست دویم در بلدہ مرشد آباد بہ اہتمام رسید"

راقم الحروف کو ڈاکٹر شادانی کی مہربانی سے "شمس البیان" کے بارے میں حسب ذیل معلومات فراہم ہو سکی ہیں۔

طپش نے محرم ۱۲۰۷ھ میں شمس البیان مکمل کر لی تھی مگر بعد کے دو سال تک اس میں وہ اضافے کرتے رہے۔ چنانچہ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ کو جدید ایڈیشن تیار ہوا اور جس کا غالباً صرف ایک ہی نسخہ دنیا میں موجود ہے اور ڈاکٹر شادانی کا خیال ہے کہ ان کا مملوکہ نسخہ وہی ہے اس میں کل ۱۳۰۴ لفظ ہیں مطبوعہ نسخے میں جو پہلے ایڈیشن کی نقل ہے صرف ۱۲۹۰ لفظ ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے قلمی نسخوں میں بھی ۱۲۹۱ الفاظ ہیں۔

؎ ارباب نثر اردو صفحہ ۱۸۴

اس لغت کی تکمیل کے بعد مرزا جان طپش فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے حلقۂ ملازمت میں داخل ہوئے وہیں ایک مثنوی میر حسن کی تقلید میں لکھی اور بہار دانش نام رکھا۔ ان کا دیوان بھی کالج کی طرف سے شایع ہوا۔ گارساں ڈی تاس نے ان کی ایک کتاب "گلزار مضامین" کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو ۱۱۹۹ء میں طبع ہوئی۔ جس کے متعلق ڈی۔ تاس لکھتا ہے۔

"طپش کی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے تاہم اس میں تذکرہ کسی بھی صورت ہے کیونکہ دیباچے میں مصنف نے اردو شاعری اور شاعروں سے بحث کی ہے[1]۔"

ذیل میں شمس البیان کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس سے طپش کی زبان اور اسلوب بیان پر روشنی پڑتی ہے طپش نے محاوروں کی سند اشعار سے پیش کی ہے۔

" انگاروں پہ لوٹنا۔ کنایہ از بیقراری کہ دو عالم رشک لاحق گردد ولی دکھنی گوید۔

شعلۂ خو جب سے نظر آتا نہیں
تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولی

رفو چکر میں آنا۔ حیران ماندن بہ مشاہدہ امر عجیب و عوام بازاری استعمال کنندہ سراج الدین سراج دکھنی گوید:۔

رفو گر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے
اگر دیکھے میرا سینہ رفو چکر میں آجائے[2]

مولوی سید محمد صاحب نے ارباب نثر اردو میں مرزا جان طپش کے تفصیلی

---

[1] ارباب نثر اردو صفحہ ۱۹۰ [2] ارباب نثر اردو صفحہ ۱۹۵

حالات لکھے ہیں اس میں انھوں نے طپش کی ایک اور مثنوی یوسف زلیخا کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن خود ان کو بھی یقین نہیں کہ یہ طپش ہی کی مثنوی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ہم تحقیق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ طپش کے یہ قصے بھی نظم کیا ہے[۱]

تبصرہ یہ دور دسویں صدی ہجری کے ختم سے شروع ہوتا ہے اس عرصہ میں اردو نظم و نثر کافی نشو و نما پا چکی تھی۔ لیکن اس نشو و نما کے ساتھ اس پر فارسی کا اثر بھی گہرا پڑنے لگا تھا۔ جہاں شاعری میں تمام تر فارسی بحریں آگئی تھیں وہیں نثر میں بھی فارسی اسلوب فارسی اضافت اور ترکیبوں کی زیادتی ہونے لگی تھی۔ اس طرح نشو و نما پائی ہوئی شکل میں قطع نظر چند امور کے اکثر ہندی لفظوں کے ترک کرنے اور جملوں کی ساخت کا نیا پیرایہ اختیار کرنے کی وجہ سے وہ قدیم ترا دوار کی نثر سے کچھ الگ کچھ نکھری ہوئی اور جدید دور کی نثر سے بہت قریب ہوئی تھی۔ نظم میں ایرانی قالب کے ساتھ ساتھ نثر میں بیان اور حسن بیان کے سارے فروعات میں وہ فارسی کی پوری تقلید کرنے لگی تھی اتنا کہ جب قدیم اردو کی چھان بین کے سلسلے میں دکھنی ادب کے احیاء کی کوشش کی گئی تو اس دور کے ایک مشہور انشاء پرداز نیاز فتح پوری نے نہایت لاپرواہی سے لکھ دیا تھا کہ

دکھنی سے اردو کا ڈانڈا ملانا اور یہ کہنا کہ اردو دکھنی کی ترقی یافتہ شکل ہے ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت آدم کے سلسلے کو ڈاروِن کی تحقیق سے ملانا۔

انشاء پرداز کا یہ اشتباہ اس زمانے تک ہماری ساری لسانی معلومات

---

[۱] ارباب نثر اردو صفحہ ۱۹۵

کافی مواد اور تحقیقی نتائج کی عدم موجودگی میں بہت کچھ اچنبے کی بات نہیں
نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن حال کے محققین اردو جیسے ڈاکٹر عبدالحق۔ پروفیسر
شیرانی۔ ڈاکٹر زور۔ پروفیسر سروری کی تحقیقات اور ماہرین لسانیات
جیسے گریرسن۔ سنتی کمار چیٹرجی کے مطالعہ کے نتیجوں کی اشاعت کے بعد اس طرح
کے اشتباہ کی گنجائش نہیں رہی۔ اس سے پہلے کے بھی اکثر صاحب رائے
بزرگوں۔ میر۔ ڈیسی۔ ٹاس وغیرہ نے قدیم اردو کے روپ اور موجودہ اردو
کو دو علیحدہ زبانیں کبھی نہیں سمجھا۔ شمالی ہند کی نثر میں عربی فارسی الفاظ اور
تراکیب کی بہتات اور ترویج کی کثرت میں مرزا مظہر جان جاناں۔ حاتم کی
تحریک اصلاح زبان کا بھی بہت حصہ رہا ہے۔ جس کا مقصد یہی تھا کہ زبان
اردو سے ہندی الفاظ اور ترکیبیں خارج کی جائیں۔ ان کے بجائے عربی فارسی
الفاظ کا استعمال زیادہ ہو۔ انھوں نے "لچر" سی زبان دکھنی کو اردوئے معلی
(قلعہ کی شائستہ زبان) بنانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں فطرتاً فارسی
نظم و نثر کے شاہکاروں کو اپنا مطمح نظر بنایا۔

نتیجتاً اردو نثر کا نشو و نما اس شکل میں ہوتا تھا جس روپ میں ہم اسے
اس دور میں دیکھتے ہیں۔ اس کی بہتر مثال ولی اورنگ آبادی کے دو ادوار کے
کلام کے تفاوت میں ملتے ہیں۔ جن کا سفر دلی سے قبل اور بعد کا رنگ شاعری
بالکل جداگانہ تھا۔

(۱۱)

نثر کی توسیع

بارہویں صدی میں نثر کی وسعت۔ مذہبی کتابوں کی
نوعیت (۱) تراجم قرآن شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر
کا ترجمہ قرآن (۲) فقہ۔ "سراج الایمان" تقسیم میراث۔ احوال میت
ترجمہ کیدانی (۳) حدیث۔ انوار محمدی۔ ترجمہ زواجر۔ مجموعہ المسائل
تصوف۔ مجمع العطایا۔ کتابوں کی جنگ۔ رسالہ بدرالدجیٰ قواعد زبان
کے سلسلے میں یورپین مصنفین کے کارنامے۔ یورپ اور ہند کے
تعلقات۔ پہلا یورپی مصنف جان جوشوا کیٹلر۔ چمبرلین۔ ڈیوڈ ہل
شلز۔ جوہان فریڈرتشن فرٹز کیسانو بیل گٹی۔ فرگوسن۔ ایوارس
امیل۔ ہندوستانی حروف تہجی مصنف نامعلوم۔ بی ڈف
ہیڈلے۔ جان کرسٹوفر ایڈی ننگ سالہ قواعد ہندی مصنف
نامعلوم۔ ریختہ ہندی کے صرف و نحو۔ انشار کا آغاز۔ انشاء
کی تعریف۔ انشا کے بارے میں سلیمان ندوی گارساں ڈی
تاسی کی آرا۔ "دستور النثر" "دستور الہدایت" "فن انشاء"
تاریخ:۔ ترجمہ تاریخ فیروز شاہی۔ تاریخ ہندوستان

بہادر نامہ سیر۔ اس دور کی مشہور ہستی باقرؔ آگاہ۔ حالات زندگی تصانیف منظوم تصانیف کے نثری دیباچے۔ دیباچہ مراۃ الجنان۔ دیباچہ دیوان۔ دیباچہ ہشت بہشت۔ دیباچہ فوائد۔ درفوائد۔ دیباچہ گلزارِ عشق۔ دیباچہ تحفۃ الاحباب آگاہ کی مکمل تصنیف نثر "ریاض السیر" بدرالدولہ کی تصنیف نثرالجواہر۔ بدرالدولہ کے حالات زندگی تصانیف قصص ملکہ روم و فقہیہ قصہ دلالہ مختالہ اس دور کا خاتمہ۔

نثر کی توسیع

بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) کا آغاز اردو نثر میں توسیعی مساعی کے آغاز کا زمانہ ہے۔ یہ اردو میں تجربی علوم اور سائنس پر تصنیف و تالیف کے آغاز کا زمانہ بھی ہے جس میں اردو کے انشا پرداز تصور اور نصب العین کی رنگین دنیا سے ہٹ کر حقیقی ماحول کو ڈھونڈنے کی طرف مائل ہوئے۔ اور ان کی نظریں عالم بالا سے نیچے اتر کر عالم آب و گل میں بھی دلچسپیوں کے موضوع تلاش کرنے لگیں۔ اس طرح ستاروں کی گذرگاہوں کو ڈھونڈنے والی نگاہیں اب زمین کی طرف مرکوز ہوگئیں اور عالم جو اب تک محض "خواب و خیال" "مایا" اور "جنجال" تھا رفتہ رفتہ ٹھوس خد و خال اختیار کرنے لگا جن کی سختی نرمی اور حسن و قبح کا اردو انشا پردازوں کو بھی اندازہ ہونے لگا۔ اس احساس سے انہیں چیزوں کی حقیقت اور ماہیت کی تلاش ہوئی۔ اس زمانے میں اردو زبان کے علمی مطالعہ اور زبان کی قواعد کے مطالعہ کا بھی آغاز ہوا۔

گذری ہوئی صدیوں میں اردو نثر کا موضوع مذہب یا دل بہلائی کی داستان تک ہی محدود تھا۔ لیکن اب مذہب اور قصص کے علاوہ تاریخ سیر سائنس اور انشا کی طرف بھی توجہ ہوئی۔

نثر پر گو مذہب کا تسلط برقرار رہا لیکن اب اس کی نوعیت بدلنے لگی۔ اور مذہب کا مطالعہ فلسفیانہ بنیادوں پر کرنے کے رجحان کا آغاز ہوا ساتھ ہی قرآن کی علمی تعلیم پر بھی توجہ مرکوز ہوئی۔

اردو نثر کے اطراف سے تصوف کا حصار ڈھایا جانے لگا۔ اور اس کی بجائے مذہب کے علمی پہلو فقہ حدیث تفسیر وغیرہ کو اہمیت حاصل ہونے لگی یہ صحیح ہے کہ اس دور میں بھی مذہبی تصانیف کافی تعداد میں ملتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے۔ ان کی نوعیت مختلف ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں مذہب کو سائنس اور فلسفہ کی روشنی میں جانچنے کی مساعی جن بزرگوں نے کی ان میں سرسید اور ان کے رفقا محسن الملک اعظم یار جنگ شبلی نذیر احمد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان بزرگوں کی کوشش دراصل جدید عہد کے تقاضوں کا نتیجہ تھیں۔ لیکن ان سے پیشتر شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر وغیرہ کے کارنامے بھی نذر انداز نہیں کئے جا سکتے جو مذہب کو اس کے اصلی روپ میں عوام سے روشناس کرانے اور خود ان کی قوت فیصلہ کو اکسا کر انہیں اپنا صحیح راستہ تلاش کرسکنے کے قابل بنانے کے مقصد سے لکھے گئے تھے۔

شاہ رفیع الدین

شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے فرزند تھے۔ شاہ ولی اللہ اپنی بے مثل فارسی تصنیف حجۃ البالغہ کی وجہ سے عالم اسلام میں ممتاز درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی عظمت اور تبحر کے اکثر بزرگ معترف ہیں۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی جو خود بھی اسلامیات کے ایک بہت بڑے عالم ہیں شاہ ولی اللہ کی مذہبی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "آخیر زمانہ میں جب کہ اسلام کا نفس بازپسین تھا۔
> شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے
> آگے غزالی۔ رازی۔ ابن رشد کے کارنامے سے بھی ماند پڑگئے"

شاہ رفیع الدین شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند تھے۔ ولی اللہ کے دوسرے دو صاحبزادے شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز بھی بڑے بلند پایہ

عالم ہوئے ہیں۔

شاہ رفیع الدین اور ان کے بھائی شاہ عبدالقادر نے علی الترتیب سنہ ۱۲۰۰ھ اور سنہ ۱۲۰۵ھ میں قرآن کا اردو ترجمہ مکمل کیا۔ عربی اور خاص طور پر قرآن مجید جیسی بلند پایہ کتاب کی ادبی عربی کا ترجمہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن شاہ رفیع الدین نے اس نوخیز زبان کو قرآنی مطلب کا جس طرح حامل بنایا ہے وہ اس دور کا قابل قدر کارنامہ ہے۔

شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کے پانچ ہی سال بعد سنہ ۱۲۰۵ھ میں ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا اور اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اس کام کو نہایت اہتمام سے مکمل کر سکے۔ تاہم دونوں بھائیوں کے ترجمے میں تھوڑا فرق ہے۔ شاہ رفیع الدین تحت اللفظ ترجمہ کرتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر معنی و مطلب پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ یہاں دونوں کے ترجموں کے اقتباس دیے جاتے ہیں جس سے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق بخوبی ہو سکے گی۔ دونوں ترجموں کا اقتباس سورۂ انعام سے پیش کیا جا رہا ہے جس سے دونوں کے انداز بیان پر روشنی پڑ سکیگی۔

شاہ رفیع الدین کا ترجمہ حسب ذیل ہے

"اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے بیان کرتے تھے اوپر تمہارے نشانیاں میری اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمہارے کی سے۔ کہا انھوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے۔ اور فریب دیا ان کو زندگانی دنیا کی نے۔ اور گواہی دی انھوں نے اوپر جانوں اپنی کے یہ کہ وہ تھے کافر"

شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کا اقتباس یہ ہے

"اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول
تمہارے اندر کے سناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اس دن
کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے اپنے گناہ اور ان کو بہکایا دنیا
کی زندگانی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر"

ان ترجموں پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے نہ صرف
قرآن کے مطالب و معانی کا زیادہ خیال رکھا بلکہ اردو زبان کے مخصوص نہج اور
خصوصیات کو بھی نظرانداز نہ ہونے دیا۔ اس لیے ان کا ترجمہ زیادہ سلیس ہے۔"

فقہ قرآن کے مذکورہ بالا ترجموں کے بعد حدیث اور تفسیر کے کئی کارنامے بھی
ملتے ہیں۔ فقہ میں احمد بن محمد مغربی کی تصنیف "سراج الایمان" محمد ناصر خاں
کی "تقسیم المیراث" شرف الدولہ کی "فقہ کیدانی" اور دو مزید کتابوں
"مجموعہ المسائل" "احوال میت" کے مخطوطے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں

سراج الایمان اسلامی عقاید اور فقہ کے مسائل پر ایک رسالہ ہے یہ ۱۲۰۱ھ
کی تصنیف ہے[51] اس کے مخطوطے کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ دونوں میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی مرتبہ
فہرست میں اس مخطوطے کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ نسخہ مصنف ہی کے ہاتھ کا
لکھا ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کا مخطوطہ ۱۲۴۱ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس رسالہ کا مصنف
احمد بن محمد مغربی ہے۔ مصنف کے کچھ حالات معلوم نہ ہوسکے۔ کتاب کے دیباچے
میں مصنف نے سبب تالیف پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔
"بغیر سمجھے احکام عقائد کے ایمان آدمی کا درست نہیں ہوتا"[52]

---

۵۱ فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ (۴۰)
۵۲ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ فن مذہب صفحہ (۲۲۹)

یہ رسالہ سادہ زبان میں لکھا گیا ہے اور تصنع یا تکلف اس کی زبان پر نہیں ملتا۔ مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

بعد مدت کے حکم ہوگا کہ حساب آدمیوں کی نیکی اور بدی کا دیکھیں مسلمانوں کو خدائے تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آسان کریگا۔ اور کافروں کو مشکل۔ اور گرفتاری ہوئیگی۔

تقسیم المیراث اس کتاب میں میراث کی تقسیم کے اصول اور فارسی کی مستند کتابوں جیسے "مشکوٰۃ المصابیح" وغیرہ سے اخذ کرکے اردو میں پیش کیے گئے ہیں۔ رسالے کا مصنف محمد ناصر خاں ہے۔ لیکن اس کے حالات کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس رسالے کی زبان پر عربی جملوں کی ساخت کا اثر غالب ہے تاہم یہ رسالہ بھی صاف زبان میں لکھا گیا ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔ جس سے رسالے کی تالیف کے سبب اور اسلوب کا اندازہ ہو سکے گا۔

"پس جان تو اکثر مسائل مذکور شرح مولانا زادہ کے سے اور بعضے مشکوٰۃ المصابیح سے زبان ہندی میں لکھنے میں آئے ہیں۔ اس سبب سے کہ مردمانِ اہلِ ہند پر آسان ہو یا کرنا ان کا واسطے آسانی عبارت کے اور تفہیم زبان کے اور واسطے صورت ہر ایک سہم کے کھینچے گئے ہیں پس تعداد جملہ اشکال کے (۱۸۰) ہے[1]

احوال میت اس رسالہ کے مصنف محمد شمس الدین شمس ہیں جو بیدر کے قاضیوں میں سے تھے۔ یہ فارسی اردو کے اچھے شاعر تھے۔ رسالہ "احوال میت" اردو نثر میں لکھا گیا ہے اس میں تجہیز و تکفین نماز جنازہ اور زیارتِ قبور وغیرہ سے متعلق جملہ مسائل کو آیات و احادیث کی روشنی میں مدلل بیان کیا

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ فنِ تصوف صفحہ ۲۵۰

گیا ہے اور بدعتوں کی مخالفت کی گئی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۰۰ھ ہے۔
مصنف خدا کی حمد اس طرح کرتا ہے۔

"شروع کرتا ہوں میں نام سے حق سبحانہ جل شانہ کے پیدا کرنے والا اور مارنے والا اور جلانے والا مختار اپنے ملک کا ہے خواہ کسی کا بیٹا چھین لے خواہ کسی کی بیٹی کسی کو حکم میں اس کے دم مارنے کی طاقت نہیں۔"

تاریخ تصنیف کا پتہ اس سے چلتا ہے۔

"شکر حق سبحانہ جل شانہ کا کہ یہ رسالہ احوال میت کا گیارہویں تاریخ ماہ مبارک رمضان شریف میں وقت قبل جمعہ کے سنہ ۱۲۰۰ ہجری میں تیار ہوا ولکرمہ"

اس رسالہ کا ایک مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے[1]

ترجمہ کیدانی فقہ ہی کے بیان میں نوایط خاندان کے مشہور عالم اور آگاہ کے رشتہ دار شرف الدولہ کا بھی نام آتا ہے۔ جنھوں نے "کیدانی" کا ترجمہ اردو نثر میں کیا تھا۔

شرف الدولہ کے حالات زندگی ان کا نام محمد غوث تھا اور آگاہ کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ سنہ ۱۱۶۶ھ میں ارکاٹ میں تولد ہوئے عربی و فارسی کی تعلیم اپنے دادا نظام الدین احمد سے حاصل کی اس کے بعد امین الدین احمد خاں اور عبد العلی فرنگی محل سے فیض حاصل کیا ختم تعلیم کے بعد امیر الامراء والا جاہ کے دربار سے متوسل رہے۔ پھر سدھوٹ ہوتے ہوئے حیدرآباد آئے۔ سنہ ۱۲۱۵ھ میں عظیم الدولہ نے دوبارہ مدراس طلب کیا اور ایک

---

[1] تذکرہ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن جلد اول صفحہ

اہم خدمت مدارالمہامی پر مامور کیا۔ نیز۔ شرف الدولہ غالب جنگ اشرف الملک کے خطاب سے سرفراز کیا ۱۲۳۸ھ میں ان کا انتقال ہوا مسجد والا جاہی مدراس میں مدفون ہوئے۔ نصیرالدین ہاشمی صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں

"انھوں نے ۳۱ کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سے تیس عربی و فارسی ہیں ایک اردو"

اردو تصنیف "کیدانی" کا ترجمہ ہے جو حنفی فقہ کے بارے میں ہے۔ اس کا "کچھ اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

جہاں تو بشیک بندہ جانچا گیا ہے۔ درمیان اس کے کہ فرماں برداری کرے وہ اللہ برتر کے تیئں بھی ثواب پاوئے اور درمیان اس کے کہ نافرمانی اوس کی پھر عذاب کیا وے اور جانچ اللہ کی موقوف ہے ساتھ عمل شرع کے اور ساتھ عمل غیر شرع کے [۱]

اس کا مخطوطہ اور کہیں نہیں ملا۔ مندرجہ بالا اقتباس یورپ میں دکھنی مخطوطات سے منقول ہے۔

حدیث حدیث کے موضوع پر اس زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں علی جونپوری کی "انوار محمدی" اور شیخ آدم "ترجمہ زواجر" قابل ذکر کارنامے ہیں۔

انوار محمدی "انوار محمدی" فن حدیث کی مستند عربی کتاب "شمائل ترمذی" کا اردو نثر میں ترجمہ ہے جو علی جونپوری المشہور بہ کرامت علی نے ۱۲۱۲ھ میں کیا [۲] ترجمہ سے پہلے مصنف نے ایک مختصر سا دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں اس کتاب کے لکھنے کے جو محرکات تھے ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا

۱۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۴۶۸

۲۔ فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ ۲۱

ہے کہ ہندی میں اس قسم کی کتابیں کم تھیں اس لیے اسے شمائل ترمذی کا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ترجمہ اصلی عربی عبارت کے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ صفحہ کا تین چوتھائی حصہ اصلی عربی عبارت کے لیے وقف ہے۔ اور باقی حصہ میں اس کا اردو ترجمہ لکھا گیا ہے۔ ترجمہ تحت اللفظ ہے۔ ساتھ ساتھ مشکل مقامات پر تشریحی نوٹ بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں بھی مرتب فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ پروفیسر سروری نے یہ لکھا ہے کہ یہ مصنف ہی کے ہاتھ کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سنہ ۱۲۱۲ھ ہے جو ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

"الحمد اللہ کی سنہ بارہ سو باون ہجری نبوی علی صاحب الصلوٰۃ والسلام مہینے شوال تاریخ سولھویں میں اس کتاب کے ترجمہ سے فراغت ہوئی"

"ترجمہ کی نوعیت کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکے گا"

سب تعریف اللہ ہی کو واسطے لائق ہے جس نے ہم سب کو اپنے تمام مخلوقات سے افضل کرنے کے لیے آدمی بنایا۔ اور سب امتوں سے عزت دینے کے لیے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا کیا اور اس مذہب میں نجات دینے کے لیے مذہب سنت وجماعت کا عطا کیا"

ترجمہ زواجر "ترجمہ زواجر" شہاب الدین احمد متوفی ۹۷۳ھ کی تصنیف "زواجر فی الیبان الکبائر" کا ترجمہ ہے جو شیخ آدم نے کیا ہے۔ تمہید میں وہ لکھتے ہیں۔

"شیخ آدم بہ زبان اردو دکھنی ترجمہ نمودہ نام آں ترجمہ آدم فی الحدیث مقرر کرد"

اصل میں شیخ آدم جو اپنے زمانے کے اچھے عالم تھے نواب امیرالملک
محمد علی حسین خاں کو "زواجر" کا درس دیا کرتے تھے۔ ان ہی کی فرمائش پر مصنف
نے یہ ترجمہ مکمل کیا۔ یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ذیل میں اس ترجمہ کا
اقتباس دیا جاتا ہے:۔

"جمیع حمد و ثنا کے تیئں سزاوار ہے جو گناہ زہر کے تیں توبہ کا
زہر مہرہ بخشا ہے اور عصیاں کی کوہ کیش عاصی کی عذو حیا کی
ٹانکی سیا اور کیا ہے جل جلالہ وعظیم شانہ سب نعمت و درود
رسول کے تیئں لائق ہے جو گنہگار بدکار انسان کے تیئں کمال
رحمت و شفقت سیں اپنی شفاعت کے دامن میں چھپا لیا ہے۔"

امیرالملک ارکاٹ کے سربرآوردہ امیروں سے تھے۔ اس زمانے میں مدراس
اور ارکاٹ میں مذہبی علوم کی تصنیف و تالیف پر کافی توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ
گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں صدی کے آغاز میں مدراس متبحر عالموں
کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ بات بھی اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مدراس
میں فورٹ ولیم کالج سے پہلے تصنیف و تالیف کے لیے قدیم دکھنی زبان استعمال
کی جاتی تھی۔ حالانکہ اس زمانے میں دکن اور خاص طور پر حیدرآباد میں
شمالی ہند کی زبان کا کافی اثر پھیل چکا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں قدیم زبان
کی جو تصانیف ہم کو ملتی ہیں وہ زیادہ تر مدراس ہی کے علاقے سے تعلق رکھتی
ہیں۔ لیکن مدراس کے علما اپنی زبان کو اردو دکھنی اور ہندی تینوں ناموں سے
یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ اوپر کے فارسی اقتباس سے یہ ظاہر ہوگا کہ مصنف نے ترجمہ
کی زبان کے لیے اردو اور دکھنی دونوں کا استعمال ایک ساتھ کیا ہے۔

مجموعۃ المسائل

یہ عبدالمجید ویلوری کی تصنیف ہے جو شیخ محمود کے مرید تھے
یہ شیخ محمود غالباً وہی بزرگ ہیں جو شیریں دہن کے نام سے

موسوم تھے اور برہان الدین جانم کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان کا ذکر پچھلے صفحات
میں گذر چکا ہے اس لحاظ سے "مجموعۃ المسائل" کی تصنیف کا زمانہ گیارہویں صدی
ہجری کا آخری زمانہ ہوسکتا ہے۔ سنہ تصنیف کہیں درج نہیں ہے۔ کتاب ۲۲
ابواب پر مشتمل ہے جن میں مذہب کے احکام اور مسائل جیسے روزہ نماز وضو
غسل تیمم وغیرہ سے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ اس رسالہ کی زبان پر دکھنی کا اثر ہے
لیکن جملوں کی ساخت میں عربی کا اثر اسی طرح موجود ہے جو شمالی ہند کے اس
زمانے کے کارناموں کی خصوصیت تھی جن کے اقتباسات اوپر لکھے جاچکے ہیں
ذیل کے اقتباس سے اس کی زبان اور اسلوب بیان کا اندازہ ہوسکے گا مصنف
سبب تصنیف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

جمع کرنا اس کتاب کا سبب فائدہ عوام الناس کا ہے اور یہ کتاب
ساتھ عبارت فارسی مختصر تھی مگر مفہوم ہونے جمہور انام کے لیئے مدد
سے اللہ تعالیٰ کی موافق سمجھ اپنی بیچ دکھنی کے لایا"۔

اس کتاب کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے[1]

فقہ و حدیث کے علاوہ اس زمانے میں سلوک و معرفت کے مسائل پر بھی کتابیں
لکھی گئیں۔ لیکن۔ اب ان کے اسلوب میں بہت تغیر ہوچکا تھا۔ چنانچہ اس زمانے
کے لگ بھگ سلوک پر جو بھی تصنیف یا تالیف ہوئی اس میں مسائل بیان کرنے کا
انداز واضح تر اور زبان نسبتاً صاف ہے۔ اس خصوص میں شاہ میر کا ذکر پچھلے
صفحات میں گزر چکا ہے۔ شاہ میر کے بعد دوسری قابل ذکر ہستی حسین شاہ ولی ثانی
کی ہے جن کی کتاب "مجمع العطایا" خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا نام دو
مختلف مقامات پر دو طرح لکھا ہے "مجمع العطایا" اور "مجمع العطار" کا ایک مخطوطہ مرتب

---

[1] مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ فن تعمیر نمبر ۹۴۸

مقالہ کو کتب خانہ روضتین میں دستیاب ہوا ہے مصنف" سیر گلبرگہ" کے بیان کے بموجب حسین شاہ ولی ثانی خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے۔ جن سے والی کلیانی نے اپنی دختر بیاہ دی تھی۔ ان سے بہت سے خوارق عادات منسوب ہیں شاہ ولی کا انتقال سنہ ۱۲۰۶ھ میں ہوا اور گولکنڈہ کے قریب دفن کئے گئے۔"

"مجمع العطایا" کے محولہ بالا نسخے کے اختتام پر ۱۲۱۳ھ درج ہے۔ جو غالباً سنہ کتابت ہے۔ کتاب اس سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اس میں انسان و کائنات کی تخلیق خلقت کی تقسیم وغیرہ پر بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک سائنسی اور فلسفیانہ موضوع ہے لیکن اس رسالہ میں روایت کی نگہداشت نے اس کو بھی افسانے کا رنگ دے دیا ہے اس کتاب میں "شمس العلوم" کا بھی حوالہ دیا گیا ہے

دنیا کی تخلیق کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں،

روایت ہے کہ پیدائش خلقت کے تئیں اول خدائے تعالیٰ بیچ زمین اور آسمان کے ایک دیو پیدا کیا آتش اور نام اس کا مارچہ تھا۔ جیساکہ بیچ قرآن مجید کے خدانے فرمایا ہے۔ یعنی پیدا کیا مارجہ سے دیونی ماجینی پیدا کیا اور جب دونوں مل کر جفت ہوئی اس دیونی سے ایک پسر اور ایک دختر پیدا ہوئے نام اس پسر کا جنین اور جستی دونوں ملکر جفت ہوئے۔ ان سے تین اولاد ہوئی۔ دو پسر ایک دختر نام یک پسر کا عزرائیل اور دوسرے پسر کا اسیر مہادیو اور نام دختر کا کورجا پری بعد ازاں اسیر مہادیو اور کورجا پری ہر دو جفت ہوئے اور شکم کورجا پری سے بارہ پسر اور بارہ دختر پیدا ہوئے نام ان پسروں کا سنو۔ کوسائین۔ نارائین۔ بشن کشن برہمن۔ پرتیسر۔ گوبند۔ لات۔ عزیٰ۔ جگنات۔ بجودہر۔ دورت

اس کے بعد طویل تمہید ہے کہ کس طرح فرشتوں نے چار قسم کی مٹی لائی۔

ابلیس نے مٹی سے کیا کیا پھر کس طرح مٹی سے خدا نے آدم کو پیدا کیا اس کا حال ذیل کے اقتباس میں ملے گا۔

بیان تم سنو اس خاک کا جیس طور، بیچ کتاب" معارج کے لکھا ہے برس انچالیس تک اس خاک پر بارانِ غم برستا رہا۔ بعد از حکم پروردگار یوں ہوا کہ برس ایک تلک بارانِ عیش اس خاک پر برسا اس واسطے ذات انسان پر خوشی کم ہے اور غم بہوت ہے"

اسی طرح اس کتاب میں فلسفیانہ مسائل جیسے انسان و کائنات کی تخلیق وغیرہ کو قصوں اور کہانیوں کا روپ دے دیا گیا ہے۔

کتابوں کی جنگ اٹھارویں صدی عیسوی میں فرانس اور انگلستان کے ادب میں ادبی کارناموں کو جانچنے کے لیئے دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک گروہ قدیم مصنفین کو پسند کرتا تھا تو دوسرا جدید کی تائید کرتا اس سلسلے میں خوب خوب لفظی جنگیں چلیں مشہور طنز نگار سوئفٹ (   ) نے اپنی تصنیف کتابوں کی جنگ "The Battle of Books" میں اس کا مذاق اڑایا ہے"

اردو میں اس دور میں مذہب کے موضوع پر ایسی ہی معرکہ آرائیاں رہیں اس کا کچھ اندازہ جامعہ عثمانیہ کے مخزونہ ایک رسالہ "بدرالدجیٰ" سے ہو سکتا ہے۔

اس رسالے کے مصنف کا نام میر پانچو بتایا گیا ہے جو نصیر آباد کے رہنے والے تھے میر صاحب نے مراد آباد کے کسی "میاں جی" معلم کتابی کی تصنیف" نور الہدیٰ" کا تخلیہ کیا ہے۔ میاں جی کی کتاب فقہ کے مسائل پر مشتمل تھی میر صاحب کو میاں جی سے اکثر امور میں اختلاف تھا اور وہ میاں جی کی خبر لیتے ہیں کہ یہ فقہ میں بھی دخل دینے لگا ہے رسالہ بدرالدجیٰ میں میاں جی کی عبارت نقل کی گئی ہے۔ ہر وقت میاں جی کی عبارت قول کے تحت لکھی گئی ہے اور پھر اس کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ ایک جگہ میر صاحب لکھتے ہیں۔

"معلم کتابی میاں جی نغفہ میں بھی دخل دینے لگا سبحان اللہ
مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ جب چیونٹی کے پر نکلے موت کا پیغام
ہوا پیلا منکر قدرتِ رحمان شان خالق کون و مکاں کیا جانے"

تجھے کیا کام شرع مصطفٰے سے ۔ تو اپنے شیخ سدو کو منالے

مصنف کے بقول میاں جی کی تاریکی ضلالت و جہالت کو دور کرنے کے
لئے یہ رسالہ لکھا گیا۔ میاں جی کے ایک قول کا میر صاحب اس طرح مضحکہ اڑاتے ہیں

"میاں جی جھوٹا کسی کے فتوی کو کسی کا لکھا ہوا کہتا ہے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ کئی رسالوں تک پھیل گیا اس معرکہ میں
میاں جی اور میر صاحب کے اور کئی دوست احباب بھی اتر آئے جن میں سے چند
کے نام یہ ہیں فریدالزماں عبدالوھاب وغیرہ ان معرکوں کا نتیجہ چند رسالے ہیں
جن میں سے کچھ بدرالدجیٰ کے ساتھ شامل ہیں۔ جیسے "جزاء جمیل" جو فتح الجلیل"
کے جواب میں لکھا گیا۔ تبر عربی جو تیغ ہندی کا جواب ہے۔ اس سلسلے کا آخری
رسالہ ہدایت الکلام معلوم ہوتا ہے۔ میاں جی غالبًا وہابی عقیدے کے تھے
اس لیئے میر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو ان سے پرخاش ہوگئی تھی۔ اس طرح
کے معرکے اٹھارہویں صدی کی خصوصیت معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کا ایک اور
مناظرہ فورٹ ولیم کے قیام کے بعد "برہان قاطع" کے معاملے پر غالب اور ان
کے رفقا میں بھی ملتا ہے۔

صرف ونحو: اس دور کا سب سے اہم کارنامہ زبان کی صرف ونحو کے مطالعہ
کا آغاز اور اس میدان میں تحقیق کی ابتدا ہے۔ اسی زمانے
میں یورپی قومیں تجارت اور دوسرے مفادات کے لیے ہندوستان میں
آنے کے بعد انھیں یہاں کی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان
اردو یا ہندوستانی کو سیکھنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور اسی لیئے ان

نو واردوں نے ہندوستانی زبان سیکھنے کے لیئے صرف و نحو کی کتابوں پر توجہ شروع کی۔ ہندوستانیوں کو قواعد زبان سیکھنے کی ایسی ضرورت نہیں تھی بنابریں ہندوستانیوں اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔ ان یورپی مصنفین کے مطالعے کی ضرورت کے باعث اردو زبان میں زبان پر قابل قدر تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز ہوا۔

یوں تو یورپین اقوام کا ہندوستان سے زمانہ قدیم سے تعلق رہا ہے یعنی اسوقت سے جب کہ ۳۲۷ قبل مسیح سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا نیتجتاً کچھ عرصہ تک ہندوستان کے شمال مغربی حصے پر یونانی اثر بھی رہا اسلام کے عروج کے بعد اہل یورپ کو ہندوستان کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی یورپ سے ہند کا از سر نو رابطہ پندرھویں صدی عیسوی اور دسویں صدی ہجری میں قائم ہوا

پندرھویں صدی عیسوی اور دسویں صدی ہجری میں قایم ہوا ۱۴۹۸ء مطابق ۹۰۳ھ میں پرتگال کے بیڑہ کا سپہ سالار واسکوڈی گاما ہندوستان کے مغربی ساحل کالی کٹ پہونچا۔ اس وقت سے پرتگالیوں نے ہندوستان میں اپنے پیر جمانے شروع کیے سنہ ۱۵۰۲ء میں واسکوڈی گاما کو کالی کٹ فتح کرنے والے بیڑہ کا سردار بنا کر بھیجا گیا۔ اس لئے پہلے کیبرآل ہندوستان کو فتح کرنے کے ارادے سے چلا تھا۔ لیکن وہ بھٹک کر ڈیراکروڑ پہونچ گیا۔ سنہ ۱۵۰۱ء میں الفان سودی ال بوکرک نے ایشیا میں پرتگیز شہنشاہیت کی نیاو ڈالنی چاہی اورسنہ ۱۵۱۰ء میں گوا اور ملابار پر قبضہ کر لیا اس کی یوسف عادل شاہ والی بیجاپور سے بھی لڑائیاں ہوئیں سنہ ۱۵۰۵ء میں ڈم فرانسکو ہندوستان کا پہلا پرتگالی ویسرا بن کر آیا۔ اور کوچین اس کا دارالخلافہ قرار دیا۔ ہندوستان کی اس فتح کے متعلق ایک پرتگیز شاعر کماوس نے بڑی بے مثال مثنوی

لوسیاڈس" لکھی جس کے متعلق ایک نقاد کا خیال ہے کہ صرف یہ ایک نظم پورے پرتگالی ادب کے برابر ہے۔ یہ کافی طویل نظم ہے جس میں ہندوستان کی بڑی موثر تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس نظم کا پس منظر الیودھیا نگر ہے اور اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب رام سیتا کے بن باس پر متاسف تھے۔ شام کے وقت نفیریوں کے بھجن وغیرہ سے بڑی دلکش اور پر اسرار فضا پیدا کی گئی ہے مختصراً پرتگالی ایک نئی تہذیب پرتگیش تہذیب کو جنم دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہاں کے عورتوں سے بیاہ کیے اور اپنے مذہب کی اشاعت کی بھی کوشش کی ہندوستان کی زبانوں سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں نیز گجرات کے بادشاہوں[1] سے پرتگالیوں کے بڑے روابط تھے اور یہ ریاستیں اردو کے ابتدائی نشوونما کے لیے مشہور ہیں۔ چنانچہ پرتگالیوں کے اثر و نفوذ کی اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہوسکتی ہے کہ اردو میں کئی الفاظ پرتگیزی زبان کے داخل ہو گئے ہیں چنانچہ ذیل کے الفاظ جو اردو میں دخیل ہوگئے ہیں پرتگالی نژاد ہیں۔ الماری۔ بالٹی۔ صابن۔ تولیا۔ کارتوس۔ پستول وغیرہ۔

لیکن راقم الحروف کو اردو میں کسی پرتگالی مصنف کے کسی نثری کارنامے کا پتہ نہ چل سکا۔ گو پرتگالیوں میں اردو کے کچھ اچھے شاعر گذرے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پرتگالیوں نے کوئی نثر کی کتاب بھی لکھی ہو یہ قیاس اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ

---

[1] اس زمانے میں گجرات پر بہادر شاہ کے خاندان کی حکومت تھی۔ ملاحظہ ہو ہسٹری آف گجرات" اس کے علاوہ شیخ زین الدین کی تحفۃ المجاہدین" میں بھی پرتگیزیوں کے حالات درج ہیں جس کا ترجمہ حکیم شمس اللہ قادری نے پرتگیزان مالابار کے نام سے کیا۔

اس زمانے میں جتنی یورپی قومیں ہندوستان آئیں انھوں نے اردو زبان سیکھنے کی خاطر اس موضوع پر کتابیں لکھیں سب سے پہلی کتاب جس یورپی مصنف کی دستیاب ہوئی ہے وہ پرتگالیوں کی حریف ولندیزی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا نام جان جوشوا کٹیلر ہے۔

جان جوشوا کٹیلر کٹیلر نے ہندوستانی صرف و نحو پر اردو زبان میں ایک کتاب لکھی تھی کٹیلر پروشیا کے ایک شہر میں پیدا ہوا اور لوتھر کے عقاید کا پیرو تھا۔ ولندیزی حکومت کی جانب سے شاہ عالم (۱۷۰۸ء تا ۱۷۱۲ء) ۱۱۰۸ھ تا ۱۱۱۲ھ اور جہاں دارشاہ کے دربار میں بھیجا گیا تھا (۱۷۱۱ء) ۱۱۱۱ھ میں سورت میں ڈچ کمپنی کا ناظم تجارت رہا۔ پھر دہلی سے لاہور گیا کچھ دن آگرہ میں بھی قیام رہا آگرہ میں کمپنی کا ایک کارخانہ تھا جس کا تعلق سورت سے تھا ولندیزیوں کا وفد ۱۷۱۱ء میں آگرہ پہنچا کٹیلر سورت میں ۱۷۱۶ء تک رہا اس کے بعد وہ ایران میں سفیر ہو کر گیا جس وقت اصفہان سے واپس آرہا تھا ایرانی گورنر نے اس سے عرب حملہ آوروں کے مقابلے میں لڑنے کی خواہش کی اس نے انکار کر دیا اس پر ایرانی حاکم نے اسے قید کر لیا قید ہی میں اس کا انتقال ہو گیا[۱]

اس نے ہندوستانی زبان کی صرف و نحو اور ایک لغت بھی لکھی تھی جو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کی کٹیلر کی صرف و نحو میں ہندوستانی زبان کی تصریف اور گردان ہی نہیں بلکہ اس میں احکام انجیل اور عیسائیوں کے عقاید اور حضرت عیسیٰ کی دعا کا ترجمہ بھی شامل تھا۔

کیلر کی گرامر سے حضرت عیسیٰ کی دعا کے ترجمہ کا وہ اقتباس جو گریرسن نے

---

[۱] لنگوئیسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم صفحہ ۸ دیباچہ قواعد اردو مصنفہ عبدالحق

دیا یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے پاک ہووے تیرے ناوں آوے
ہم کون ملوک تیرا ہووے راج تیرا جون آسمان تو جیمیں میں روٹی
ہماری نہ تھی ہم کو اس لئے اور معاف کر تقصیرا پنی ہم کون جوں
معاف کرتے پرے قرض داروں کون نہ ڈال ہمکو اس وسوے میں
بلکہ ہم کون گھر کر اس برائی سے تیری ہی بسبھی سواری عالمگیری حمایت
میں آمین"

چیمبرلین کٹیلر کے بعد گریرسن جان چیمبرلین کا بھی ذکر کرتا ہے جس نے حضرت عیسٰی کی دعاؤں کا ترجمہ اردو میں کیا تھا یہ ترجمہ گریرسن کے بیان کے مطابق ۱۷۱۵ء میں ایمسٹرڈم میں شائع ہوا تھا اس کا مقدمہ ڈیوڈ ولکسن نے لکھا تھا ڈیوڈ ولکس نے خود بھی چند حصّوں کا ترجمہ کیا تھا۔ چیمبرلین کی کتاب کا پورا نام جو لاطینی میں ہے گریرسن نے نقل کیا ہے۔ افسوس ہے کہ گریرسن نے اس ترجمے کے کچھ اقتباسات اپنی کتاب میں نہیں دیے

ڈیوڈ ل ل دوسرا مستشرق ہے جس کی تصنیف کا ذکر گریرسن نے کیا ہے۔ ل کے مضامین اور تحریروں کے مجموعہ کا نام اطالوی میں بہت لمبا چوڑا ہے۔ گریرسن نے اس کا مختصر نام "ڈمیوٹیشن سیلکٹائی" لکھا ہے۔ ہمارے موضوع کے لحاظ سے اس کا آخری حصہ "مس سے لینا اور ٹیٹا لیا" ہے جس نے ل نے کیٹلو کی قواعد ولغت کو شائع کیا ہے اس میں ایک قصہ مشرق کی سیاحت کے بارے میں بھی ہے[۱]
اس کتاب میں اس نے آگے چل کر ہندوستانی زبان پر بحث کی ہے۔ چند صفحات میں میں لاطینی ہندوستانی اور فارسی الفاظ لکھے ہیں اور ان کا مقابلہ بھی کیا ہے۔

---

[۱] لنگوئیٹک سروے آف انڈیا جلد نہم صفحہ ۸ و قواعد اردو صفحہ ۷

شلز مشہور ثنوی تھا اس نے اردو کی صرف و نحو پر ایک کتاب بھی لکھی ہے اس کتاب کا بھی لاطینی نام بہت طویل ہے جسے گریرسن نے پورا نقل کیا ہے[1]۔ اس قواعد کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی اپنے دیباچہ قواعد اردو میں کیا ہے یہ قواعد لاطینی میں لکھی گئی تھی گریرسن کا بیان ہے کہ شلز نے اپنی کتاب کے دیباچے میں کیٹلر کی قواعد کا بھی ذکر کیا ہے اس میں اردو کے لفظ فارسی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں اور ان کا لاطینی تلفظ بھی دیا ہے۔ ساتھ ہی ناگری حروف بھی دے دیے ہیں۔

شلز کی قواعد کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے لاطینی تلفظ میں اردو کے "کوزی" ( ) اور سہکار ( ) حروف کے بجائے سادہ حروف دیتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کے حروف کو نظر انداز کر جاتا ہے۔

ڈاکٹر گریرسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ شخصی ضمیروں کی واحد و جمع دونوں صورتوں سے واقف تھا لیکن فعل متعدی کے لیے "نے" کے استعمال سے وہ بے خبر تھا۔ مولوی عبدالحق اپنے دیباچہ قواعد اردو میں لکھتے ہیں۔

> یہ اس پر موقوف نہیں بلکہ اکثر قدیم کتب قواعد میں "نے" نظر انداز کر دیا گیا ہے[2]۔

اس کی توجیہہ مولوی عبدالحق یوں کرتے ہیں کہ

> "پرانی اردو میں نے کا استعمال با التزام نہیں ہوتا تھا"

گریرسن نے فرٹنر کے بیان میں شلز کی مترجمہ حضرت عیسیٰ کی دعا کے دو اردو جملے بھی نقل کیے ہیں جو درج کیے جاتے ہیں۔

---

[1] لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم صفحہ ۸ و دیباچہ قواعد اردو

[2] قواعد اردو صفحہ ۱۱

آسمان پور تھا سو ہمارا باپ تھا راناوں پاک کرنا ہونے دیو
تمہاری پادشاہی آنے دیو۔

جوہان فریڈرش فرٹنر فرٹنر کی کتاب میں جو سنہ ۱۷۴۸ء میں لیزگ (لیزش) میں چھپی سو سے زیادہ مختلف زبانوں کے حروف تہجی درج ہیں اس کتاب کا دیباچہ شلز نے لکھا تھا اس کتاب میں ہندوستانی حروف تہجی بھی لکھے گئے ہیں۔ حامد حسن قادری نے فرٹنر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے اردو کے حروف تہجی کا دیگر ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا[۱] پتہ نہیں حامد حسن صاحب قادری کا ماخذ کیا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حامد حسن صاحب قادری نے مولوی عبدالحق کے مضمون مطبوعہ رسالہ اردو سے مواد اخذ کیا ہے اور مولوی عبدالحق نے ابتدائی دور کے یورپی مصنفین کے بارے میں اپنا سارا مواد گریرسن سے اخذ کیا۔

جہاں تک گریرسن کا تعلق ہے اس نے اس طرح کی کوئی بات نہیں لکھی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اور جیسے حامد حسن صاحب قادری نے نقل کیا ہے گریرسن یہ ضرور لکھتا ہے کہ فرٹنر نے اپنی قواعد کے پہلے حصے میں کوئی سو سے زیادہ زبانوں کے حروف تہجی کی جدول دی ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے استعمال کا طریقہ بھی درج ہے۔ لیکن وہ اس کا ذکر نہیں کرتے کہ فرٹنر نے اردو کے حروف تہجی کا مقابلہ دنیا کی دیگر زبانوں کے حروف تہجی سے کیا تھا۔ ممکن ہے حامد حسن صاحب قادری کا اشارہ ان ہی جدولوں کی طرف ہو فرٹنر نے شلز کے حضرت عیسیٰ کی دُعا کے ترجمہ کو بھی نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ چار لفظوں آسمان۔ باپ۔ روٹی کے لیے مختلف زبانوں میں جو لفظ مستعمل ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے وہ چار لفظ ہندوستانی

---

[۱] داستان تاریخ اردو صفحہ ۷۳

میں اس طرح لکھے ہیں۔ آسمان۔ باپ۔ جینا۔ روٹی (روٹی) وغیرہ

کیسیانو بیلی گاٹی کیسیانو بیلی گاٹی ایک اطالوی مشینری تھا اس نے ہندوستانی زبانوں کے متعلق جو اس وقت رائج تھیں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام الفابیٹم برہمانیکم ہے اس کا دیباچہ جوہا نیز کرسٹو فورس امیادوزی نے لکھا۔ امیادوزی نے دیباچہ میں تفصیل سے ہندوستان کی مروجہ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ نیز ایک لغت "لیکسی کون لنگوائی انڈوسٹانیکا" کی بھی نشان دہی کی ہے جس کا مخطوطہ روم کی پروپیگنڈا لائبریری میں موجود تھا ساتھ ہی امیادوزی نے ایک مناظرہ سے مخطوطے کا بھی حل لکھا ہے۔ جو غالباً ہندوستانی میں تھا اور ایک ہندوستانی اور ایک عیسائی کے مابین مذہب کی صداقتوں کے بارے میں ہوا تھا۔ یہ مناظرہ چمپارن ضلع کے ایک راجہ جس کا نام راجہ آف بٹیا بتایا گیا ہے کے نام معنون کیا گیا تھا۔ یہ مناظرہ جوزف گارگ نان تیئس اور بیلی گاٹی کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔

بیلی گٹی نے دو رسم الخطوں کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سے ایک ناگری اور دوسرا عوامی بتایا گیا ہے اور جن میں بہا کابوی یا گنوار و زبان بولی جاتی تھی۔

فرگوسن ڈاکٹر عبدالحق نے ۱۷۷۳ء میں لکھی ہوئی ایک ہندوستانی لغت کا بھی ذکر کیا ہے جس کا مصنف فرگوسن تھا۔ افسوس کہ اس کے مزید حالات کہیں نہیں ملے

ایوارس ابل ابیل کی ایک کتاب ۱۸۰۴ء میں کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں چھپی اس کتاب میں ہندوستان کی گیارہ زبانوں سے ۵۴ لفظ لیکر ان کے مترادف الفاظ بنائے گئے ہیں ان الفاظ میں سے چند یہ ہیں۔

جسم۔ آسمان۔ سورج۔ مکان۔ پانی۔ سمندر[1]

---

[1] لنگوئیسٹک سروے آف انڈیا صفحہ ۹

ہندوستانی حروف تہجی

۱۷۹۱ء میں "ہندوستانی ابجد" کے نام سے روما میں ایک کتاب چھپی تھی۔ مصنف کا نام درج نہیں۔ اس کا دیباچہ پالی نس بارتھولومیٹو نے لکھا ہے اس کتاب میں ہندوستانی ملاباری تلنگی اور دیوناگری زبانوں کے حروف تہجی دیے گئے ہیں[1]۔

لے بے ڈف

ڈف نے بھی ہندوستانی زبان کی صرف ونحو پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس شخص کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ جو اس نے خود اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۸۵ء میں مدراس گیا تھا۔ وہاں اس کی خدمت بینڈ نوازی تھی دو سال مدراس میں رہ کر کلکتہ چلا گیا اور کلکتہ میں ایک پنڈت سے بنگالی اور ہندوستانی سیکھیں۔ اس نے انگریزی کے دو ڈراموں کا بنگالی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ایڈلنگ کے قول کے مطابق وہ شہنشاہ دہلی کے تھیٹر کا منتظم بنا دیا گیا تھا۔ تقریباً ۲۰ برس مشرق میں رہ کر وہ انگلستان واپس ہوا اور لندن ہی میں ہندوستانی زبان زبان کی صرف ونحو پر ایک کتاب لکھی۔ جہاں سے وہ روس کے محکمہ سفارت میں ملازم ہو کر روس چلا گیا۔ ڈاکٹر عبدالحق اس کی قواعد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے ہندوستانی قواعد کے بیان کرنے میں بیشک صریح غلطیاں کی ہیں۔

ہیڈلے

ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں اردو کی ایک گرامر لکھی۔

جان گرسٹوف ایڈی لنگ

سب سے آخر میں جان کرسٹوف ایڈی لنگ آتا ہے جو اپنے زمانے کا ماہر لسانیات سمجھا جاتا ہے ہندوستانی زبان کے بارے میں اس نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس نے اردو کو منگولی ہندوستانی اور "موری" کے نام دیے ہیں اس کے علاوہ ہندوستان کی

---

[1] لنگوئیٹک سروے آف انڈیا صفحہ ۹

دوسری بولیوں کی بھی تفصیلات بتائی ہیں[1]۔

ان یورپی مصنفین کے علاوہ خود ہندوستانیوں نے بھی اردو کی صرف و نحو پر تصنیف و تالیف کے چند لغتوں کا حال پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے ان کے علاوہ راقم الحروف کو اس موضوع پر "رسالہ قواعد ہندی" اور "ریختہ ہندی کی صرف و نحو" کے بھی مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں۔

رسالہ قواعد ہندی کا مخطوطہ مدراس یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کے مصنف کا پتہ نہ چل سکا[2]۔

ریختہ ہندی کی صرف و نحو کتب خانہ جامعات عثمانیہ میں موجود ہے۔ سنہ تصنیف اور مصنف کا نام درج نہیں۔ اردو کا نام مصنف ہر جگہ "ہندی" لکھا ہے۔ سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے۔

"یہ رسالہ زبان ریختہ ہندی کی صرف و نحو میں مشتمل ہے دو مقالے پر مقالہ اول مفردات میں"

اس میں اسم فعل صفت وغیرہ کی اقسام اور مصادر کی پہچان وغیرہ کا بیان ہے۔

انشاء لسانیات یا صرف نحو سے ہٹ کر ایک اور موضوع جو گیارہویں صدی کے مصنفین کو مرغوب رہا ہے وہ انشا یعنی خطوط نویسی ہے۔ بارہویں صدی کے اختتام کے قریب انشا کی بھی کافی تصانیف ملتی ہیں۔ اس زمانے میں انشا پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کا مقصد محض خطوط نویسی کے طریقے سکھانا نہیں بلکہ یہ انشا پردازی اور زبان سیکھنے اور سکھانے کا بھی اہم ذریعہ تھا چنانچہ

---

[1] لنگوئسٹک سروے آف انڈیا جلد نہم صفحہ ۱۱

[2] "مینوسکرپٹس ان مدراس یونیورسٹی" مرتبہ چندر شیکھرن جلد ۳

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

بات چیت کو کاغذوں میں محفوظ رکھنے کا دستور بہت پرانا ہے بادشاہوں اور وزیروں کے حکم احکام کے چھوٹے چھوٹے فقرے جو بلاغت کی جان ہوتے تھے توقیعات کہلاتے تھے اور یاد رکھے جاتے تھے انشاء یعنی خطوط نویسی کی نگہداشت کو کثرت اور وسعت مسلمانوں کے دور میں ہوئی[1]

انشاء کی ایجاد کے بارے میں گارساں ڈی تاسی لکھتا ہے

"میں معقول وجوہ کے ساتھ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ تذکرہ مشرق کے مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے اس قسم کی ایک دوسری چیز ہے جس کا نام انشاء یہ خطوط کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جو کسی ایک ہی شخص کی تصنیف ہوتے ہیں یہ گویا فصاحت بلاغت سکھانے کی کتابیں ہوتی ہیں"

انشاء کی کتابوں میں فورٹ ولیم سے پہلے کی لکھی ہوئی ذیل کی کتابیں ملتی ہیں[2]۔

(۱) دستور النثر (۲) فن انشا (۳) دستور الہدایت

دستور النثر ارکاٹ کے ایک باشندے محمد لطیف نے اپنے لڑکے کے واسطے کئی رقعے تو عنوانات کے تحت جمع کر کے ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام "مفید الصبیان" تھا۔ اس کا ترجمہ محمد خاں نے "دستور النثر" کے نام سے دکھنی میں کیا تھا[3] تاکہ اردو انشا کے مبتدی اس سے استفادہ کر سکیں مصنف نے تمہید میں خود اس کا ذکر کیا ہے کتاب نو اقسام پر مشتمل ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے

---

[1] دیباچہ مکاتیب محمدی

[2] خطبات گارساں ڈی تاسی صفحہ ۳۷۵

[3] ان کے حالات فقہ کیدانی کے ضمن میں گذر چکے ہیں ملاحظہ ہو مقالہ ہذا

اول قسم ۔ خوشی اور مبارکبادی کے خطوط لکھنے میں ۔
دوم قسم ۔ غم اور ماتم کے نگہداشت میں ۔
تیسری قسم ۔ میوے اور مٹھائی کی تحریر میں ۔
چوتھی قسم ۔ سب کاموں کی نوشت میں ۔
پانچویں قسم ۔ لفظوں کے غلطی اور صحیح کے جاننے میں ۔
چھٹی قسم ۔ شوقی خط کے ترقیم میں ۔
ساتویں قسم ۔ بیچ آداب اور القاب اور لفافوں کے ۔
آٹھویں قسم خط اور قبالہ اور تمسک وغیرہ کے بیچ میں ۔
نویں قسم ۔ عربی فارسی ہندی انگریزی اردو مہینوں کے نام وغیرہ کے آغاز میں

"دستور النثر" کو مرتب فہرست پروفیسر سروری نے تیرھویں صدی ہجری کے آغاز کی تصنیف قرار دیا ہے ۔ لکھتے ہیں ۔

"کتاب تیرہویں صدی ہجری میں خطوط عرائض وغیرہ لکھنے کے جو طریقے دکن میں رائج تھے ان کا اچھا خاکہ ہے[۱]

اس کا سنہ کتابت ۱۲۶۷ھ ہے ۔ اس کا کچھ اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد بے حد و ثنائے بے عدد اس کو شایان ہے جس کی قدرت کے وصف میں بڑے بڑے داناؤں کی عقل حیران ہے"

دستور الہدایت کتاب میں مصنف کا نام غلام محمد غوث باشندہ مدراس درج ہے محمد غوث خاں شرف الملک[۲] کا نام تھا جو مدراس کے مشہور مصنف اور انشاپرداز گذرے ہیں ممکن ہے کہ یہ شرف الملک غلام محمد غوث خاں ہی کی تصنیف ہو

---

[۱] مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ فن انشا نمبر (۱۵۹۰)
[۲] فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ (۱۸۴)

دستورالہدایت کا جو نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں بدست ہوا ہے وہ ۱۲۷۵ھ کا مکتوبہ ہے اس کی تصنیف اس سے پہلے کی ہونی چاہیئے غالباً یہ تیرھویں صدی کے اوائل کی تصنیف ہے محمد غوث خاں شرف الملک کا زمانہ بھی یہی ہے یعنی ۱۱۶۶ھ تا ۱۲۳۵ھ)

کتاب کی وجہ تصنیف کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نسبت خان نامی جمعدار کی تعلیم کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کی عبارت معاصر تحریروں کے برخلاف بڑی حد تک مسجع اور مقفیٰ ہے جس کا کچھ اندازہ دیباچہ کی حسب ذیل عبارت سے ہوسکتا ہے

"حمد کثیر اس منشی بے نظیر کو بجا ہے جس کی قدرت کے حکم سے کائنات کے تختے پہ ہزار ہا نقش بدیع لکھے گئے اور صلواۃ بے نہایات اس دبیر خوش تحریر کی زیبا ہے جس کی ہدایت کے رقعے سعادت مندوں کی خاطر صفحے پہ چھاپے گئے۔

کتاب اصل میں جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے نسبت خاں جمعدار کی خاطر تصنیف ہوئی لیکن غالباً کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ لیکن اس کا ضمنی مقدمہ یہ بھی تھا کہ مبتدی بھی اس سے استفادہ کرسکیں چنانچہ مصنف لکھتا ہے۔

"اما بعد قاسم نومی نے ابوالفضل کے انشا، وغیرہ اگلی کتابوں کو حال محاورے سے بے محاورہ دیکھ کر اس زمانے کے مبتدیوں کو خطوط نویسی کا طریقہ سکھلانے کے واسطے یہ مختصر تجویز کیا اور اس کا نام دستورالہدایت رکھا چہار فصل پہ مرتب اور کئی قاعدوں سے مرکب ہے"۔

کتاب کے چار ابواب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے

پہلی فصل خط کے دس فقروں کے بیان میں ہے اس میں القاب سلام ونیاز استخبار اور سرنامہ پر کی عبارت توضیح وغیرہ کی تشریح کیگئی ہے۔

استخبار کی تعریف میں مصنف لکھتا ہے

پہلا فقرہ مکتوب منہ کی خیریت کا اور دوسرا فقرہ مکتوب الیہ کی خیریت کی طلب کا۔

دوسری فصل۔ کیفیت کے بیان میں مقدمہ میں درج ہے کہ دنیا کے سب فعل دو قسم پر ہیں" اخبار یا انشا۔" اخبار وہ ہے کہ ماضی حال اور استقبال کے احوال کا بیان کریں اور انشا وہ ہے کہ ایک کام کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیویں

تیسری فصل۔ مختلف قاعدوں کے بیان میں ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ رقعات اور تعزیت نامہ وغیرہ میں استخبار کا لکھنا مروج نہیں رقعہ شقہ وہ ہے کہ مرجع اور مختصر ہووے۔

چوتھی فصل۔ سلاست اور رنگینی کے بیان میں ہے

عبارت کے اقسام کے بارے میں مصنف لکھتا ہے۔

انشا پردازی کی عبارت دو قسم پر ہے سلیس اور رنگیں سلیس وہ ہے کہ اس میں صفت تشبیہ استعارہ جملہ معترضہ وغیرہ مطلب سے زاید چیزیں نہ لکھے جاویں اور رنگین وہ ہے کہ اس میں یہ چیز ہودیں صفات، مشبہ بہہ۔ مستعارہ۔ جملہ معترضہ۔ بفقر مکبر۔ مرکب زایدہ"

مذکورہ بالا اقتباسات سے اس گمان کی تصدیق ہوتی ہے کہ "دستور الہدایت" فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے کیونکہ اس تحریر پر فارسی انشا کا گہرا اثر ہے۔

فن انشا یہ کتاب نظام الدین کی تصنیف ہے جس کا ذکر ڈی۔ ٹاسی نے بھی کیا ہے۔ مرتب مقالہ کو اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں دستیاب ہوا[2]

---

[1] خطبات گارساں ڈی۔ ٹاسی صفحہ ۱۶۳ [2] فن انشا نمبر ۹۹

ڈی۔ٹا نے "فنِ انشا" کے علاوہ ان کی ایک اور تصنیف "حکایاتِ لقمان" کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ فورٹ ولیم کے بعد کے زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس نے نہ تو فنِ انشا کا کچھ اقتباس دیا اور نہ اس کا سنہ تصنیف بتایا ہے تاہم اس کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مصنف نظام الدین گردشِ زمانہ سے پونا آگئے تھے۔ کتاب کی تمہید میں نظام الدین نے یہ بتایا ہے کہ وہ "سرداروں" کو انشا سکھایا کرتے تھے غالباً سرداروں سے ان کی مراد انگریز عہدہ داروں سے ہے اس سے یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ "فنِ انشا" انھوں نے فورٹ ولیم سے پہلے غالباً اوائل تیرہویں صدی ہجری میں لکھی ہوگی۔

مصنف نے دیباچہ میں اپنے کچھ حالات بھی لکھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالباً شمالی ہند کے باشندے تھے اور تلاشِ معاش میں پونا آئے تھے انشا سے انھیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ اکثر خواہش مندان سے خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ انھیں میں سے ایک ہارڈی صاحب بھی تھے جو بہار کے رہنے والے تھے انھوں نے مصنف کی قدر دانی کی اور غالباً اس سے انشا، کی تعلیم حاصل کرنے لگے وہ اکثر اوقات مصنف سے خطوط لکھنے کی فرمائش بھی کرتے اور وہ ہر روز دو چار خطوط تحریر کر دیتا تھا ہارڈی صاحب کے علاوہ اور لوگ بھی اس سے خطوط لکھواتے اس سے اس کو خیال پیدا ہوا کہ میں لوگوں کی خاطر ہر روز خطوط لکھا کرتا ہوں اور وہ انھیں پڑھ کر پھینک دیتے یا ضائع کر دیتے ہیں کیوں نہ ان خطوط کو اکٹھا کر دوں کہ سیکھنے والوں کے لیے کام آسکے اس خیال سے اس نے فنِ انشا مرتب کی نظام الدین نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے "انشائے ہرکرن" کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے۔

اس کے سوا انشاء ہرکرن کہ فارسی میں ہے۔ اس کا ترجمہ بھی سلیس ہندی میں کیا لفظاً ترجمہ نہیں کیا۔ مگر اس کے خلاصے اور مطلب سے کام رکھا کہ مشکل

نہ ہو۔ اور بعض خطعاً اس میں چھوڑ بھی دے ہیں کہ میں نے اسے مشکل نہیں کیا۔ صاحب ہندی ترتیب دیا کہ دقت نہ ہوا ور سچ ہے کہ جو آسانی سے کیا جاوئے اس واسطے دقت کیوں اٹھاوے۔ غرض اس کتاب کے تیار ہونے کا سبب یہ تھا کہ جارج مالکم صاحب بہادر اہل قلم قدر داں شیریں زبان صاحب خلق و مروت کہ جن کے اوصاف بیان سے باہر ہیں اس بیکس پر نہایت مہربانی فرماتے ہیں ہمیشہ ہندی زبان کی تحصیل میں مشغول رہے۔ ان کی خواہش اور فرمائش سے یہ کتاب تمام ہوئی۔ حاصل کلام اس طور سے اس کتاب کو درست کیا کہ ہر ایک اسے پڑھ کر فائدہ پاوئے۔ اس واسطے یہ حقیر ہر ایک قابل اور اہل دانش سے عرض کرتا ہے کہ اگر اس لکھنے میں کہیں سہو نظر آوے تو اصلاح بخشیں۔

"فن انشا" میں مصنف نے مختلف قسم کے خطوط اور عرضیوں وغیرہ کے نمونے اکٹھا کر دئے ہیں۔ ایک عرضی کا اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے۔

عرضی

غریب نواز سلامت۔ ایک رستہ جو قدیم سے ملا زین الدین کی حویلی کی طرف سے ہو کر نکلتا ہے اس راستہ سے آدمی بیل بکریاں آیا جایا کرتے ہیں اور اس کا مذکورہ بلکہ سرکاری دفتر میں لکھا ہے۔ اب وہ ملا شوارت سے کسی کو اس راستہ پر چلنے نہیں دیتا بلکہ لکڑی ہاتھ میں لیکر مارنے دوڑتا ہے۔ اس واسطے عرض کی اسے بلا کر انصاف کیجئے۔ واجب تھا عرض کی"۔

نمونے کے خطوط میں سے ایک خط بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

بیگم صاحب سلامت۔ تمہارا خط بیچا لعل وکمیل کے ہاتھ سے گورنر صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ صاحب بہادر اس کے مطالعہ سے نہایت خوش

ہوئے اور تمہارا احوال وکیسل کی زبانی معلوم ہوا۔ انشاءاللہ دس پندرہ روز کے بعد جیسا حضور سے حکم ہو گا ویسا اس کا جواب لکھا جائے گا۔ امید ہے کہ ہمیشہ اسی طور پر اپنی خیریت سے اطلاع دیتے رہیں گی۔"

تاریخ گارسان ڈی۔ تاسی کا خیال ہے کہ

"جو کچھ بھی ہو اہل مشرق کی نظروں میں تاریخ کی وہ وقعت نہیں جو ہم میں ہے"[1]

اس طرح وہ تاریخ نویسی کی ابتدا کا سہرا یورپی مصنفین کے سر باندھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تاریخ اہل مشرق اور خاص طور پر عربوں کا مخصوص فن رہا ہے چنانچہ ابن خلدون کا نام اس سلسلے میں فخر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "فورٹ ولیم کالج" میں تاریخ کی طرف بھی خاص طور پر توجہ دی گئی۔ مشہور تواریخ لکھی بھی گئیں اور ترجمے بھی ہوئے۔ لیکن فورٹ ولیم سے بیشتر بھی اردو میں تاریخیں ملتی ہیں۔ اس خصوص میں راقم الحروف کو تین تاریخی تصانیف کا پتہ چلا ہے جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱- ترجمہ تاریخ فیروزشاہی۔

۲- تاریخ ہندوستان۔

۳- بہادر نامہ یا تاریخ سری رنگ پٹم

ترجمہ تاریخ فیروزشاہی تاریخ فیروزشاہی کے نام سے فارسی میں دو تاریخیں لکھی گئیں جن کے نام ایک ہی ہیں۔ ان میں سے ایک شمس سراج عفیف کی ہے دوسری ضیاء الدین برنی کی۔ سراج عفیف کی تاریخ میں فیروزشاہ کے خاندان اور

---

[1] خطبات گارسان ڈی تاسی صفحہ ۱۶۷

[2] ملاحظہ ہو فن تاریخ نمبر (۱۷)

خانگی حالات پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ لیکن ضیاء الدین کی تاریخ میں اس عہد کے حالات اور دکن کا بھی تذکرہ کافی ملتا ہے۔ وارث علی بن شیخ بہادر ساکن دار الخلافہ شاہ جہاں آباد نے سرہنری کپتان لوئی کے کہنے سے اس کا ترجمہ اردو میں کیا تھا سنہ تصنیف کہیں درج نہیں کتاب کا دیباچہ فارسی میں لکھا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے[1] مترجم کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سراج عفیف اور ضیاء الدین برنی دونوں کی تاریخوں سے استفادہ کیا ہے لیکن مرتب کا قیاس یہ ہے کہ اس نے شمس سراج عفیف کی "تاریخ فیروز شاہی" کو پیش نظر رکھا۔ چنانچہ ذیل کی اقتباس سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

"مصنف اسی تواریخ کا مثل شمس سراج عفیف اور ضیاء الدین برنی کے ہم عصر سلطان فیروز تھے۔ اور نظام الدین بخشی گجراتی صاحب طبقات اکبری معروف تاریخ نظامی اور محمد قاسم المعروف بہ فرشتہ کہ غیر عصر فیروز تھے انھوں نے یو لکھا ہے کہ جس وقت سلطان علاؤ الدین خلجی بادشاہ دہلی کا تقاحب اتفاق زمانہ تغلق اور رجب اور ابوبکر۔ یہ تینوں بھائی ٹھٹھے سے دہلی میں آئے اس صورت میں سلطان علاؤ الدین خلجی نے از راہِ قدر دانی مملکت نیجاب اور لقب غازی الملک کا محمد تغلق کو پیشگاہ خسروانی سے عنایت کیا"

اس کتاب کا تذکرہ نثر کی کسی تاریخ میں نہیں ملتا زبان کے انداز سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ ترجمہ فورٹ ولیم کالج سے پہلے کا ہے۔ چنانچہ اس میں ضمیر اشارہ "یہ" کی جگہ "یو" لکھا ہے۔ نیز جملوں کی ساخت پر بھی ابتدائی دور کی فارسی عربی ساخت کا اثر زیادہ ہے۔ ایک مزید ثبوت اس ترجمے کے قدیم ہونے کا یہ ہے کہ اصلی ترجمہ توارد و

---

[1] ملاحظہ ہو فن تاریخ نمبر (۱۷)

میں ہے لیکن دیباچہ میں فورٹ ولیم کالج کے قبل کی تصانیف کی طرح دیباچہ
عنوانات وغیرہ فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے عنوانات کی تفصیل حسب ذیل ہے
فیروز کی تخت نشینی اس کے مصاحب اور غلام ایاز کا حال۔
ایاز کی سرفرازی سلطان کی ایک بزرگ شیخ قطب الدین منور
اور دیگر مشائخ اور بزرگوں سے ملاقات۔ خسرو ملک کی سلطان
فیروز کو قتل کرنے کی کوشش۔ سلطان کی چتر و آفتاب کی اختراع
فیروز آباد کے محل کی تعمیر۔ ہانسی کا سفر۔ شمس الدین کوتوال کا قتل
فتوحات ٹھٹہ کی تسخیر۔ ملتان کا سفر۔ سلطان مصر کا فرمان و خلعت
فیروز کے نام۔ رعایا کی دیکھ بھال۔ سیر شکار۔ عادات۔ خصلت۔
سلطان تغلق کے اپنے چھوٹے بھائی رجب کی شادی کے متعلق صلاح و مشورہ
کی تفصیل ترجمے میں اس طرح پیش کی گئی ہے۔

سلطان تغلق نے اپنے مشیروں سے فرمایا کہ نسبت چھوٹے بھائی
رجب کی بیٹی راجہ دیپال پور سے کرنی چاہی اس وقت اہالیان
دولت نے عرض کیا کہ قبلہ عالم بیٹی مہا راجہ رانہ مل کی بہت
خوبصورت ہے اوسی سے نسبت کیجئے۔ چنانچہ حسب معروضہ مشیروں
کے سلطان تغلق نے یہ پیغام راجہ رانہ مل کو بھیجا رانہ مل نے بہ سبب
خلاف دینی کے انکار کیا سلطان تغلق نے فوراً اس جواب کے حکم فوج
کو دیا کہ مستعد جنگ ہوں اور مظفر خاں اعتقاد الملک سعد الملک وغیرہ
کو بلوا کر مشورہ کیا آخر یہ صلاح ٹھیری کہ جو عدول حکمی راجہ موصوف نے
کی بدیں نظر محصول ایک برس کا بطور جرمانہ کے لیا جائے۔ جب یہ حکم
راجہ نے سنا بہت گھبرایا آخر ناچار بموجب ہدایت اپنے مصاحبوں کے
چودھری اور نمبردار اور تحصیلدار کو بلوا کر حکم دیا کہ ساکنان وغیرہ سے

زر نقد ایک برس کا پیشگی تحصیل کریں جب یہ حکم ظہور میں آیا ساکنان قصبہ نہایت تنگ ہو گر بھاگنے لگے اور عرصہ تین روز کا گورا کہ اہالیان راجہ اس اور ہڑبن میں رہی۔ مگر کوئی کار بن نہ پڑا کہ سلطان نے یہ باعث گذر جانے میعاد مقررہ کے فوج اپنی واسطی لینی زر مستحقہ کے روانہ کی پس بہ سبب تکلیف اور ایذا رسانی طرح طرح کے سواری قبول کرنا پیغام شادی کے اور کوئی تدبیر بن نہ آئی ناچار جبراً و قہراً راجہ رانا مل نے اپنی بیٹی کا نکاح رجب سے کر دیا اور جو پہلے نام اس کا اہلیہ تھا اب لقب اس کا بی بی کدبانو ہوا بعد چند عرصہ کے خدا کی مہربانی سے ساتویں مہینے جب جمعرات کے دن ۷۰۹ھ میں بطن کدبانو سے ملک فیروز پیدا ہوا۔"

تاریخ ہندوستان یہ ایک ضخیم تاریخ ہے جو (۴۶۰) صفحات پر مشتمل ہے جس کا حال ڈاکٹر زور نے اپنے تذکرہ اردو مخطوطات میں لکھا ہے وہ پروفیسر خان شیروانی صدر شعبہ تاریخ کی سند کی بنا پر یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فارسی کتاب "ملخص التواریخ" سے ماخوذ ہے اور فرزند علی حسینی ساکن مونگھیر کی تصنیف ہے جو ۱۱۵۳ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس تاریخ میں ۱۱۷۰ھ تک کے واقعات مندرج ہیں اس لیے ڈاکٹر زور نے اس کی تصنیف کا زمانہ ۱۱۹۶ھ سے قبل متعین کیا ہے[1]

تاریخ کا آغاز امیر تیمور کے زمانے سے ہوتا ہے اور اورنگ زیب کے بعد کے دور انتشار پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ آخری واقعہ جو اردو ترجمہ میں درج ہے وہ ٹیپو سلطان والئی میسور کی انگریزوں سے جنگ ہے جو ۱۱۹۴ھ میں ہوئی تھی اس لحاظ سے مذکورہ سنہ محقق ہو جاتا ہے۔

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۲۷۰

اس میں دکن اور بنگال کے چھوٹے چھوٹے خود مختار صوبوں کی بھی تاریخ لکھی ہے چنانچہ دکن میں آصف جاہ اور ان کے فرزند ناصر جنگ کے اقتدار پر پہنچنے کا حال بھی اس تاریخ میں موجود ہے۔ آخری حصہ میں مرہٹوں اور حیدرآباد میسور، لکھنو بنگالہ دھلی کے وہ حالات درج ہیں جو انگریزوں کے اثر و اقتدار کو ہندوستان میں بڑھانے کا باعث ہوئے تھے۔

انگریزوں اور حیدرعلی والی میسور کی لڑائیوں کا حال رمضان ۱۱۹۴ھ تک لکھا ہے۔ چنانچہ ورق ۱۶۸ پر یہ عبارت درج ہے۔

"جرنیل کوٹ تین چار پلٹن لے کر رمضان کے مہینے ۱۱۹۴ھ میں جہاز پر سوار ہو کر مندراج کو روانہ ہوا[1]"

اصلی فارسی تاریخ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے ۱۱۵۳ھ تک کے واقعات پر حاوی ہے لیکن ترجمہ میں جو مزید واقعات دکن بنگال اور میسور کے ملتے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ مترجم نے اس ترجمہ میں اپنی طرف سے اپنے زمانے کے واقعات بھی درج کر دیے ہیں مصنف نے جو واقعات اپنی طرف سے اضافہ کیے ہیں وہ اسی کے زمانے کے واقعات ہیں۔ اس لیے ان حصوں کی حد تک یہ تاریخ نہایت مستند سمجھی جا سکتی ہے۔ مترجم کی زبان سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ شمالی ہند کے کسی شہر کا رہنے والا تھا۔ چنانچہ ترجمہ کی زبان سے اس کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مترجم کے حالات کا کچھ پتہ نہ چل سکا جس کا اعتراف ڈاکٹر زور نے بھی کیا ہے۔ تذکرہ اردو مخطوطات میں اس تاریخ کا جو نام درج ہے وہ اصل نام نہیں نہ مترجم کا دیا ہوا نام ہے بلکہ موضوع کے لحاظ سے مرتب تذکرہ نے یہ نام تجویز کر دیا ہے۔ اس کے مختلف مقامات سے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ

تیمور بادشاہ جس کے خاندان کی سلطنت ہندوستان میں چار سو برس کے قریب رہی جس کا حال یوں بیان کرتے ہیں"۔

"گورنر بہادر نے ۱۱۹۵ھ میں رجب کے مہینے کلکتہ سے کوچ کیا ۱۱۹۵ھ میں مرزا نجف علی خاں امیر الامرا کی فوج لاہور کے قریب تک پہنچی اور بہت سی لڑائیاں ہوکر غالب ہوئی۔

حیدر نائک ہی کی فوج غالب ہوئی غرض کہ وہ مندراجہ کے قلعے سے باہر سارے صوبہ ارکاٹ پر غالب ہوگیا۔

اختتام کی عبارت یہ ہے۔

"نادر شاہ کی طرف کے قزلباش صمصام الدولہ اور امیر الامرا پہ دوڑ کر لوٹ مار کرنے لگے پانچ چھ گھڑی کے عرصے میں"

افسوس کہ ادارہ ادبیات اردو کا مخطوطہ مکمل نہیں معلوم ہوتا کیونکہ تاریخ یکایک بے موقع ختم ہوجاتی ہے۔[1]

"بہادر نامہ" یا تاریخ سہری رنگ ہیم | اس دور کی تاریخوں میں بہادر نامہ ایک اہم تاریخ ہے کیونکہ اس طرح کی واضح تاریخیں خاص جنوبی ہند میں لکھی ہوئی بہت کم دستیاب ہوتی ہیں اس تاریخ کا دوسرا نام "تاریخ سہری رنگ ہیم" بھی ہے۔ لیکن مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اس کا ذکر بہادر نامہ کے نام سے کیا ہے[2]

راقم الحروف کو اس کا جو مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں دستیاب ہوا ہے اس اس کا نام "تاریخ سہری رنگ ہیم" لکھا ہوا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ دونوں کتابیں ایک ہی ہیں ان کے ایک ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے جو اقتباس

---

[1] فن تاریخ نمبر (۱۲۲۰)

[2] ملاحظہ ہو یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۴۰،۴۴

دیا ہے وہ تاریخ سری رنگ پٹم میں موجود ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دونوں ناموں سے موسوم رہی۔

ہاشمی صاحب کے محولہ بالا نسخہ کے علاوہ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ دیوانی ملک ومال میں بھی محفوظ ہے۔ وہ بھی بہادر نامہ کے نام سے موسوم ہے دفتر دیوانی کا مخطوطہ اور کتب خانہ آصفیہ کا مخطوطے دونوں ایک ہی ہیں یعنی آغاز و اختتام میں کوئی فرق نہیں۔ (اس کتاب کے دوسرے مخطوطوں کے آغاز و اختتام میں کوئی فرق نہیں۔

"بہادر نامہ" میں میسور کی تاریخ لکھی گئی ہے جو کرشنا راجہ سے شروع ہوتی ہے لیکن اس کے اختتام میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، نسخوں میں اختلاف ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنی تصنیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں اس کتاب کے دو نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک برٹش میوزیم اور دوسرا انڈیا آفس کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ "انڈیا آفس" کے کتب خانہ کا نسخہ حیدر علی کے انتقال پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن برٹش میوزیم والے نسخہ میں ٹیپو سلطان کے عہد تک کے واقعات شامل ہیں۔ آصفیہ نسخہ بھی ٹیپو سلطان کے انتقال پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کا غالباً سبب یہ ہے کہ انڈیا آفس کے کتب خانہ کا مخطوطہ نا مکمل ہے۔ مکمل کتاب ٹیپو سلطان کے عہد پر بھی حاوی ہے اور سلطان کی وفات پر ختم ہوتی ہے جو ۱۲۱۳ھ کے واقعہ ہے۔

اس لحاظ سے یہ تاریخ ۱۲۱۳ھ میں لکھی گئی تھی۔ مصنف کا نام درج نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "تاریخ سری رنگ پٹم" یا بہادر نامہ کوئی طبع زاد تصنیف نہیں کیونکہ مرتب مقالہ کو اس کا ماخذ فارسی تاریخ کا مخطوطہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ جو بعینہ ان تمام حالات پر مشتمل ہے۔ جو اس اردو تاریخ میں ملتے ہیں۔

اس فارسی تاریخ کو سب سے پہلے پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے ایک مضمون

کے ذریعے روشناس کرایا تھا جو "اے مینوسکرپٹ ہسٹری آف میسور"[1] کے عنوان سے میسور یونیورسٹی کے سہ ماہی جرنل میں چھپ چکا ہے۔ یہ فارسی تاریخ ۲۴ ابواب پر مشتمل ہے لیکن اردو ترجمہ میں (۲۲) ابواب ہیں۔ فارسی میں ابتدائی دو باب زائد ہیں فارسی تاریخ کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا لیکن فارسی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کا باشندہ تھا بلکہ زیادہ ترین قیاس یہ ہے کہ وہ میسور ہی کا رہنے والا تھا۔ اس کی فارسی عبارت بہت سقیم ہے۔ اردو تاریخ میں تمام تر وہی واقعات ہیں اور اسی ترتیب سے لکھے گئے ہیں جو فارسی تاریخ میں ملتے ہیں۔ اسی سے قیاس ہوتا ہے کہ اردو تاریخ فارسی کا ترجمہ ہے۔ چنانچہ دونوں کے آغاز کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کتاب ذکر میں ریاست راجہ سری رنگ پٹن کے اور نواب حیدر علیخاں بہادر جنت مکان اور ٹیپو سلطان شہید بادشاہ غازی ملک کرناٹک نور اللہ مرقدہ کے واسطے اظہار کرنے خاص و عام سلیس عبارت میں تصنیف کیے"۔

فارسی کی اصل تاریخ کے آغاز میں بھی جس کا ترجمہ پروفیسر عبدالقادر سروری نے مذکورہ بالا مضمون میں لکھا ہے یہی عبارت درج ہے[2]۔ اس کا مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے[3]۔

اس کے ابواب کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) بیان کشن راج کا۔

---

[1] ملاحظہ ہو سہ ماہی جرنل میسور یونیورسٹی جلد ۵ حصہ سوم ۱۹۴۷ء
[2] یہ تاریخ محمد ابا سیٹھ کی ملک تھی اور سیٹھ صاحب نے اسے ادارہ ادبیات اردو کو دیا تھا۔
[3] ملاحظہ ہو تذکرہ مخطوطات فارسی جلد سوم صفحہ ۵۵

۲- نواب حیدر علی خاں واسطے معیشت روزگار کے عرب سے ہند کے ملک میں آئے سو یہ ہے۔

۳- جنگ پانیکار نارائن گوڑ سو کرکے ریاست دیوان ہی کو تسخیر کیا۔

۴- بیان لشکر نواب چندا صاحب اور محاصرہ قلعہ ترچنا پلی کا - محاصرہ سری رنگ پٹم کے راجہ کا ترچنا پلی کے قلعے سے

۵- بیان حیدر علی خاں بہادر کے طالع یاوری کیے سو۔ اس میں ان کی سری رنگ پٹن کے تخت کے حصول کا حال لکھا ہے کہ کس طرح راجہ نے انہیں اپنا وزیر بنایا راجہ کے وفات کے بعد کوئی اور دعویدار نہ رہا۔ تو یہ بادشاہ ہوگئے کیونکہ وزیر نا گوشہ نشین ہوگیا اور کراجوری نندراج نے بھی ان کی حکومت تسلیم کرلی۔

۶- بیان شرارت میں گنڈی راو کے اور فساد برپا ہونے درمیان نواب اور نند راج کے

۷- بیان گنڈی راوَ نمک حرامی نواب سے لڑکر اور باغی ہوکر پٹن کی ریاست لینے دغا سے تدبیر کیا سو۔

۸- بیان نواب جنگ کرنے نمک حرام سے تیار ہوا سو۔

۹- جنگ پالیگر سے چھوٹے بالاپور کے اور ارادہ تسخیر کرنے مکان مذکور میں

۱۰- بیان تسخیر کیے سو جب نواب بالاپور۔

(اس کے بعد بدنور کے راجہ کے ایک کمسن رشتہ دار راجہ غیبو کا حال ہے جس نے بدنور کی حالت گوش گزار کی۔ جہاں راجہ کی وفات کے بعد اس کی رانی تخت نشین تھی اور جس کے اپنے غلام سے ناجائز تعلقات تھے اور احکام سلطنت سے بے پرواہ تھی آخر انہوں نے حملہ کیا اسے فتح کیا رانی کو قید کیا اور حیدر نگر نام رکھا۔

۱۱- بہ بیان کوی کوٹ (کالی کٹ) وغیرہ تسخیر کیے سو۔

۱۲- بہ بیان جنگم بہ انگریز بہادر سے جنگ ہوا سو۔

۱۳- بیان جنگ چرکوئی (یہ بیان چرکوئی کے جنگ کا ہے۔
۱۴- یہ بیان بہار کے تین تسخیر کر کے اور بسالت جنگ کپتان تنبیہ کر کے دار زادے گتی لیا ہو۔
۱۵- بیان تسخیر چیتل ذرگ برما سے جنگ کر کے فتح کیا اور نواب حلیم خاں کڑپے والے سے فتح کر کے خان مذکور کو اسیر کیا اور ابراہیم خاں دھونے پر فتح کیا ہو
۱۶- کیفیت حضرت سلطان اور مند دولت باپ کے پٹنا اور لینا نگر اور کوڑیال انگریز بہادر سے اور ریعنی ہونا آیا ز حضرت ٹیپو سلطان سے اور صلح ہونا اس وقت اور پھر لینا ملک کٹرک کا اور وہاں سالیانہ مقرر کرنا اور بازگشت ہونا۔
۱۷- کیفیت قلعہ ادھونی کا حضرت ٹیپو سلطان اور وہاں جنگ کرنا مرہٹے سے اور نظام علی خاں سے۔
۱۸- کیفیت حضرت سلطان در بیان ملک کالی کٹ کے تشریف فرمانا اور قصد کرنا جنگ کا طرف ملک کوچی کے اور شکست کھا کر واپس ہونا اور دوسری دفعہ قصد کرنے اس مکان کے اور انگریز بہادر اس طرف آنے کا۔
۱۹- کیفیت حضرت سلطان جنگ کرنا ستی منگل پہ انگریز بہادر سے اور شہید ہونا برہان الدین اور قلعہ لینا بنگلور کا انگریز بہادر سے۔
۲۰- کیفیت لشکر انگریز کا سری رنگ پٹن کے تئیں آنے اور روبرو واپس ہو کر جانا۔
۲۱- کیفیت لشکر انگریز قلعہ لینا نندی درگ کا اور کمک کرنے فرزند نظام علیخاں انگریز کے تئیں بعد کے ایک روز کے
۲۲- کیفیت حضرت سلطان فرانسس کپتان اور ناموافق ہونے درمیان انگریز کے اور سلطان کے اور سری رنگ پٹن قلعہ لینا اور درنسبت ملک لینا جنرل ہارس صاحب۔
اس کے بعد مصنف لکھتا ہے۔

راجہ کشن راج سری رنگ پٹن کا بادشاہ تھا کراچیزی نندراج اور دیوراج دو بھائی اس کے مشیر خاص تھے۔ فوج ریاست بہت تھی واسطے طلب و تنخواہ کے آمدنی ملک کی کفایت نہ کرتی تھی۔ اس لیے اس نے ان مشیروں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے ماکڑی کے زمین دار پر حملہ کرنے اور باج لینے کا مشورہ دیا۔"

حیدر علی خاں کی آمد اور ان کے اوصاف کا بیان یوں لکھا ہے۔

جب بزرگان نواب حیدر علی خان کے ملک عرب سے بیجاپور کو آئے اور کتنے ایک دن پیچھے بادشاہ بیجاپور کی سرکار میں نوکر ہوئے لیکن اس وقت یہ عمدہ اور معتبر سردار تھے اور ان کی تابعداری میں بہت لوگ تھے۔ اس باعث اطراف کے ملکوں پر نام آوری اور بزرگی سے مشہور تھے۔ یہ آپس میں تین بھائی تھے یعنی محمد فتح اللہ غلام حیدر اور غلام علی۔ بڑے جوانمرد عقلمند تھے اپنی دانائی و باہوشی کے سبب سے بادشاہ کے دربار میں بہت مرتبہ اور بزرگی پیدا کیئے اور کئی برس تک اس طرح اپنے اپنے کام پر مشغول و سرگرم تھے۔"

اس تاریخ کے مترجم کا بھی نام پردہ خفا میں ہے۔ لیکن سنہ تصنیف کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۲۱۴ھ سے قبل کی ہے۔

سیر تواریخ کے علاوہ اس عہد میں سیر یہ بھی کتابیں لکھی گئیں اور اس صنف ادب میں سب سے زیادہ نمایاں محمد باقر آگاہ کے کارنامے ہیں۔ باقر آگاہ کئی اعتبار سے اپنے زمانے کی ممتاز شخصیت ہیں۔ اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی تحریریں ادبی اعتبار سے گیارہویں صدی کے نثری شاہکاروں میں شمار کی جا سکتی ہیں باقر آگاہ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے کارنامے چھوڑے۔ اس لیے ان کی عظمت کے اکثر مصنفین اردو معترف ہیں چنانچہ

ڈاکٹر زور ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

آگاہ اردو کے بڑے محسنوں میں سے ہیں انھیں نظم و نثر دونوں پر قابو تھا غزل قصیدہ مثنوی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی واقعہ یہ ہے کہ دکھنی علم و فضل اور شعر و سخن ان پر ختم ہوگیا۔ ان کے بعد جنوبی ہند میں اتنا بڑا ادیب و شاعر پیدا نہ ہوسکا[1]۔

پروفیسر سروری نے فہرست مخطوطات کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ان کے متعلق جو نوٹ لکھا ہے اس میں ان کی عربی فارسی اردو تینوں تصنیفات کا ذکر کیا ہے اور ان کی تصانیف کی تعداد (۳۰۳) بتائی ہے[2] جس سے ہاشمی صاحب نے اتفاق کیا ہے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے بڑی تحقیق سے آگاہ کے حالات سے اردو دنیا کو روشناس کروایا جو خود بھی آگاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ بڑی حد تک مستند ہیں۔ ہاشمی صاحب آگاہ کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

آگاہ اردو زبان کی تنقید اور تاریخ ادب کے موجد قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل تاریخ زبان اردو اور تنقید زبان اردو کے متعلق اپنی کتابوں میں اظہار خیال کیا[3]

حالات زندگی باقر آگاہ کے حالات بہت کچھ روشنی میں آچکے ہیں ان کے اجداد بیجا پور کے رہنے والے تھے۔ والد محمد مرتضیٰ عادل شاہی حکومت کے زوال کے بعد مدراس گئے آگاہ ویلور میں سنہ ۱۱۵۸ھ میں تولد ہوئے۔ ان کے سنہ ولادت کے بارے میں اختلافات ہیں ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری نے ان کا سنہ ولادت سنہ ۱۱۴۸ھ تحریر کیا ہے۔ لیکن مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سنہ ولادت

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۴۷

[2] فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ ۱۸

[3] وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ زیر طبع

۱۱۵۸ھ لکھتے ہیں۔ یہی قرین قیاس نظر آتا ہے کیونکہ سنہ ۱۱۸ھ میں آگاہ نے اپنی تصنیف "ہشت بہشت" ختم کی تھی۔ چنانچہ زور صاحب نے اس سنہ کو ثبت نیت سنہ تصنیف مانا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے پھر اسی سنہ کو سنہ ولادت قرار دیا ہے۔

آگاہ نے ابتدائی تعلیم چچا سے پائی پھر شاہ ابوالحسن قربی سے فیض باطنی حاصل کیا۔ تعلیم کی تکمیل مولوی ولی اللہ کے پاس کی ولی اللہ مدراس کے عالموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ آگاہ نے پندرہ سال کی عمر ہی سے فکر سخن کرنا شروع کیا چنانچہ اپنی تصنیف "ریاض الجنان" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

> بوجھ لے بھائی یہ عاصی پندرھویں سال سے شعر کے سات الفت و ارتباط رکھتا ہے۔ اگر چہ شعر کم کہا تھا اس واسطے تخلص اپنا مدت تک مقرر نہیں کیا تھا۔

سترہ سال کی عمر میں اپنے استاد حضرت قربی کی مدح میں قصیدہ لکھکر پیش کیا اس کے چند ہی روز بعد ان کے علم و فضل کی شہرت چہار طرف پھیل گئی۔ کرناٹک کے نواب والاجاہ نے ان کو اپنے بیٹوں امیر الامراء اور عمدۃ الامرا کا اتالیق مقرر کیا اور اوراپور کی جاگیر عنایت کی اس کے بعد اپنا معتمد خاص بنایا۔ نواب والاجاہ ان کی بڑی عزت و قدر کرتے تھے سنہ ۱۲۲۰ھ میں آگاہ کا انتقال ہوا۔ محمد غوث شرف الملک نے جو بڑے فقیہہ اور محدث تھے "قدمات فرد العصر" سے "تاریخ وفات نکالی۔

تصانیف ان کی تصانیف (۳۳) بیان کی جاتی ہیں ان میں سے سولہ یا سترہ اردو میں ہیں۔ پروفیسر سروری نے ان کی تصانیف کی تعداد (۴۱) بتائی ہے[1] جو مندرجہ ذیل ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ صفحہ ۱۸

(۱) ہشت بہشت (۲) تحفتہ الاحباب (۳) تحفتہ النساء (۴) فراید درفواید
(۵) ریاض الجناں (۶) محبوب القلوب (۷) روضتہ السلام (۸) گلزار عشق
(۹) قصہ رضوان شاہ (۱۰) روح افزا (۱۱) خمسہ متحیرہ (۱۲) مثنوی
روپ سنگھار (۱۳) دیوان اردو (۱۴) عقاید نامہ یا عقاید باقر آگاہ۔

مولوی نصیرالدین ہاشمی نے باقر آگاہ کی (۱۷) اردو تصانیف بتائی ہیں۔
ہاشمی صاحب اور زور صاحب نے آگاہ کی تصانیف میں قصہ رضوان شاہ اور روح افزا کا کہیں نام نہیں لکھا۔ البتہ "مثنوی گلزار عشق" میں ہیرو اور ہیروئن کے نام رضوان شاہ اور روح افزا بتائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ان کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ عقاید نامہ (۲) تحفتہ النساء (۳) ہشت بہشت (۴) ریاض الجناں
(۵) محبوب القلوب (۶) حاشیہ من درپن (۷) تحفہ احباب (۸) معراج نامہ
(۹) ہدایت نامہ (۱۰) گلزار عشق (۱۱) روپ سنگھار (۱۲) دیوان آگاہ
(۱۳) روضتہ الاسلام (۱۴) فواید در عقاید[۱] (۱۵) ریاض السیر (۱۶) خمسہ متحیرہ
(۱۷) فرقہ ہائے اسلام

ہاشمی صاحب نے بھی مندرجہ بالا کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ لیکن انھوں نے صرف سولہ کا ذکر کیا ہے۔ حاشیہ من درپن کا تذکرہ ہاشمی صاحب نے نہیں کیا۔ چونکہ ہشت بہشت کے ساتویں حصہ کا نام "من درپن" ہے اس لیے ممکن ہے انھوں نے ہشت بہشت کا جز سمجھ کر سے نظر انداز کر دیا ہو۔ حالانکہ "من درپن" اضافہ کے بعد ایک دوسری تصنیف سمجھی جاسکتی ہے اس میں بقول مصنف "قرآن کا اعجاز" یعنی قرآن کی خصوصیات اور صفات بیان کی گئی ہیں۔

---

[۱] اس کا نام پروفیسر مردری اور مولوی نصیرالدین ہاشمی نے فراید در فواید تحریر کیا ہے

ابتدائی چار ابیات سے جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں کتاب کی وجہ تالیف معلوم ہوتی ہے جو یہ ہیں

پس از حمد خدا و نعت مختار + سن اس مضمون کو گوش دل سے اے یار
کہ من درپن میں بولا میں باایجاز + باآئین ہمیں قرآن کا اعجاز
جب اس کو مختصر تو کر دیا ہوں + کئی جا میں اشارت کر گیا ہوں
یہ نظم صاف کے تیں آپ کیا میں + بطور حاشیہ اپر لکھا میں

ڈاکٹر زور مندرجہ ابیات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ من درپن ہشت بہشت کا ساتواں اور ضخیم ترین رسالہ ہونے کے باوجود مصنف کی نظر میں مختصر تھا اس لیے اس نے حاشیہ لکھنے کی زحمت گوارا کی۔

اس حاشیہ من درپن کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ آگاہ کی مندرجہ بالا سترہ تصانیف میں صرف ایک کتاب "ریاض السیر" جو آں حضرت کی سیرت کے متعلق ہے۔ نثر میں ہے بقیہ سب تصانیف منظوم ہیں۔ لیکن ان منظوم تصانیف میں اکثر کے دیباچے نثر میں لکھے گئے ہیں جن کے دیباچے نثر میں ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ریاض الجنان۔ (۲) دیوان شعر۔ (۳) ہشت بہشت۔
(۴) محبوب القلوب۔ (۵) تحفۂ احباب۔ (۶) فواید در قواعد۔
(۷) گلزار عشق۔

(۱) "ریاض الجنان" : یہ ایک مثنوی ہے جو مناقب اہل بیت نبی میں لکھی گئی ہے اس کے دیباچہ میں مصنف نے اس کے ماخذوں کی تفصیل دی ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ مصنف کے خیال میں اہل بیت کرام کے فضائل و مصائب کے بیان میں ولی ویلوری روضۃ الشہدا اور نوازش علی شیدا کی روضۃ " تاریخی لحاظ سے ناقص تھیں اس لیے انھوں نے یہ کتاب لکھی۔ اس

دیباچہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ذیل میں اس دیباچہ کا وہ اقتباس دیا جاتا ہے جن میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں۔

"برج لے بھائی یہ عاصی پندرہویں سال سے شعر کے ساتھ الفت و ارتباط رکھتا ہے۔ اگرچہ شعر کم کہا تھا اسی واسطے تخلص اپنا مدت تک مقرر نہیں کیا تھا جب ۱۱۵۴ھ اور ۱۱۵۵ھ میں یعنی رسائل ہشت بہشت کے منظوم کیا لفظ باقر کہ جز نام ہی بجائے تخلص رکھا۔ من بعد بیچ ۱۱۹۰ھ ایک ہزار ایک سو نود اور چہار کی وقت نظم ترقی دیوان عربی کے تخلص اپنا آگاہ مقرر کیا اس تخلص کو اشعار عربی نہ فارسی میں لایا اور اکثر مراثی اور ریختوں میں بھی اس تخلص کو اختیار کیا اور تتمہ رسائل "ہشت بہشت" میں کہ بیچ سنہ ۱۱۲۶ کے منظوم ہوئی اور بیچ کتاب محبوب القلوب کے بیچ اوائل ۱۱۲۷ھ کے منظوم ہوے اور اس رسالے میں کہ ریاض الجنان نام رکھتا ہے تخلص اپنا وہی لفظ باقر رکھا۔ کیا واسطے کہ رسائل اول کی جابجا مشہور ہوئے تھے اگر بعد ہوئی سو رسالوں میں تخلص آگاہ لاتا تو دو تخلص ہوتے اس واسطے وہی تخلص بحال رکھا تا سب ثنویات دکھنی میں ایک تخلص رہے۔"

ہشت بہشت کا موضوع "ریاض سیر" کی طرح "سیرت نبی" ہے۔ ریاض السیر نثر میں ہے ہشت بہشت نظم میں جو آٹھ حصوں میں مشتمل ہے

(۱) من دینک (نور نبوی کے حال میں) (۲) من ہون ولادت بشارتوں کے بیان میں (۳) من موہن۔ آنحضرت کے حسین کے معجزات کے بیان میں (۴) جگ موہن۔ حالات زندگی (۵) آرام شمائل و اخلاق (۶) راحت جاں خصائص کے (۷) من درپن جملہ معجزے (۸) من جیون آنحضرت صلعم کے روضہ کی زیارت آپ پر درود کے فضائل وغیرہ کی تفصیل کی گئی ہے

ابتدا میں ۵ صفحات کا دیباچہ ہے پھر ہر فصل کے آغاز پر ایک مختصر دیباچہ شامل ہے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

چھٹے رسالے اول کے مع رسالہ عقائد و تحفۃ النساء سنہ ایک ہزار ایک سو اسی اور پانچ میں اور سنہ ۱۱۸۶ھ میں بنے ہیں پیچھے اس کے بہت ڈھیل ہوئی گیا واسطے کہ ایک رفیق با توفیق و جلیس انیس کہ ان رسالوں کا طالب اور ایسے خیر کے کاموں پر راغب تھا سو رحلت کیا۔ حق تعالیٰ اس پر رحمت کرے اور اسے اپنی مغفرت سے نوازے اور بہت موانع بھی پیش ہوئے۔ ہر چند اس اثنا میں بعض دوستاں واسطے دوسرے رسالوں کے بولے ہیں اتفاق ان کے بنانے کا نہیں ہوا۔ آخر ابتدا سنہ ایک ہزار اور دو سو اور چھ میں رسالہ من ورپن اور من جیون بنانے کا اتفاق ہوا اور رسالہ آرام دل میں بیان عادات شریعت کا اور رسالہ راحت جان میں بیان اکثر خصائص امت کا اور رسالہ جگ موہن میں حضرت کی نبوت سے تا وفات اون کی تا وفات صلی اللہ علیہ وسلم داخل کیا گیا۔ ان آٹھ رسائل میں تخمیناً (۸۶۵۶) بیت ہیں اور سرخیوں کے ساتھ نو ہزار بیت ہونگے ان سب رسالوں میں شاعری تیئں کہا ہوں بلکہ صاف و سادہ کہا ہوں اور اردو کی بہا کا میں نہیں کیا کس واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بہا کا سے واقف نہیں ہیں لے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہے کر کر سہل اور سرسری نجان کیا واسطے کہ بڑے معتبر کتب سے تحقیق کر کے لکھا ہوں"۔

اس کے علاوہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ہر حصّے کے آغاز پر بھی نثر میں موضوع کے متعلق تشریح کی ہے جیسے پہلے رسالے میں من دینک کے آغاز میں دیباچہ میں یوں

لکھا ہے۔

رسالہ اول کا نام من دینک ہے۔ اس رسالہ میں حضرت سید عالم
صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مقدس کا ذکر ہے۔ یعنی حق سبحانہ اس نورِ
مقدس کون سب موجودات کے اول پیدا کیا اور اس کے طفیل سے
سب علویات وسفلیات کون ہویدا کیا اور اس نور اشرف کون ہر
پشت پاک سے ہر شکم پاک میں نقل کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ نورِ
لطیف حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ میں آیا"

تیسرے رسالہ "من موہن" کے آغاز کی دیباچہ عمومی میں اس طرح وضاحت کی ہے۔

اس رسالہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا بیان ہے
یعنی جو معجزات کہ مدت حمل اور ولادت اور دودھ چھڑائی اور خرد
سال میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوئے اس حد تک کہ حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی آٹھ برس کی عمر ہوئی ہے"

آگاہ کی اس تصنیف کے مخطوطے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کتب خانہ آصفیہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو اور کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کا مخطوطہ ناقص الاول ہے۔

دیوان دیباچہ میں اصناف شاعری اور زبان اردو پر بحث کی گئی ہے۔ غالباً اسی لیے پروفیسر عبدالقادر سروری اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"موضوع کے اعتبار کے اعتبار سے دیباچہ نہایت اہم جزو دیوان ہے"

گلزار عشق عرف قصے رضوان شاہ و روح افزا

آگاہ کی اس مثنوی کا مخطوطہ اکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ حیدرآباد کے کسی کتب خانہ میں اس کا مخطوطہ نہیں ملتا اس کتاب کا آغاز ۱۲۱۰ھ میں ہوا تھا اور ۱۲۱۱ھ میں مکمل ہوئی لیکن اس مثنوی کے آغاز میں آگاہ نے جو دیباچہ

نثر میں لکھا ہے وہ خاصہ اہم ہے۔ اس میں انہوں نے دکھنی کی اہمیت اور اس کا ماخذ بتایا ہے۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات سے اس کا کچھ انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ قصہ ہے اور سیر میں شامل نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ باقر آگاہ کی تصانیف کا حال لکھا گیا ہے اور یہ دیباچہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیئے اس کا کچھ اقتباس نیچے دیا جاتا ہے۔

مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان مبینی و ہرزہ وزاہان لایعنی زبان دکھنی پر اعتراض اور گلشن عشق و علی نامہ کے پڑھنے سے احتراز کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کے قائم تھے زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج اور طعن شماتت سے سالم تھی اکثر شعرا وہاں کے مثل نشاطی و ذوقی۔ و شوقی و خوشنود۔ غواصی۔ فوقی۔ ہاشمی شغلی بحری نصرتی جہتاب وغیرہم کے بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصاید و غزلیات و مثنویات و مقطعات نظم کئے اور داد سخنوری کا دیے۔ لیکن نصرتی ملک الشعرا اور تنگ نظری سے مبرا ہے جب شاہان ہند اس جنت نظیر کو تسخیر کیے طرز روزمرہ دکھنی نہج محاورہ ہندی سے تبدیلی پانے لگے تاآنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی۔ اور ہندوستان میں مدت تک زبان ہندی کے رو سے برج بہاکا بولتے ہیں رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت ان کی اصل اصول اور مخرج فنون فروع و اصول ہے۔ پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص کو اوس کے کھونے لگے سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمی ہوئی۔ جیسا ثنائی و ظہوری نظم و نثر فارسی میں باقی طرز جدید کی ہوئی ہیں۔ ولی گجراتی غزل ریختہ

کی ایجادیں سبھوں کا مبتدا اور استاد ہے۔ بعد اوس کی جو سخن سنجان ہند بروز کیے بے شبہ اس نہج کو اوس سے لیے اور من بعد اوس کو با اسلوب خاص مخصوص کر دیے اور اوسے اردو کے بھاکا سے موسوم کیے اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کی جیسا شاہ جہاں آباد و لکھنؤ و اکبر آباد وغیرہ رواج تمام پایا اور جوں جاہی بہوں کی من بھایا اور آخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تلک اس فن اکثر مشاہیر شعراء صد میں آئے اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں مثل درد، مظہر، فغاں، دردمند، یقین، سوزاں، ابرآرزو، سودا، تاباں وغیرہم لیکن ان سبھوں سے کوئی بھی مثنوی معتد بہی نہیں کہا فقط قصاید۔ غزلیات و مقطعات پر اکتفا کیا بارے اس عصر میں حسن دہلوی ایک مثنوی مختصر لکھا دریافت اوس کی معتبر مصنف پر موقوف رکھنا اولیٰ ہے برخلاف شعرائے دکن کے کہ اکثر مثنویات کہی ہیں بالاتفاق غزل بولنا آسان او رمثنوی کا کہنا دشوار و گراں ہے اس لیے ملک الشعرائے دکن بطور تعریض کہتا ہے۔

دس پانچ بیاں کہ کئی شوق اگر تو کیا ہوا
معلوم ہوتا شعر اگر کہتی تو اس بتار کا

اور جو اے بھائی کہ ان سب شعرا میں بعض فقط شاعر ہیں اور عشق و عرفاں میں بھی ماہر ہیں مثل مولانا شاہ ندیم اللہ ندیم تخلص وفاتی شیخ محمود بحری تخلص صاحب من لگن شعرائے دکن سے اور مرزا مظہر جان جاناں و خواجہ میر درد شعرا ہوئے۔"

باقر آگاہ کے زمانے تک اردو کے ادبی معیار قائم ہونے لگے تھے اور وہ اس نئے معیار کو اختیار کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تاہم دکھنی کے متروک ہونے کے باوجود وہ اثر سے بچ نہیں سکتے۔ یہ فطری بات تھی اس کا اعتراف انھوں نے ذیل میں نہایت

ہی صداقت کے ساتھ کیا ہے۔ ایک بات جو خاص طور پر توجہ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ باقر آگاہ کو دکھنی کے اردو سے پہلے کے متروک روپ ہونے کا احساس تھا ان کے عہد کے دوسرے مصنف مثلاً قاضی بدرالدولہ جن کا ذکر آگے آئے گا ہندی اور دکھنی کو مترادف معنوں میں استعمال کرتے ہیں آگاہ کے دیباچے کا اقتباس حسب ذیل ہے

"تاریخ ہجرت باہ جاہ و جلال کے ۱۲۱۱ھ ایک ہزار دوسو گیارہواں سال ہے۔ قصہ رضوان شاہ اور روح افزا کا پسند کر کے اوسے نظم کیا۔ جب قدیم دکھنی اوس سبب سے کہ اگر مرقوم ہوا اس عصر میں رائج نہیں ہے۔ اوسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و شستہ کو قریب روزمرہ اردو کے ہے اختیار کیا اور صرف اس بہا کا میں بینے سے دو چیز مانع ہوئی۔ اول یہ کہ تاثیر وطن یعنی دکن اوس میں باقی ہے کیا واسطے کہ اجداد پدری و مادری اس عاصی کے اور سب قوم اوس کی بیجاپوری رہیں دوسرے یہ کہ بعضے اوضاع اوس محاورہ کے میرے دل میں نہیں بھاتے اذاں جملہ یہ کہ تذکیر و تانیث فعل نزدیک اہل دکن کے تابع فاعل ہے۔ اگر یہ مذکر ہے تو وہ بھی مذکر ہے۔ اور اگر مونث ہے تو مونث بہ قاعدہ موافق عربی کے سنہ السنہ ہے[1]"

فرائد در فوائد اس مثنوی میں قرآن مجید کی شان نزول اس کے فضائل سورتوں کی تعداد اقسام وحی۔ کیفیت وحی وغیرہ باتیں بتائی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ بھی نثر میں ہے جس میں کتاب کا نام سبب تالیف اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کتاب کے ماخذ اور مشمولات کی فہرست بھی لکھی ہے۔ ان میں سے ایک تو نورالدین علی کی عربی تصنیف "حجتہ الاسرار" ہے دوسری فارسی "محبوب المعانی"

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۵۶۴

سید محمد صادق قادری اورنگ آبادی کی تصنیف ہے۔ کتاب کا نام اس طرح بتایا ہے۔

بعد حمد و نعت کے کہتا ہے محمدؐ باقر شافعی قادری ابلوری کان اللہ
ختم بالصالحات عملہ کہ اس رسالہ کا نام "فواید در قواید" ہے ہر فایدہ
اس کا وردانہ بے مول اور خراج ملک کا ہم تول ہے۔ ہندی زبان
میں ہے کر کر اوسے سرسری نہ جان"۔

معبوب القلوب یہ طویل مثنوی حضرت محبوب سبحانی کے حالات میں لکھی گئی ہے اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کو "اصل" سے موسوم کیا گیا ہے یہ ہر باب میں عنوانات کی ذیلی تفہیم بھی ہے۔ یعنی ہر اصل میں کئی کئی "جلوے" اور فصلیں ہیں ان سب کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے۔

جیسا لکھا جا چکا ہے اس کا دیباچہ بھی نثر میں ہے اس دیباچہ کا ابتدائی حصہ یہ ہے۔

"بعد حمد و نعت کے محمدؐ باقر آگاہ شافعی قادری ویلوری توفیق دیوے
رو سے حق سبحانہ تعالیٰ کہتا ہے کہ مناقب حضرت محبوب سبحانی کے علی حدٰ
بے حساب ہیں اس مناقب شریعت کو علما اور اولیا چار قسم پر کیے ہیں"

"محبوب القلوب" مخطوطے کتب خانۂ سالار جنگ سے کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہیں۔ ادارہ کا مخطوطہ ناقص الاول ہے یعنی اس کے آغاز میں دیباچہ نثر غایب ہے۔ دوسرے کتب خانوں کے نسخے مکمل ہیں۔

تحفۃ الاحباب اس مثنوی میں آنحضرت کے اصحاب کی فضیلت کا بیان ہے۔ اس میں کل پندرہ باب ہیں اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ اصحاب میں پہلے چار اصحاب کرام اس کے بعد دوسرے صحابہ جیسے حضرت حمزہ حضرت عباس حضرت سعد حضرت عبدالرحمن وغیرہ کے حالات لکھے گئے ہیں اس دیباچہ کا اقتباس درج ذیل ہے۔

بعد حمد ونعت ومنقبت کے کہتا ہے محمد باقر آگاہ شافعی قادری
بیجاپوری ویلوری توفیق دیوے اسے اللہ تعالیٰ کہ حقوق اصحاب
کرام کے رضی اللہ عنہ تمام امت پر حد سے سوا رہیں۔ سب پر فرض
ہے کہ آنحضرت کے ساتھ صدق دل سے محبت رکھیں اور ہمیشہ ان کے
سپاس گذار رہیں۔ کس واسطے کہ وہ رہنمایان دین حضرت سیدالمرسلین
کے ہیں۔

ان مثنوی کے مخطوطے برٹش میوزیم۔ کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ
آصفیہ میں محفوظ ہیں

ریاض السیر تصانیف سیر کے صرف دیباچے نثر میں تھے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے
ان کی ایک تصنیف نثر میں ملی ہے جس کا موضوع ہشت بہشت
کی طرح آنحضرت کی سیرت ہے۔ ریاض السیر[1] کے اکثر حصے عربی کتابوں سے ماخوذ اور
مترجم ہیں اس کا اندازہ ذیل کی عبارت سے ہوسکیگا جس میں جملوں کی ساخت پر
عربی کا اثر غالب ہے عام طور پر آگاہ کا یہ انداز نہیں یہ حصہ جو ذیل میں درج کیا
جا رہا ہے آنحضرت کی ولادت کے بیان میں ہے لکھتے ہیں۔

جب حمل آمنہ کا دو ماہیہ ہوا بقول مشہور وفات پائی والد ماجد
آنحضرت کی کہ عبداللہ نام رکھتی ہے جب گذری چھ مہینہ حمل
شریف حضرت کی سی پہر دیکھا والدہ شریفہ حضرت کی نے خواب میں
فرشتہ کو کہ کہتا ہے ای آمنہ بشارۃ پہونچی کہ حاملہ ہوئی ساتھ
حامل تو اے دین خیر العالمین کے جب کہ وہ پیدا ہوں تو نام محمد رکھیو
روایت ہے ابونعم نے ابن عباس سے جب کہ نو مہینے حمل شریف کے

---

[1] مخطوطہ نمبر ۳۵ کتب خانہ آصفیہ فن سیر دمخطوطہ عنہ ۴

منقطع ہوے آسیہ اور مریم شب تولد حوروں کو لیکر حاضر ہوئے
بارھویں تاریخ ربیع الاول کے روز دوشنبہ کا تھا وقت فجر کے یا
تیسری یا آٹھویں یا دسویں ربیع الاول کے اس مہر سپہر نبوت ماہ سیمار
سالہ نے مطالع فلک سعادت سی نور شہود دیکھایا اور قدوم میمنت
لزوم برج حمل سے بار لاکر نور ظہور اپنی سی زمیں و زماں کو شرف کیا
ہے. غلط کیے اگر پیدا وہ مہ پارا ہوا. ماہ شرمندہ ہوا جلوہ کر بارا ہوا
یہاں سامان مولود شریف کو چاہیئے کہ حضرت پر صلوٰۃ بھیجیں واسطے
تعظیم سر و چمن جلالت کی یارب اس روح معظم پر کرانبار مدام بہ
نہایت صلوات اور تحیات و سلام و مرحبا کہ ایسا ماہ خوش نما
مطلع عیب سے طلوع ہوا اور ایسا آفتاب جہاں تاب افق بے عیب سے
طلوع ہوا اور ایسا آفتاب جہاں تاب افق بے عیب سے شیوع
ہوا ظلمات کو اور عصیاں کے ساتھ شعلہ احسان نور اسلام ایمان کے
لیو وسے اور کدورت اور جہاں کے ساتھ شعلہ احسان عرفاں کے مشتعل ہوئے۔

ولادت کے بوجالات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

آپ نے جیسا یہاں قدم رنجہ کیا اپنی چہرے سی طلوع یک مہ کیا
دفع کی ظلمت کدورت یہ کہ واہ سب کا سب بچھلائی دفتر تہہ
کیا تخت فلک الافلاک سے نقطہ مرکز خاک تک اور سطح عرش بریں
سے تحت فرش تک نام تاریکی کا باقی نہ رہا کیونکہ وہ ماہ میں کب
بے نور رہے۔ اور رہے کچھ بے نشان ہے اور رہے کچھ ظہور رہے جتنے جن
اور شیاطین تھے آسمان پر جانے سے باز آئے اور ستارے زمین
سے ان سے نزدیک دکھائی دیتے تھے گویا زمیں پر کوی بالکل آتیں
حرم کے روشن ہوئی اور آتش اہل فارس کا ہزار برس سے جلتے تھے

کرے اور اہل فارس مشک و عنبر اس میں ڈال پوجتے تھے بجھ گئے۔ نور نبزا شمع عرب کیا ہوئی آتشی فارس وہیں مردہ ہوئے جس گھڑی حضرت نے اس گلذار گلشن برائے عالم ارواح سے اس چار بازار اشیاء میں کدورپہلے سجدہ کیا بعد اس کے انگشت شہادت آسمان کے طرف اٹھائی اور سر مبارک کو اٹھا کر فرمایا لا الٰہ الا اللہ انی رسول اللہ عبد المطلب اور بولہب نے اس مژدہ جان بخش کو سن کر بہت شادی کئے۔ ابولہب نے اس مژدہ مانوبیہ نام اپنی لونڈی کو کہ اس نے خبر تولد شریف حضرت کے روسے بیجا ہے۔ آزاد کیا اوسی خوشی کا یہ سبب ہے کہ ابی لہب کو ہر دو شنبہ کو تخفیف عذاب کے ہوتی ہے اور شب ولادت حضرت کی سی تا تین روز کعبہ معظمہ فرحت اور سرور قدم میمنت لزوم حضرت کی سی ملتا رہا۔

ان نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگاہ کی تصانیف کا بڑا مقصد کم پڑھے لکھے لوگوں اور بالخصوص عورتوں کو علوم دین سے آگاہ کرنا ہے۔ اور اس کے لیے انھوں نے مذہبی بزرگوں کے حالات زندگی رقم کرنے پر زیادہ زور دیا۔ چنانچہ اپنے مقصد کو ہشت بہشت میں اس طرح واضح کیا ہے۔

"بعض علما متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے۔ ان سے فایدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور امیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اس لیے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہے"۔

پھر اسی میں بیان کرتے ہیں۔

دکھنی میں کہا ہوں اسلیئے میں + تا ہوئے سہج عوام کے تئیں

تا سر برا میاں صور عورات + ہونے ستی اسکے یادیں لذات

اسی نام کی یعنی "ریاض السیر"[1] ایک اور تصنیف کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے جو منظوم ہے اور اس کے مصنف نوایط خاندان ہی کے ایک بزرگ غلام محمود حسرت ہیں۔ اس میں بھی ابوالحسن ثانی کی مدح کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے آگاہ کی تصنیف کو حسرت نے منظوم کیا۔ اس کا ایک اور مخطوطہ مجھے درگاہ ہاشم پیر کے سجادے جناب مصطفےٰ حسینی کے کتب خانہ میں بھی دستیاب ہوا۔

بدر الدولہ اس عصر کے سیرت نگاروں میں دوسرا نام جو ہم کو ملتا ہے وہ قاضی بدر الدولہ کا ہے جو باقر آگاہ کے خاندان ہی کے ایک فرد تھے۔ بدر الدولہ شرف الدولہ[2] (جن کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے) کے بیٹے تھے۔ ان کا نام صبغۃ اللہ تھا "بدر الدولہ" خطاب تھا جو دربار ارکاٹ سے دیا گیا تھا۔ غلام غوث خاں والاجاہ کے زمانے میں وہ قاضی القضاۃ کی خدمت پر فائز تھے۔ ان کے بڑے بھائی عبدالوہاب نوابان ارکاٹ مدار المہام تھے۔ قاضی بدر الدولہ ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا۔ قاضی صاحب کی تصانیف میں حسب ذیل کتابیں ملتی ہیں۔

۱۔ سیرت نبی کریم (۲) سیرت صدیق اکبر ۳۔ نثر الجواہر یا سیرت عبد القادر جیلانی۔

مذکورہ بالا عنوانوں سے ظاہر ہے کہ قاضی صاحب نے سیرت نگاری کو اپنا خاص موضوع بنا لیا تھا

نثر الجواہر قاضی صاحب کی غالباً سب سے زیادہ ضخیم تصنیف ہے جس کا مخطوطہ راقم الحروف کو شاہ ہاشم حسینی العلوی کی درگاہ کے سجادہ نشین جناب

---

[1] ملاحظہ ہو وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ از نصیر الدین ہاشمی

[2] ملاحظہ ہو مقالہ ہذا

مصطفٰی الحسینی کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ اس کتاب کی تمہید میں لکھا ہے کہ یہ کتاب دراصل ان کے والد محمد غوث (شرف الدولہ) کی تصنیف " انہار ا کا ترجمہ ہے وجہ تصنیف مصنف کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"تصنیف زبدۃ العلما مولانا محمد غوث اس ترجمہ کا باعث یہ ہے کہ صاحبزادہ بلند اقبال عمدۃ الامرا بہادر جنگ زبان درخشاں سے اپنے ارشاد فرمائی کہ کتاب مذکور کو ہندی زبان میں ترجمہ کرو پھر میں نے بموجب اس فرمان کے اس کو ترجمہ کیا۔"

حضرت عبدالقادر جیلانی کے "محی الدین" لقب اختیار کرنے کے بارے میں محمود بن عثمان کی روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

محمود بن عثمان معروف کہتے ہیں کہ کسی نے شیخ محی الدین عبدالقادر سے پوچھا کہ اور ہم سب اس وقت حاضر تھے کہ حضرت کا لقب محی الدین ہونے کا سبب کیا ہے۔ حضرت فرمائے میں مسافرت سے جمعہ کے روز ۵۱۱ء یا برہنہ بغداد کو آیا اور ایک بیمار کو دیکھا کہ رنگ اس کا متغیر اور بدن لاغر وہ مجھے دیکھکر کہا السلام علیک یا عبدالقادر اس سلام کا جواب کہا پس اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا اپنے کو بٹھا پھر میں نے اس کو بٹھوایا۔ دیکھتا ہوں کہ اس کا بدن موٹا ہوا اور صورت بہتر ہوئی اور رنگ صاف ہوا میں اس سے ڈر گیا اس نے کہا تو مجھے نہیں جانتا میں کہا نہیں پھر ان نے کہا میں دین ہوں پر مردہ ہوا تھا جیسا کہ میں کہا تو دیکھا اب خدائے تعالیٰ تیرے سبب مجھے زندہ کیا اور تو محی الدین ہے یعنی دین کو زندہ کرنے والا۔ پھر میں نے اسے چھوڑ کر جامع مسجد کو آیا شخص مجھ سے ملاقات کر کے تعلیم میرے روبرو کہا اور کہا یا سیار محی الدین جمعہ کا نماز ادا کیا لوگ میرے نزدیک ہجوم کئے اور میرے

ہاتھوں کو بوسہ دیے اور محی الدین کہنے لگے۔ اس کے پیش میرا یہ لقب نہ تھا۔

قصص

قصہ گوئی ابتدائی دور سے اردو کے انشا پردازوں کا بڑا چہیتا موضوع رہا ابتدا میں قصہ کو مذہبی صداقتوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا۔ پھر تصوف کے باریک نکات بھی اسی پیرائے میں پیش کیے گئے اور نظم اور نثر دونوں ہی میں طرح لکھے گئے۔ محمد قلی کے دور سے ٹھیٹ ادبی قصے اور لبیط قصے لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اور سبھی زبانوں سے اس سلسلے میں استفادہ کیا گیا۔

یہ ذوق اردو میں ہر صدی میں ابھرتا رہا چنانچہ بارہویں صدی کے اواخر میں بھی کئی قصے لکھے گئے۔ لیکن اب مافوق الفطرت عناصر کی بجائے سنسکرت کے تریا چرتر کے قصوں کے ترجموں یا ان کے اتباع میں عورتوں کی چالاکی اور آوارگی کے قصوں کا بھی رواج ہوا۔

جیسا کہ ہر ملک کے ادب کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے۔ دورِ انشا میں شاعر اور ادیب ہمیشہ مذہب کی گود میں پناہ لیتے رہے۔ ٹھیٹ ادبی قصوں کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی قصے کے ساتھ جوڑا گیا۔ اور مذہبی تلقین سیدھے سادھے پیرایہ میں کرنے کی بجائے قصہ کہانی کا پیرایہ اختیار کیا جانے لگا۔ اس قسم کے افسانوں میں عاجز کا قصہ ملکہ مصر[۱] اور فتح کا قصہ" زلیخائے ثانی[۱] قابل ذکر ہیں۔ زلیخائے ثانی" قصہ جیسا کہ پروفیسر سروری نے لکھا ہے کہ۔

> مغفور شاہ کی لڑکی روشن بخت عہد کرتی ہے کہ جو شخص اس کے سوالوں کا جواب تشفی بخش طریقے سے دیگا وہ اس سے شادی کرے گی

---

[۱] فہرست مخطوطات کتب خانہ جامعہ عثمانیہ ۱۷۶

بہت سے سرفروش اس مہم کو سر کرنے کے لیے آتے ہیں۔ بالآخر
شہزادہ چین جس کا نام یوسف ثانی ہے اس کے صحیح جوابات دینے
میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ سوال جواب کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری
رہتا ہے۔ سوالات کی نوعیت مذہبی ہے۔ شہزادی عقائد اور
اسلامی مسائل کے متعلق سوالات پوچھتی ہے۔ اور شہزادہ ان کے
جواب دیتا ہے۔ اس سے قصہ نگار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مذہبی مسائل
پڑھنے والوں کے ذہن میں آسانی سے محفوظ رہ سکیں۔

ملکہ روم و فقیہہ

مذکورہ بالا دونوں قصص منظوم تھے۔ لیکن "ملکہ روم اور فقیہہ" کا قصہ نثر میں ہے۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ[1] ہے جس کا سنہ کتابت ۱۲۲۱ھ ہے اور یہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل کا مصنفہ ہے۔ اس میں دراصل علم حکمت اور اخلاق کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں پیش کیا گیا گیا ہے۔ "قصہ ملکہ مصر" میں عاجز نے ملکہ مصر کے صحیح جوابات دینے کے لیئے ہندوستان کے ایک عالم عبداللہ نامی کو چنا تھا۔ "قصہ ملکہ روم" میں یہ ہیرو عبدالعلیم نامی ایک فقیہہ ہے۔

اس قصہ میں روم کے بادشاہ کی بیٹی دکھائی گئی ہے جس کا نام ملکہ ہے اس نے یہ عہد کیا تھا جو شخص اس کے صحیح جواب دے گا اس کے ساتھ شادی کرے گی۔ اس کا جواب دینے بہت سے لوگ آتے ہیں لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے سکتا آخر ایک فقیہہ عبدالعلیم نامی آتا ہے اور ملکہ کے تمام سوالوں کے صحیح جواب دیتا ہے بالآخر ملکہ اس سے شادی کر لیتی ہے۔

اس قصے میں کئی مسائل ہیں۔ ملکہ فقیہہ سے وسیع موضوعات پر سوالات کرتی

---

[1] کتب خانہ آصفیہ فن قصص ۱۳؎

ہے۔ یہ موضوع حکمت تاریخ فنون فلسفہ جغرافیہ کے مسائل ہیں اور فقیہہ سب کا جواب باصواب دیتا جاتا ہے۔ آخر فقیہہ اس کی ذہانت سے متاثر ہوکر پوچھتا ہے کہ ملکہ کو یہ حکمت کس نے سکھائی۔ وہ جواب دیتی ہے کہ اس کے باپ کے مرنے کے بعد ایک سیاہ پوش بزرگ آئے جنہوں نے چالیس دن تک ملکہ کو حکمت سکھائی اور اپنا نام خضر بتایا۔

پھر ملکہ سوال کرتی ہے کہ رویت کی اصل کیا ہے۔ کالی بکری گھوڑی کہاں سے آئے ہیں وہ چیز کیا ہے جو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی رہتی ہے۔ وہ کون ہیں جو روزِ قیامت تک شب و روز چلتے ہیں اور ایک ساعت قرار نہیں رکھتے۔ فقیہہ ان سب کا جواب دیتا ہے پھر ملکہ کتب سماوی کے متعلق دریافت کرتی ہے۔

اس طرح سوال و جواب کے پیرائے میں جغرافیہ تاریخ علم دین وغیرہ کی باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ اس قصے کے مصنف کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

قصہ دلالہ مختالہ عورت کی مکاری اور عیاری کے افسانوں میں اس زمانے کا ایک قصہ ایک دلالہ کا ہے جو اپنی شرارتوں کے باوجود قانون کی زد سے بچی رہتی ہے۔ اس کے مصنف کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس عورت کے دو بیٹیوں کو دیکھا بھی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کہانی سنسکرت کے مشہور قصوں کا چربہ ہے۔ جو تریا چرتر یا عورتوں کی مکاری پر لکھے جاتے تھے۔ اس اردو کہانی کا ماخذ ایک فارسی داستان تھی جسے اردو کا جامہ پہنایا گیا فارسی میں یہ قصہ سنسکرت ہی سے لیا گیا ہوگا۔ اس قصہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی قصوں کے موضوع کو "الف لیلےٰ" کی داستان کی طرح ہارون الرشید کے عہد کی افسانوی فضا میں پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ ذیل کے اقتباس سے اس کا اندازہ ہوسکے گا۔

"نقل ہے کہ ہارون الرشید بادشاہ کے زمانے میں بغداد میں ایک

سوداگر ابوجعفر نام رہتا تھا۔ ایک عورت خوبصورت کو شادی کیا
چھ مہینے کے بعد ابوجعفر چاہا کہ سفر کو جاوے عورت کہی میں پیٹ
سے ہوں ابوجعفر کہا تم کو مبارک ہوئے القصہ ابوجعفر عورت سے
رخصت ہو کر روانہ ہوا۔ چار برس بعد ابوجعفر سفر سے پھر کر آیا
دیکھا اپنی عورت کو پیٹ رہ کر چار برس ہوئے ابھی جنی نہیں.....''

یہ صحیح ہے کہ اس طرح کے چند قصے " الف لیلیٰ " میں بھی ملتے ہیں لیکن
الف لیلیٰ " کے اکثر قصوں کے بارے میں بھی یہی قیاس ہے کہ وہ ہندوستان سے
لے گیے ہیں اور عربوں میں ان کا رواج ہارون اور مامون کے زمانے میں ہوا جب کہ
کئی ہندوستانی علما بغداد کے محکمہ تراجم میں مامور ہو کر ہندوستان سے آئے تھے
اس قصہ کا ایک مخطوط مدراس کی مینوسکرپٹ لائبریری میں موجود ہے۔ سنہ تصنیف
درج نہیں کتابت ۱۲۲۰ھ کی ہے۔

اس عہد کے یہ چند آخری کارنامے تھے جن پر اس مقالے کی سرحد ختم ہو جاتی
ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اور سب سے پہلی تصنیف
جو میرامن نے " باغ و بہار " کے نام سے لکھی وہ کالج کے قیام کے ایک سال بعد ۱۲۱۶ھ
میں لکھی گئی۔ اس کتاب کی تصنیف سے اس میں شک نہیں کہ اردو نثر کے ارتقار
میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے لیکن ابتدائی سالوں میں سادہ نگاری اور ایک
حد تک حقیقت نگاری کی یہ تحریک کالج کی چار دیواری تک محدود رہی لیکن کالج سے
باہر کی تصانیف میں عرصہ تک پرانی روایات کا اثر رہا' جس کا ایک یادگار نمونہ " فسانہ
عجائب " اور خاص طور پر اس کے دیباچہ کے وہ اشارے ہیں جس میں سرور نے میرامن
کی زبان اور اسلوب پر تعریض کی ہے

" فسانہ عجائب " اور اس طرح کے دوسرے قصے اور سرور کی ساری تصانیف
اس میں شک نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد کی ہیں' لیکن قصوں کی نوعیت

اور اسلوب کے اعتبار سے ان کارناموں کی سرحدیں فورٹ ولیم کالج کی نئی تحریک کے مقابلے میں اس سے پہلے کی نثری روایات سے ملی ہوئی ہیں، اور یہ سلسلہ کالج کے قیام کے کم و بیش پچاس برس بعد تک بھی جاری رہا۔ ان قدیم روایات کی تبدیلی میں سیاسی سماجی تعلیمی اور کئی طرح کے انقلابات کو دخل ہے ان ہی میں سے ایک فورٹ ولیم کالج کے تصنیفات کا یہی اثر تھا۔ تاہم مرتب مقالہ نے اپنے مقالے کی سرحدوں کو عبور کر کے سنہ ۱۲۱۴ھ م سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد کے کارناموں کو اس میں شامل کرنا مناسب نہیں جانا۔ بلکہ ان نثری روایات کے تسلسل کی آخری منزلوں کی طرف محض اشارہ کرنے ہی پر اکتفا کیا ہے۔

کتابیات

تاریخ ادب اردو

(۱) - اُردوے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	مطبوعہ
(۲) - پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	″
(۳) - اردو کی نشو ونما میں صوفیاے کرام کا کام - ڈاکٹر مولوی عبدالحق		″
(۴) - اُردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	″
(۵) - اردو کے اسالیب بیان	″ ″ ″ ″	″
(۶) - تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	″
(۷) - مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین	″
(۸) - تاریخ ادب اردو	مرتبہ ادارہ ادبیات اردو	″
(۹) - منشورات (تاریخ نثر اردو)	احسن مارہروی	″
(۱۰) - سیر المصنفین	محمد یحیٰی تنہا	″
(۱۱) - داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	″
(۱۲) - ارباب نثر اردو	سید محمد	″
(۱۳) - تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خان	″
(۱۴) - دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	″
(۱۵) - مدراس میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	″

تواریخ

(۱۶) - تاریخ فرشتہ	ابوالقاسم فرشتہ	مطبوعہ
(۱۷) - تاریخ فیروز شاہی	سراج عفیف	"
(۱۸) - بساتین السلاطین	ابراہیم زبیری	"
(۱۹) - حدیقۃ السلاطین	ملا نظام الدین احمد	"
(۲۰) - منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی	"
(۲۱) - تاریخ ہندوستان	الفنسٹن	"
(۲۲) - تاریخ ہند	ہنری ایلیٹ	"
(۲۳) - میڈیول انڈیا	لین پول	"
(۲۴) - تاریخ خورشید جاہی	غلام امام خاں ترین	"
(۲۵) - گلدستہ بیجاپور	میر احمد علی خاں	"
(۲۶) - تاریخ بہمنی	ہارون خاں شیروانی	"
(۲۷) - سلاطین قطب شاہیہ	عبدالمجید صدیقی	"

ملفوظات

(۲۸) - جواہر فریدی	شیخ فرید الدین گنج شکر	قلمی
(۲۹) - مقصود المراد	ہاشم حسینی العلوی	مطبوعہ
(۳۰) - جوامع الکلم	خواجہ بندہ نواز گیسو دراز	"
(۳۱) - محبت نامہ	ید اللہ حسینی نبیرہ بندہ نواز	قلمی
(۳۲) - سیر الاولیا	نظام الدین اولیا	مطبوعہ
(۳۳) - لطائف اشرفی	سید اشرف جہانگیر (مطبوعہ اقتباس شرف الاخبار بہار)	"

(۳۴) ۔ خیر المجالس	نصیر الدین چراغ دہلوی (اقتباس تاریخ زبان اردو)	مطبوعہ
(۳۵) ۔ تذکرہ غوثیہ	غوث علی شاہ قلندر پانی پتی	〃

تذکرہ صوفیا

(۳۶) ۔ خزینۃ الاولیا	مفتی غلام سرور دہلوی	مطبوعہ
(۳۷) ۔ برکات الاولیا ترجمہ روضۃ الاولیا		〃
(۳۸) ۔ روضۃ الاولیا بیجاپور	ابراہیم زبیری	〃
(۳۹) ۔ اخبار الاخیار	عبد الحق محدث دہلوی	〃
(۴۰) ۔ محبوب الزمن تذکرہ اولیائے دکن	عبد الجبار ملکاپوری	〃
(۴۱) ۔ سبحۃ المرجان	غلام علی آزاد بلگرامی	〃
(۴۲) ۔ تذکرہ علمائے ہند	مولوی رحمان علی	〃
(۴۳) ۔ مراۃ الاسرار	عبد الرحمٰن چشتی	قلمی
(۴۴) ۔ روضۃ الاقطاب	رونق علی	〃

تذکرے

(۴۵) ۔ گل رعنا	عبد الحی رعنا	مطبوعہ
(۴۶) ۔ شعر الہند	عبد السلام ندوی	〃
(۴۷) ۔ گلشن ہند	مرزا علی لطف	〃
(۴۸) ۔ لباب الالباب	نور الدین محمد عوفی	〃
(۴۹) ۔ آب حیات	محمد حسین آزاد	〃
(۵۰) ۔ خم خانہ جاوید مکمل	لالہ سری رام	〃

(۵۱)۔ چمنستان شعرا	لچھمی نارائن شفیق	مطبوعہ
(۵۲)۔ طبقات الشعرا	کریم الدین و ڈاکٹر فیلن	قلمی
(۵۳)۔ مجموعہ نغز	قدرت اللہ قاسم	مطبوعہ
(۵۴)۔ نکات الشعرا	میر تقی میر	"
(۵۵)۔ تذکرہ شعرائے ریختہ	میر حسن دہلوی	"

تاریخ ادب

(۵۶)۔ پرشین لنگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ	مولوی عبد الغنی	مطبوعہ
(۵۷)۔ انڈو ایرین اینڈ ہندی	ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی	"
(۵۸)۔ ہسٹری آف پرشین لیٹریچر	لیوی	"
(۵۹)۔ شعر العجم	شبلی	"
(۶۰)۔ ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتہاس	رام چندر شکل	"
(۶۱)۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس	برج رتن داس	"
(۶۲)۔ ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس	پنڈت ایودھیا سنگھ ہری اودھ	"
(۶۳)۔ ہندی بھاشا اور ساہتیہ	شیام سندر داس	"
(۶۴)۔ ہسٹری دی لٹریچر ہندوستانی	گارساں دی تاسی	"
(۶۵)۔ اردو مثنوی کا ارتقاء	عبد القادر سروری	"
(۶۶)۔ انڈیا ان یورپین لٹریچر	ڈاکٹر آمنہ یوپ	"

سفرنامہ

(۶۷) سفرنامہ ابن حوقل	ابن حوقل (طبع لیڈن)	"
(۶۸) عجائب الاسفار	ابن بطوطہ	قلمی و مطبوعہ

سوانح

کتاب	مصنف	کیفیت
(۶۸)۔ نصرتی	ڈاکٹر عبدالحق	مطبوعہ
(۶۹)۔ سیرت بندہ نواز	مولوی عطا حسین	"
(۷۰)۔ سیرت بندہ نواز	حامد صدیقی	"
(۷۱)۔ سیرت بندہ نواز	حامد صدیقی	"
(۷۲)۔ سیر گلبرگہ	محمد سلطان	"
(۷۳)۔ سیرت محمدی	محمد علی سامانی	"
(۷۴)۔ تاریخ حسینی		قلمی
(۷۵)۔ احسن التقاسیم	طبع لیڈن	مطبوعہ
(۷۶)۔ سودا	شیخ چاند	"
(۷۷)۔ پرتھی راج راسو	ناگری پرچارنی سبھا	"
(۷۸)۔ پرتھی راج چوہان راسو	-	"
(۷۹)۔ مجالس رنگین	سعادت یار خاں رنگین مولفہ مسعود حسن رضوی	"
(۸۰)۔ ملکہ حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	"

تنقید

کتاب	مصنف
(۸۱)۔ جہاں بین	جعفر علی خاں اثر
(۸۲)۔ دنیائے افسانہ	عبدالقادر سروری

مضامین

(۸۳) نقوش سلیمانی	سید سلیمان ندوی	مطبوعہ
(۸۴) خطبات گارساں دتاسی	اردو ترجمہ	"

لسانیات

(۸۵) ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	مطبوعہ
(۸۶) ایلیمنٹ آف دی سائنس آف لنگویج	تاراپوروالا	"

نظم

(۸۷)۔ پدماوت	ملک محمد جائسی	مطبوعہ
(۸۸)۔ مثنوی غرۃ الکمال	امیر خسرو	"
(۸۹)۔ پھول بن	عبدالقادر سروری	"

فہرست ہائے مخطوطات

(۹۰) فہرست مخطوطات اردو برٹش میوزیم۔	بلوم ہارٹ	مطبوعہ
(۹۱)۔ فہرست مخطوطات انڈیا آفس	"	"
(۹۲)۔ فہرست مخطوطات " فارسی "	"	"
(۹۳) تذکرہ اردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو (جلد اول)	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	"
(۹۴) تذکرہ اردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو (جلد دوم)	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	"

(۹۵) ۔ فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ	عبدالقادر سروری	مطبوعہ
(۹۶) ۔ فہرست کتبخانہ ٹیپو سلطان	اسٹیوارٹ	"
(۹۷) ۔ " " شاہان اودھ	اسپرنگر	"
(۹۸) ۔ ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف بمبئی یونیورسٹی	عبدالقادر سرفراز	"
(۹۹) : فہرست مخطوطات مدراس یونیورسٹی	چندر شیکھرن	"

قواعد اردو

(۱۰۰) ۔ کیفیہ	پنڈت کیفی	مطبوعہ
(۱۰۱) ۔ قواعد اردو	ڈاکٹر عبدالحق	"

متفرق

(۱۰۲) ۔ روح الذہب	مسعودی	"
(۱۰۳) ۔ قطب مثنوی	مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق	"
(۱۰۴) ۔ سب رس	وجہی	"
(۱۰۵) ۔ باغ و بہار	میرامن	"
(۱۰۶) ۔ نوطرز مرصع	عطا حسین خان تحسین	"
(۱۰۷) ۔ اسٹڈیز ان تصوف	خواجہ خاں	"
(۱۰۸) ۔ اردو شاعری میں تصوف	اعجاز حسین	"
(۱۰۹) ۔ دریائے لطافت	انشا اللہ خاں انشا	"
(۱۱۰) ۔ دی ہسٹری آف گجرات	کمساریٹ	"
(۱۱۱) ۔ اریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف بنگالی لنگویج	ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی	"

(۱۱۲) ارشاد نامہ — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — مطبوعہ

(۱۱۳) وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ — نصیر الدین ہاشمی — زیر طبع

(۱۱۴) وضاحتی فہرست کتبخانہ آصفیہ — مطبوعہ

(۱۱۵)۔ غرایب اللغات — ڈاکٹر عبداللہ — ر

(۱۱۶)۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات — نصیر الدین ہاشمی — ر

رسائل

(۱۱۷)۔ آرزو

(۱۱۸)۔ ساقی

(۱۱۹)۔ ساقی

(۱۲۰)۔ نوائے ادب

(۱۲۱)۔ اورنٹیل کالج میگزین

(۱۲۲)۔ سیاست

(۱۲۳)۔ سب رس (کانفرنس نمبر)